قلمکار اور قاری کے درمیان ایک پُل
سہ ماہی
55
نیا ورق
فہمیدہ ریاض
• گوشۂ فہمیدہ ریاض: شمیم حنفی، آصف فرخی، نجمہ رحمانی اور دیگر مضامین و چند خطوط • ساجد رشید پر جاوید صدیقی کا خاکہ
• رشید حسن خاں پر الیاس شوقی کا خاکہ • فراق گورکھپوری پر ہندی ادیب وشوناتھ ترپاٹھی اور ندا فاضلی پر اسیم کاویانی کے مضامین
• پنجابی شاعر پاش کا تعارف اور نظمیں • ساجد رشید کا افسانہ، تجزیہ، افسانے، نظمیں، غزلیں، تبصرے اور خطوط...
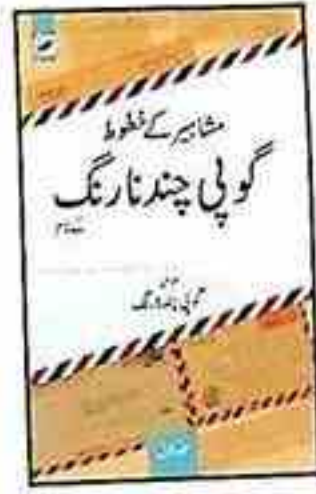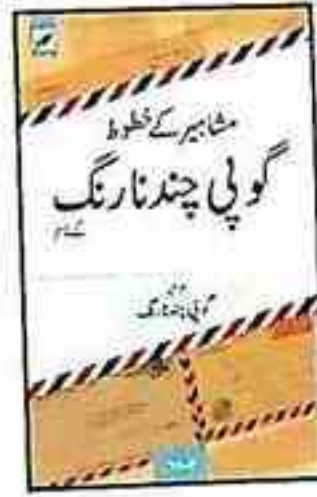
مشاہیر کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام

مرتبہ: گوپی چند نارنگ

جلد اول صفحات: 535	قیمت: 600
جلد دوم صفحات: 652	قیمت: 650
جلد سوم صفحات: 652	قیمت: 650
جلد چہارم صفحات: 652	قیمت: 650

ضربِ سخن

(ظریفانہ شاعری)

قیمت: 250 روپے

حوصلوں کی اُڑان

(بچوں کے لیے شاعری)

قیمت: 200 روپے

شاعر: ظفر کمالی

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی۔

رابطہ: کتاب دار۔ جلال منزل ٹیمکر اسٹریٹ ممبئی - ۸

فون: 23411854 / 9320 113631 / 9869 321477

www.kitabdaar.com

☆ جلد نمبر 21 شمارہ نمبر 55 اکتوبر 2019ء تا ستمبر 2020ء

☆ قیمت فی پرچہ پچھتر (۷۵) روپے، لائبریریوں سے ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے

☆ سالانہ تین سو روپے رجسٹرڈ ڈاک سے چار سو پچاس روپے

☆ بارہ (۱۲) شماروں کی قیمت ساڑھے آٹھ سو روپے

☆ لائبریریوں سے سالانہ چھ سو روپے (سادہ ڈاک سے)

☆ بیرونی ممالک سے سالانہ پینتالیس امریکی ڈالر ☆ پینتیس برطانوی پونڈ۔

نیا ورق

نوٹ: نیا ورق سے متعلق قانونی چارہ جوئی صرف ممبئی کی عدالت میں ممکن ہوگی۔

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر شاداب رشید نے پرتیک آفسیٹ، ڈگائے واڑی، ممبئی سے چھپوا کر دفتر ''نیا ورق'' 36/38 عمر کھاڑی کراس لین ممبئی سے شائع کیا

انتساب

مجتبیٰ حسین

پیدائش: ۱۵/جولائی، ۱۹۳۳ء

وفات: ۲۷/مئی، ۲۰۲۰ء
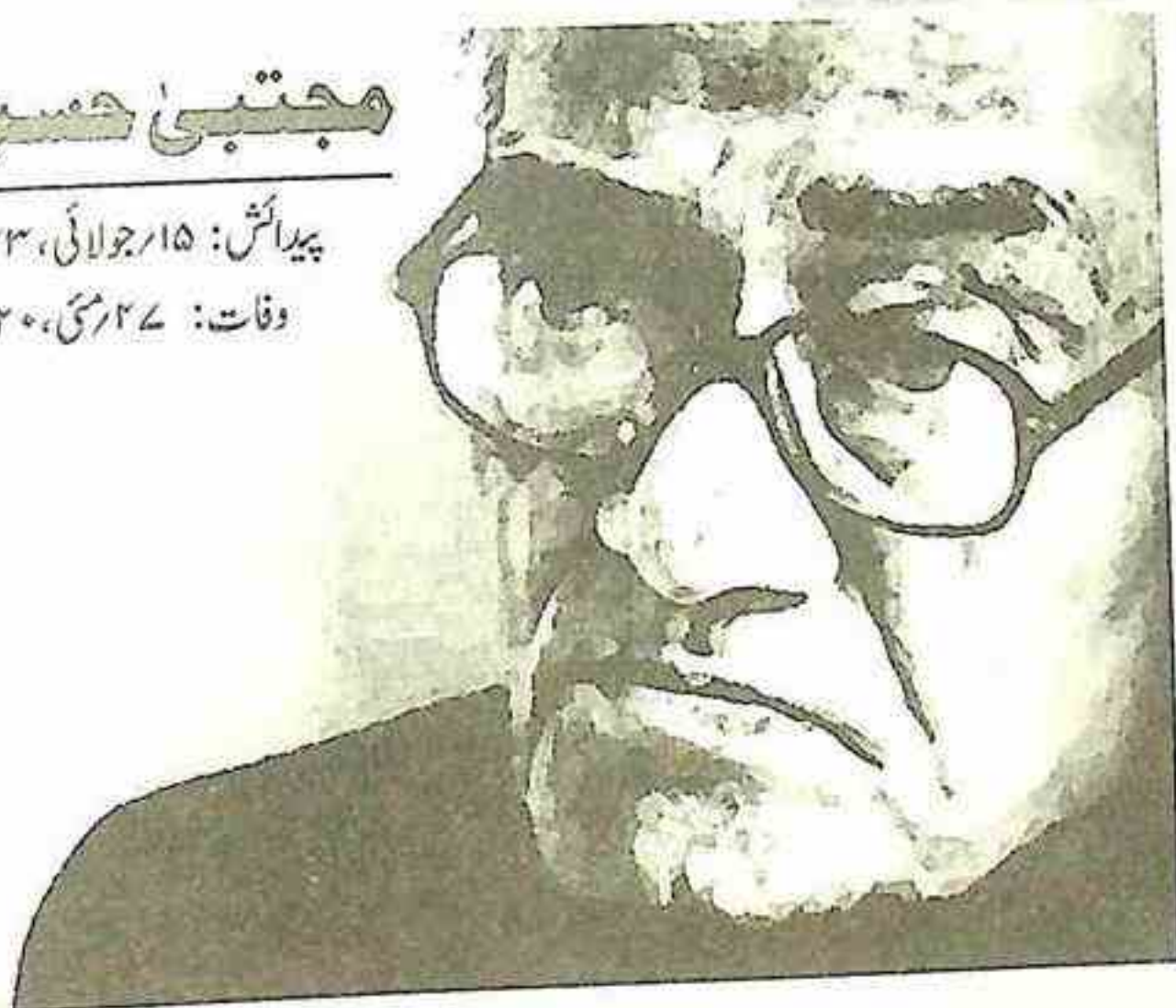
عبدالاحد ساز

پیدائش: ۱۶/اکتوبر، ۱۹۵۰ء

وفات: ۲۲/مارچ، ۲۰۲۰ء

نیا ورق 55

اداریہ

دستخط

دوبارہ غلامی کی جانب ایک قدم اور...
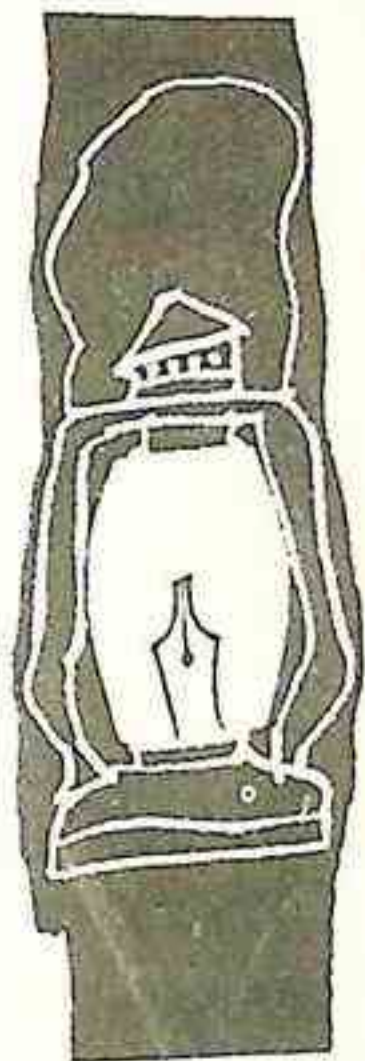
'تحریر اسکوائر' کا تاریخی مظاہرہ اور اس کے سبب آنے والے انقلاب مصر کے بعد شدت سے یہ سوال میرے اندر سر اُٹھانے لگا تھا کہ 'ہمارے یہاں ایسا انقلاب کب آئے گا؟' جس کا جواب مجھے خود پہلے سے پتا تھا کہ ہمارے یہاں اس طرح کا انقلاب اب کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ہمارے ملک کی خوبیاں ہی اس ضمن میں ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب، مختلف مذاہب، ہزاروں بولیاں، پوشاک، رہن سہن، کھانا پینا جہاں ایک طرف ہمیں پوری دنیا میں ایک الگ پہچان دیتے ہیں وہیں یہی خوبیاں ہمیں کبھی ایک نہیں ہونے دیتیں۔ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا تو دور ہم ایک ایک مذہب کے اندر بھی کئی کئی فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جب کسی مذہب کے نام پر لوگ ایک چھت کے نیچے نہیں آسکتے تو یہاں کوئی بڑا انقلاب کوئی عظیم تحریک کیسے، پنپ سکتی ہے!

لیکن میرا جواب، میری سوچ اس وقت غلط ثابت ہوگئی جب بھارتیہ جنتا پارٹی کی اکثریت والی سرکار نے لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں شہریت ترمیمی بل (سی اے اے) کو قانونی شکل دی اور مسلمانوں کو اس قانون سے باہر رکھا، جس پر مسلمانوں، خصوصاً عورتوں نے اپنا ردِ عمل دکھاتے ہوئے سڑکوں پر اُتر آئیں۔ اسی طرح تین طلاق کے قانون پر بھی مسلم عورتوں نے سڑکوں پر اتر کر احتجاج کیا تھا لیکن اس وقت کے احتجاج اور شاہین باغ کے احتجاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہاں عورتیں مردوں کے کہنے پر اُن کی ڈھال بن کر سڑکوں پر آئی تھیں لیکن یہاں عورتیں خود اپنی مرضی سے آگے

آئی ہیں۔ اس کالے قانون پر بہت جلد غیر مسلموں کو بھی اندازہ ہوگیا کہ کہیں نہ کہیں یہ قانون اُن کے بھی خلاف ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے شاہین باغ کی طرز پر ایک ایک شہر، گاؤں، گلی اور محلہ سراپا احتجاج بن گئے اور مانو پورے ہندوستان میں نیا انقلاب برپا ہوگیا۔ ہر طرف سے صرف اور صرف آزادی کے نعرے سنائی دینے لگے۔ تقریباً سو سال پہلے اسی طرح آزادی کے نعرے انگریزوں کے خلاف لگائے جاتے تھے اور آج بہتر سالوں بعد یہی نعرے ہندوستان کی اُس حکومت کے خلاف لگائے جارہے ہیں جسے افسوس خود ہندوستان کی عوام نے چُنا تھا۔

شاہین باغ کے مظاہرے نے انا ہزارے آندولن کی بھی یادیں تازہ کردیں۔ انا ہزارے کا آندولن کا مطالبہ تو لوک پال نافذ کرنے کا تھا جس کا سیدھا نشانہ کانگریس سرکار تھی لیکن کہیں نہ کہیں اُس آندولن کا سیدھا فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کو ہوا اور 2014 کے الیکشن میں اس کے نتائج بھی سامنے آگئے۔

اس بار بھی ایسا ہی ہورہا ہے۔ شاہین باغ جو شروع تو سی اے اے، این آر سی اور این پی آر کی مخالفت میں ہوا تھا لیکن اب کہیں نہ کہیں یہ مظاہرہ نہ چاہتے ہوئے بھی آہستہ آہستہ بی جے پی کا مددگار ثابت ہورہا ہے۔ دلی کے فسادات اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں کہ کس طرح بی جے پی 'شاہین باغ' اور اُس جیسے سیکڑوں 'باغوں' کو صرف اور صرف مسلمانوں سے جوڑ کر ہندوؤں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کا کام کررہی ہے۔ رہی سہی کسر انوراگ ٹھاکر، پرویش ورما اور کپل مشرا جیسے بی جے پی کے نیتاؤں نے اپنی اپنی تقریروں سے پوری کردی اور بے چارے بے روزگار نوجوان بڑی آسانی سے بی جے پی کے بہکاوے میں آکر تشدد پر آمادہ ہوگئے۔

'شاہین باغ' کی بنیاد گزار خواتین کو پیچھے چھوڑ کر چند خود ساختہ منتظمین نے بی جے پی کی رکنیت لے کر یہ ثابت کردیا کہ یہ تمام مظاہرے کسی کی بھلائی کے لیے ہورہے تھے تو وہ یہ خود ساختہ منتظمین ہی تھے جنھیں انا ہزارے کے آندولن کرنے والوں کی طرح ملک گیر سطح پر پہچان ملی اور آج پتا نہیں کن شرطوں پر انھوں نے خود کا ضمیر ایک بے ضمیر پارٹی کو بیچ دیا، یا شاید اُن کوئی ضمیر تھا بھی نہیں یا اُنھیں 'شاہین باغ' میں بھیجا ہی گیا تھا اُسے بدنام کرنے کے لیے، شاید وہ انھیں پارٹی کے پیدا کردہ چند لوگ تھے جو زبردستی 'شاہین باغ' کے منتظمین بن بیٹھے تھے۔

خیر 'شاہین باغ' ایک پہچان ایک علامت ایک نشانی بن کر ابھرا تھا کالے قانون کے خلاف۔ جسے کرونا وائرس نے فلحال خاموش تو کردیا ہے لیکن جلد ہی یہ آواز پھر اُٹھے گی اور ایک بار پھر اسی طرز پر احتجاج کی صدا دوبارہ بلند ہوگی۔

☆

کچھ دنوں پہلے ہمارے ایک عزیز نے اپنے ڈر کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مجھے آج احساس ہو رہا ہے کہ بزرگوں نے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کر کے کتنی بڑی غلطی کی تھی۔"

ہمارے عزیز کا ڈر بہت حد تک واجب ہے اور اسی طرح کے خیالات سے کہیں نہ کہیں ہم جیسے سیکولر ذہنیت رکھنے والے بھی گزر رہے ہیں اور ایک سیکنڈ کے لیے ہی سہی ہمارے دلوں میں بھی چھپے ڈر نے ہمیں بھی یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ کیا واقعی ہمارے بزرگوں کا فیصلہ سہی تھا؟ اور کیا پاکستان ہجرت کرنے والے ہندستانی وہاں ہم سے زیادہ سکون سے ہیں؟

لیکن جب ہم اپنے اعتراف کا جائزہ لیتے ہیں اور بہتر سالوں کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ان سارے سوالات کے جوابات مل جاتے ہیں۔ پاکستان ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو آج بھی اپنی پہچان ثابت کرنے کے لیے جوجھنا پڑ رہا ہے۔ وہ آج بھی مہاجر کہلائے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی آسامیوں تک اُن کی رسائی ممکن نہیں۔ جتنی آزادی اور کھلی فضا ہندوستان میں مسلمانوں کو میسر ہے وہ آج بھی پاکستان میں ملنی دشوار ہے۔ ہر وقت مذہب اور تاناشاہی کی تلوار اُن کے سروں پر منڈلاتی رہتی ہے۔ وہیں اگر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا جائزہ لیں تو چند ایک علاقوں کو چھوڑ کر مسلمان کہاں خوش اور محفوظ نہیں ہیں؟ مجھے نہیں لگتا مسلمان ہندوستان جیسے جمہوری ملک کے علاوہ کہیں اور چین سے رہ سکتا ہے۔

پھر ایسا کیا ہوگیا کہ آج ہمارے دلوں میں ایسے سوالات سر اُبھار رہے ہیں؟ کیا ہم اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اس بات کو تسلیم کر سکتے ہیں کہ ہم نے واقعی پوری ایمانداری سے اس ملک کی ترقی کے لیے اپنا اپنا کردار ادا کیا ہے؟

اگر ہم اپنی تاریخ کھنگالیں تو ہمیں دوسروں کی غلطی سے زیادہ اپنی غلطی دکھائی دے گی۔ جب ہم اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کی نہیں بلکہ ہماری کوتاہی اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے جو آج ہمیں ان حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ایک دیوار نریندر مودی نے گجرات کی غربت چھپانے کے لیے بنائی تھی اور ایک دیوار ہمارے چند خود ساختہ علما اور رہنماؤں نے ہمارے بیچ کھڑی کر ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ ہمیشہ سے الگ کر دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مودی نے وہ دیوار اپنی ناکامی چھپانے کے لیے بنائی تھی اور ہم نے جو دیوار کھڑی کی ہے وہ اس لیے کہ ہم ایک دوسرے کی کامیابی نہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہی نہیں ہم نے اس دیوار میں بڑی شدت سے اینٹیں لگانے اور سیمنٹ بھرنے کا بھی کام کیا ہے۔ انگریزوں نے

نفرت کے جس پودے کے بیج بوئے تھے، آج ہم نے مذہب اور زبان کی کھاد سے اسے سینچ کر درخت بنا دیا ہے۔ ایک دوسروں سے ہماری اسی دوری نے شرپسندوں کے حوصلوں کو تقویت بخشی جس کا نتیجہ آج پورا ہندوستان جھیل رہا ہے۔

جہاں ایک طرف انسانیت اس سارے فسادات کو جھیل رہی ہیں تو وہیں ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس سب کے ذمہ دار بھی ہیں۔ ایک طرف مسلمان ہیں جو ہمیشہ سے اپنے ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا چاہتا ہے اور اسی میں خوش بھی رہتا آیا ہے۔ جسے ہمیشہ اپنے ماضی کے عظیم سائنس دانوں کو یاد کر کر کے اپنا سینہ ٹھونکتے رہنا پسند ہے لیکن دوسری طرف کئی دہائیوں سے اے پی جے عبدالکلام کو چھوڑ کر ہمیں کوئی مسلم سائنس داں دور دور تک دکھائی نہیں دیتا۔ (اس پر بھی افسوس کہ کئی علماء یہ ثابت کرنے کی ہوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ عبدالکلام مسلمان نہیں دہریے تھے)۔ ریاضی اور دوسرے علوم کا تو اور بھی برا حال ہے۔ کھیل کود کے میدان میں بڑی مشکل سے چند ایک نام سننے میں آتے ہیں اور ان میں سے ایک آدھ ہی بڑی مشکل سے اونچائیوں کو چھونے میں کامیاب ہو پاتے ہیں جس کی بہترین مثال ثانیہ مرزا جیسی کھلاڑی ہیں تو وہاں بھی ہمارے نام نہاد مولوی حضرات اپنی ناک اڑانے سے پیچھے نہیں رہتے۔ جنہیں ان کے کھیل سے زیادہ ان کی ''ننگی'' ٹانگیں زیادہ دکھائی دیتی ہیں۔

ماہنامہ انشا کے مدیر ف س اعجاز اپنے ایک اداریے میں رقم طراز ہیں کہ جب پورا ملک سی اے اے، این آر سی اور این پی آر کی مخالفت میں جگہ جگہ مظاہرے کر رہا ہے، خواتین سڑکوں پر اتر آئی ہیں، وہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے وکیل ظفریاب جیلانی ہارے ہوئے بابری مسجد کا ملبہ حاصل کرنے کی اپیل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اب مسلمانوں کے لیے اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے!

دوسری طرف ہندوؤں کا بھی کچھ کم برا حال نہیں ہے۔ جہاں ایک طرف مسلمان اپنے ماضی سے باہر نہیں نکل پا رہے ہیں، وہیں ہندوؤں کو آہستہ آہستہ بڑی چالاکی سے رام مندر، گئو ماتا، گئو مُتر اور گوبر کے ذریعے ماضی کی طرف ڈھکیلا جا رہا ہے۔ بے چارے بھگت بلی کے اس نوزائیدہ بچے کی طرح ہیں جس کی آنکھیں کھلنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں لیکن پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگوں کو کیا ہوا ہے؟ اتنے دنوں بعد بھی ان کی آنکھیں کیوں نہیں کھل رہی ہیں؟ آنکھیں کھلنا تو دور وہ تو اپنے اپنے دماغوں کو تالا لگائے بیٹھے ہیں اور بی جے پی کی بے سر پیر کی باتوں کے فائدے بتانے میں لگے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ہماری بھی آنکھیں ہمیشہ بند ہی رہیں اور نفرت کا ننگا ناچ کھیلنے والے انھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ماضی کی بھول بھلیاں میں ڈھکیل دیں۔

نفرت کی آندھی ہمیں چاروں طرف سے آہستہ آہستہ کھوکھلا کرتی جا رہی تھی اور ہم صرف ڈاڑھی، ٹوپی، شیواجی اور اورنگ زیب میں ہی اُلجھے ہوئے ہیں۔

ہندو اور مسلمان دونوں یہ بات آج تک نہیں سمجھ سکے کہ مستقبل میں نہ تو مذہب ہوگا اور نہ ذات پات ہوگی۔ باقی رہے گی تو صرف دو چیزیں، امیر اور غریب۔ یہ سارا کھیل صرف اور صرف پیسے کا ہی ہے۔ آنے والے دنوں میں لوگ صرف پیسوں کے بل پر ہی جانے جائیں گے، اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو آپ راج کریں گے ورنہ غلامی۔ دن بہ دن گرتی جی ڈی پی اور راکٹ کی تیزی سے بھی تیز بڑھتے امبانی اور اڈانی کے خزانے اس بات کے گواہ ہیں!

☆☆

لاک ڈاؤن نے ہر کسی کی کمر توڑ دی ہے۔ ہم بھی اسی کی مار جھیل رہے ہیں۔ ۱۵ رمارچ تک رسالہ تیار ہوگیا تھا لیکن پریس میں بھیجنے سے پہلے ہی لاک ڈاؤن لگ گیا۔ لاک ڈاؤن کھلنے کے بعد ہر کوئی اپنی روزی روٹی کی تگ و دو میں بھاگا بھاگا پھر رہا ہے۔ ہم بھی لاک ڈاؤن کے بعد سے لے کر اب تک اسی تمام پریشانیوں سے جھوجھ رہے تھے اور آخر کار اب جا کر ہم نے رسالہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ اداریہ پہلے ہی لکھا جا چکا تھا۔ موضوع چوں کہ کافی اہم تھا اس لیے اسے ہی شائع کرنے کا ارادہ کیا گیا ہے۔ آئندہ شمارے میں کرونا وائرس، لاک ڈاؤن اور بے روزگاری جیسے موضوع پر لکھنے کی خواہش ہے۔ اُمید ہے قارئین ہماری کوتاہیوں کو درگزر کریں گے۔

شاداب رشید
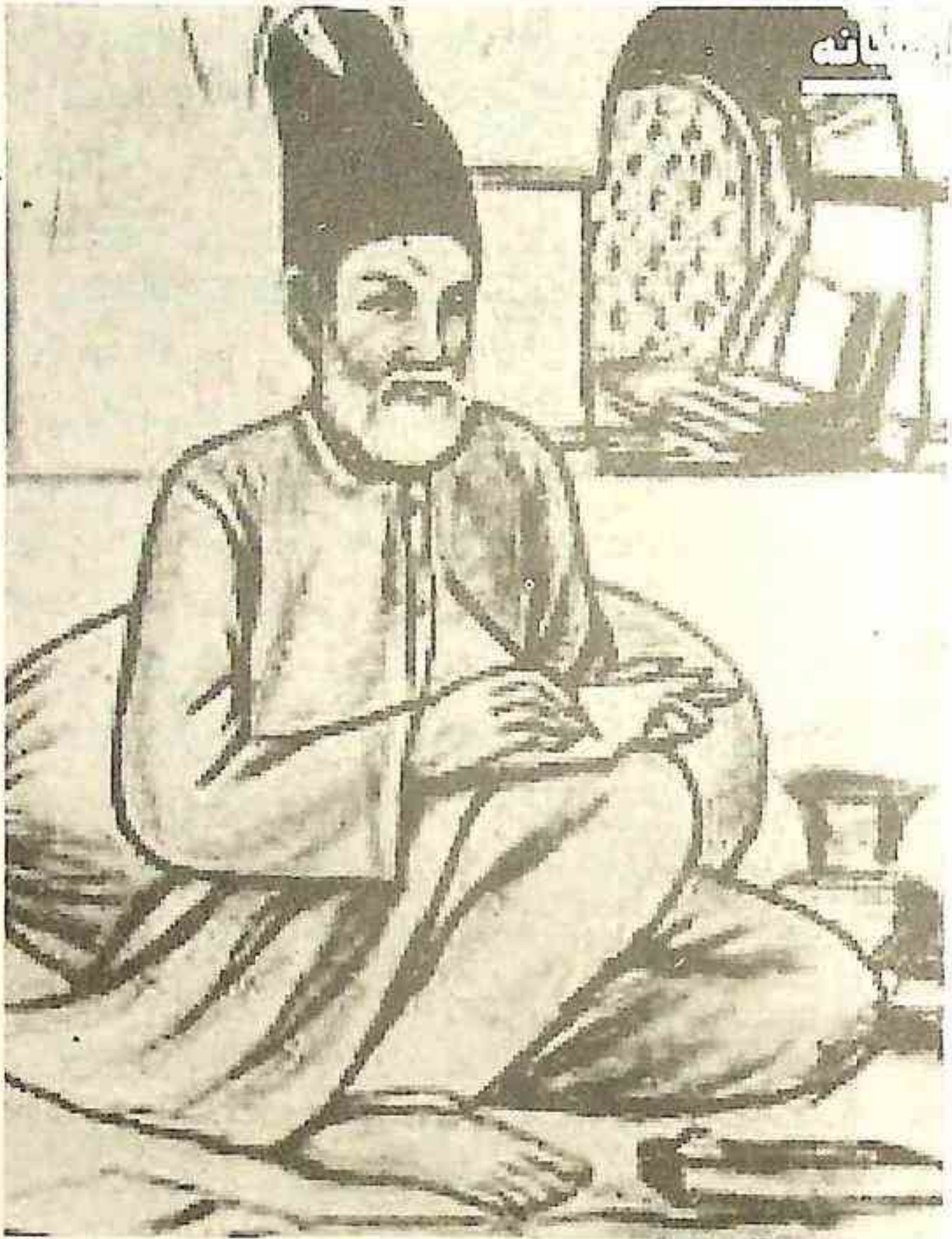
سلام بن رزاق

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

جب قاطع برہان کا قضیہ بڑھا، بعض شر پسند مرزا کے نام مغلظات بھرے خطوط بھیجنے لگے، جن میں ان کی شراب نوشی، مذہبی بداعتقادی اور خود آرائی پر سخت نفرین اور لعنت ملامت ہوتی تھی۔

ان خطوط کو پڑھ کر مرزا بے لطف رہنے لگے۔ یہاں تک کہ جب چٹھی رساں ڈاک لے کر آتا تو اس خیال سے کہ مبادا اسی قسم کا کوئی خط نہ آیا ہو، ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا۔ انھی دنوں حالی کا دلی آنا جانا ہوا اس دوران غالب سے ان کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور انھیں مرزا کی مشغولات اور معاملات کو دیکھنے سمجھنے کا موقع ملا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مولوی حضرات مذہبی خود پسندی کے نشے میں سرشار تھے اور ظاہر پرستی عام تھی۔ مولانا حالی بے چارے سیدھے سادھے مولوی آدمی، ادب و شاعری کے دل دادہ، مرزا کے تعلق سے فکر مند رہتے تھے۔ مرزا کی ذات سے عقیدت اور لگاؤ بدرجہ غایت تھا۔ دل میں مرزا کی مذہب بے زاری پر افسوس کرتے، مگر کھل کر کچھ عرض کرنے کی جرات نہ تھی۔ انھیں اکثر یہ خیال ستاتا رہتا کہ مرزا اپنی بدعقیدگی کے سبب بہشت میں داخل نہ ہو سکیں گے اور روضہ رضوان میں ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا اور بعد از مرگ وہ ان کی صحبتوں سے محروم رہ جائیں گے۔

جب بے چینی بڑھی تو ایک دن ہمت کر کے مرزا کی کبر سنی اور مرتبے کا لحاظ کیے بغیر خشک مغز واعظوں کی طرح مرزا کو نصیحت کرنا شروع کیا۔ چوں کہ غالب کا ثقل سماعت انتہا درجہ کو پہنچ چکا تھا اس لیے ان سے بات چیت تحریر کے ذریعے ہی ممکن تھی۔ لہذا حالی نے نمازِ پنج گانہ کی تاکید و فضیلت پر ایک لمبا چوڑا لیکچر جو پہلے ہی سے لکھ لائے تھے وہ ان کے سامنے پیش کیا، جس میں مودبانہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نمازِ پنج گانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو ان کی تحریر انتہائی ناگوار گزری۔ انھیں حالی جیسے ذہین شاگرد اور وفا شعار موید سے ایسی طفلانہ تحریر کی امید نہ تھی۔ ادھر مغلظات سے بھرپور اور سب و شتم سے چور خطوط کے آنے کا سلسلہ دراز تھا۔ حالی کی اس تحریر نے مرزا کے زخموں پر نمک کا کام کیا۔

مرزا وہ تحریر حالی کو واپس دیتے ہوئے نہایت آزردگی اور قدرے خفگی کے ساتھ فرمایا:

''میاں حالی! میری ساری عمر فسق و فجور میں گزری، نہ کبھی نماز پڑھی، نہ کبھی روزہ رکھا، نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں اب اگر چند روزہ بیٹھ کر یا ایجاز و اشارے نماز پڑھ بھی لی تو اس سے ساری عمر کے گناہوں کی تلافی کیوں کر ہو سکے گی۔ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں تو میرے عزیز اور دوست میری میت کا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں۔ اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں، چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو چھوڑ آئیں۔ اگر چہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا

جائے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں اور ترک رسوم میرا مسلک ہے۔ تاہم تنہائی اور عالم سکوت میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

"لا الہ الا اللہ لا موجود الا اللہ"

مرزا کی پوری تقریر کے دوران حالی بے چارے یوں صم بکم بیٹھے رہے جیسے پالا مار گیا ہو۔ جنبش تو کجا پلک تک جھپک نہیں رہی تھی۔ عینک کے پیچھے دو آنکھیں ہوا کی زد پر دو چراغوں کی مانند ٹمٹما رہی تھیں۔

مرزا اچانک چپ ہو گئے اور تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ جب حالی مرزا کے فسوں ساز بیانیے کے طلسم سے نکلے تو انھیں منہ پھیرے لیٹے دیکھا۔ چپکے سے اٹھے اور دبے پاؤں دروازے کے باہر نکل گئے۔

☆

حالی رات بھر بے چین رہے۔ انھیں اس کا بے حد ملال تھا کہ ان کی باتوں اور بے فیض تحریر نے غالب جیسے عظیم المرتبت شاعر کو رنجیدہ کر دیا، اگر چہ وہ چٹھی انھوں نے نیک نیتی سے لکھی تھی مگر مرزا پر اس کا اثر الٹا ہوا۔ حالی سوچنے لگے ان کی عالی دماغی کے آگے میرے بچکانہ خیالات کی حیثیت ہی کیا ہے۔ اگر چہ میری تحریر میں پند و نصائح کے سوا کچھ نہیں تھا تاہم غالب جیسی نابغہ روزگار شخصیت ایسی کم تو قیر اور بے تاثیر نصیحتوں کی محتاج کیوں ہو۔ انھیں یاد آیا کہ غالب کو حضرت ناصح سے کس قدر چڑھ تھی اور انھوں نے اپنے اشعار میں کس کس طرح ان کی پگڑی اچھالی ہے۔ حالی اپنی غلطی پر سخت نادم تھے انھوں نے طے کیا کہ وہ کل پہلی فرصت میں مرزا کی خدمت میں پہنچ کر معافی کے خواستگار ہوں گے۔

☆

دوسرے دن حالی بار محجوبیت سے چور افتاں و خیزاں بارگاہ غالب میں حاضر ہوئے۔ غالب کھانا کھا رہے تھے۔ حالی کو ڈر تھا کہیں دروازے ہی سے نہ لوٹا دیں، مگر ان پر نظر پڑتے ہی تپاک سے پکارا: "ارے آؤ بھئی حالی آؤ، بڑے وقت پر آئے۔ ماحضر تناول کرو۔"

حالی نے نہایت ہی انکساری سے بارک اللہ کہا اور ہاتھ باندھے خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔ سوئے اتفاق کہ اسی وقت خادم نے ایک لفافہ لا کر غالب کو دیا اور کہا: "ابھی ابھی چٹھی رساں دے گیا ہے۔"

غالب نے سرنامے کی بے ربط تحریر دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ ویسا ہی گمنام خط ہے جو انھیں آئے دن مخالفین بھیجا کرتے ہیں۔ انھوں نے کھانا کھاتے کھاتے خط حالی کی طرف بڑھا دیا اور کہا: "کھول کر

پڑھو۔"

حالی نے جب خط پڑھا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ مرزا نے پوچھا: "کس کا خط ہے اور کیا لکھا ہے؟"

حالی کو اظہار میں تامل ہوا۔ مرزا نے فوراً ان کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا اور فرمایا: "شاید آپ کے کسی شاگرِ معنوی کا لکھا ہوا ہے۔" پھر خود ہی خط پڑھنے لگے۔ حالی کو ایک بار پھر شرمندہ ہونا پڑا۔ خط پڑھتے پڑھتے مرزا اچانک مسکرانے لگے۔ حالی دم بہ خود انھیں دیکھے جا رہے تھے۔ مرزا نے ہنستے ہوئے کہا: "الو کو گالی دینے کا بھی سلیقہ نہیں، بڈھے یا ادھیڑ عمر کے آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تاکہ اس کو غیرت آئے۔ جوان کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیوں کہ جورو سے اس کو زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہے ہوتا۔ یہ قرم ساق جو بہتر برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا۔"

حالی کو مرزا کی شگفتہ مزاجی سے کچھ راحت ملی۔ حالی جانتے تھے کہ مرزا دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کے عادی ہیں۔ اس وقت معافی مانگنے کے بہانے دوبارہ اس ناخوش گوار موضوع کو چھیڑنا کسی طرح مناسب نہ تھا لہٰذا مرزا سے رخصت لے کر چلے آئے۔

☆

حالی کے جانے کے بعد غالب وہیں تخت پر نیم دراز ہو گئے۔ ایک تکیہ سر کے نیچے رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اب ان مادر پدر آزاد خطوں کا خیال انھیں کم آتا تھا۔ البتہ حالی کی نصیحت آمیز تحریر انھیں بے چین کیے ہوئے تھی۔ مرزا کو اس بات کا ملال تھا کہ حالی جیسا نکتہ رس اور عزیز از جاں شاگرد بھی ان کی ذکاوتِ طبع، وسیع المشربی اور آزادہ روی کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ ہوا میں خنکی تھی، خادم نے آتش دان تازہ کر دیا دھیرے دھیرے مرزا کی پلکیں بوجھل ہونے لگیں اور ان پر غنودگی کا عالم طاری ہو گیا۔

اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک وسیع و عریض میدان میں کھڑے ہیں۔ جس کی وسعت بے کراں تھی۔ میدان میں لوگوں کا ہجوم ہے اور چاروں طرف سے آہ و بکا کی آوازیں آ رہی ہیں۔ شور اس قدر تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ حشر برپا ہو چکا ہے۔ چاروں طرف نفسا نفسی کا عالم تھا اور ہر کوئی اپنا اپنا اعمال نامہ بغل میں دبائے حواس باختہ گھوم رہا تھا۔ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔

مرزا چلتے چلتے ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں اژدحام کم تھا البتہ اکا دکا لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

اتنے میں دور سے ایک باریش، جبہ پوش، انھی کی طرح لمبی سی ٹوپی اوڑھے آتا نظر آیا۔ پیشانی پر ہتھیلی سے بھی چوڑا سجدے کا نشان دور سے دمک رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت تھی اور کنپٹیوں سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ مرزا نے آگے بڑھ کر با آواز بلند کہا:

''السلام علیکم یا اخی۔''

اجنبی چلتے چلتے رک گیا۔ غالب کو گھور کر دیکھا اور پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا:

''وعلیکم السلام۔'' گویا سلام کا جواب نہیں مبارزت پر للکار رہا ہو۔

غالب نے اپنے لہجے کو حتی الامکان ملائم بناتے ہوئے پوچھا: ''حضرت، آپ کا اسم گرامی؟''

''کیوں؟'' اخی کی تیوریاں اسی طرح چڑھی ہوئی تھیں۔

''حضور، اس ہجوم نا آشنا میں آپ کی باصفا صورت دیکھ کر آپ سے گفتگو کرنے کو جی چاہا لہٰذا...''

اس سے پہلے کہ غالب اپنا جملہ پورا کرتے حضرت اخی نہایت بے مروتی سے بولے:

''کام کی بات...''

حضرت اخی کا گستاخانہ رویہ مرزا کو ناگوار گزرا مگر نہایت ضبط وتحمل سے پوچھا:

''حضرت، باب فردوس کہاں ہے؟''

مارے غصے کے حضرت اخی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ گرج کر بولے:

''آپ کا دماغ تو ٹھکانے پر ہے؟ ہم خود پچھلے کئی ماہ سے باب فردوس تلاش کر رہے ہیں اور آپ ہمیں سے باب فردوس کا پتہ پوچھ رہے ہیں۔ جائیے جائیے، یہاں اپنی فردوس خود کو تلاش کرنی ہوتی ہے۔''

حضرت اخی غصے میں بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔ غالب کو اپنی بے توقیری، کم مائگی اور تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ اسی احساس کے زیر اثر انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر نہایت رقت آمیز انداز میں پکارا: ''اے مالک کون ومکاں!

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

شعر کا پڑھنا تھا کہ چاروں طرف سے سبحان اللہ، ماشاء اللہ کی آوازیں آئیں اور ان پر پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ مرزا نے گھبرا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ نگاہوں کے سامنے کا منظر کسی چلمن کے مانند دو نیم ہو کر دائیں بائیں سرک رہا ہے۔ دوسرے ہی لمحے عقب سے ایک عظیم الشان دروازہ نمودار ہوا جس کی پیشانی پر سبز و سرخ چمچماتے جلی حروف میں 'باب الفردوس'

تحریر تھا۔غالب کی باچھیں کھل گئیں۔انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بے تابانہ باب الفردوس کی طرف بڑھے۔باب الفردوس کے دونوں پھاٹک کھلے تھے۔مرزا خود اعتمادی سے سرخوشی کے عالم میں گردن اٹھائے فردوس میں داخل ہونا ہی چاہتے تھے کہ ایک کڑک دار آواز سنائی دی۔

''اوئے چچا میاں کہاں جا رہے ہیں؟"

مرزا تیورا کر پلٹے۔باب فردوس اور ان کے درمیان ایک عظیم الجثہ نورانی چہرے والا فرشتہ کھڑا تھا۔جس کا قد کم وبیش باب فردوس کے برابر تھا۔

یہ باب فردوس کا دربان رضوان تھا۔مرزا نے خوش دلی سے کہا: ''جنت میں حضور۔''

''کیا تمھارے پاس جنت کا پروانہ ہے؟''

مرزا نے کہا: ''ابھی ابھی ہم نے جو شعر پڑھا تھا، وہی ہمارا جنت کا پروانہ ہے۔''

''ہمیں تمھاری شاعری سے کیا مطلب، اپنا اعمال نامہ دکھاؤ۔''

غالب نے بغل میں دبا اپنا دیوان آگے بڑھا دیا۔رضوانِ جنت کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔کرخت لہجے میں کہا: ''یہ تو تمھاری شاعری کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔''

''جی ہاں یہی میرا اعمال نامہ ہے۔''

''اور وہ اعمال نامہ کہاں ہے، جو تمھارے کراما کاتبین شب و روز لکھتے تھے؟''

''کراما کاتبین جانیں، ہمیں کیا پتا۔''

رضوانِ جنت نے غالب کے کراما کاتبین کو طلب کیا اور حکم دیا کہ اس شخص کا اعمال نامہ پیش کرو۔

فرشتوں نے کہا: ''حضور، یہ شخص بہت حجتی ہے۔اپنے اعمال نامے پر دلیل مانگتا ہے۔''

''دلیل مانگتا ہے، کیسی دلیل؟''

کہتا ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

''اوہ! اس کا اعمال نامہ کہاں ہے؟''

''یہ لیجیے حضور۔''

کراما کاتبین نے غالب کا اعمال نامہ رضوانِ جنت کے حوالے کر دیا۔رضوانِ جنت نے اعمال نامے کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا:

''چچا میاں، تمھارا اعمال نامہ تو گناہوں کا پلندہ معلوم ہوتا ہے۔شراب تم پیتے تھے۔بازارِ حسن

کے چکر تم لگاتے تھے۔ ڈومنیوں سے عشق کرنا تمھارا پیشہ اور قمار بازی تمھارا مشغلہ تھا۔ جس کی پاداش میں چھ مہینے جیل کی ہوا بھی کھا چکے ہو، دنیا میں جنت کا مذاق اڑاتے تھے اور اب اسی جنت میں جانے کے متمنی ہو؟''

غالب گویا ہوئے۔ ''حضور، تسلیم کہ یہ سارے گناہ مجھ گناہ گار کے اعمال نامے میں درج ہیں۔ مگر دستور کے مطابق چشم دید گواہ بھی تو ضروری ہے۔''

''چپ رہو۔''

رضوان جنت گرجا: ''یہ تمھاری دنیا نہیں عقبیٰ ہے۔'' رضوانِ جنت نے مڑ کر فرشتوں کو حکم دیا۔

''اس گستاخ کو داروغۂ دوزخ کے حوالے کر دو، دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔''

غالب واویلا مچانے لگے۔ مگر فرشتوں نے آن کے آن میں ان کی مشکیں کس دیں۔ اور کشاں کشاں دوزخ کی طرف لے چلے۔ ابھی چند قدم بھی نہیں چلے تھے کہ ہاتف سے ندا آئی:

"رک جاؤ۔''

فرشتے رک گئے، پوچھا گیا: ''کیا معاملہ ہے؟''

رضوان جنت دست بستہ عرض گزار ہوا: ''داور کون و مکاں، یہ شخص جنت کا طلب گار ہے اور شاعری کی کتاب کو اپنا اعمال نامہ بتاتا ہے۔''

حکم ہوا ''چھوڑ دو اسے۔''

فرشتوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور غالب کی مشکیں کھول دیں۔

ندا آئی: ''تم فرشتے ہو اور شب و روز میری حمد و ثنا ہی تمھارا وظیفہ ہے۔ تم انسانوں کے آلام و مصائب اور صبر آزما مشکلوں سے واقف نہیں، نہ تمھیں انسانی نفس کی پیچیدگیوں کا علم ہے۔ اس شخص نے اپنے اشعار کے ذریعے زندگی کے رازہائے بستہ کو ابن آدم پر منکشف کیا ہے اور انسانی فکر کو ایسی بلندی عطا کی ہے جہاں سے اسے آسمان بھی بیضۂ مور نظر آتا ہے۔ یہ سچ ہے اس کا دیوان ہی اس کا اعمال نامہ ہے۔ ہم اس کے سارے بدیہی گناہوں کو معاف کرتے ہیں اور اسے جنت کا پروانہ عطا کرتے ہیں۔''

فرشتے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ رضوان جنت گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ غالب نے خدائے عزوجل کا شکریہ ادا کیا اور سرمستی کے عالم میں گنگناتے ہوئے جنت میں داخل ہوئے۔

دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی

ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

☆

جنت میں چاروں طرف ایک خوش گوار موسم چھایا ہوا تھا۔ نہ آفتاب کی گرمی کا احساس نہ جاڑے کی سردی۔ قدم قدم پر سایہ دار درختوں کے جھنڈ جن میں سے پرستان بہشت ہاتھوں میں جام لیے، ریشم و کمخواب کے لباس زیب تن کیے، صندلی تختوں پر تکیے لگائے بیٹھے تھے۔ حسین و جمیل حوریں ان کی ناز برداری میں مشغول تھیں۔ غلمان شراب طہورا کے جام کے جام لنڈھا رہے تھے۔ ثمر آور درختوں کے سایے جنتیوں پر جھکے ہوئے تھے۔ تازہ اور شیریں میوں کے گچھے نیچے لٹک رہے تھے۔ شراب طہورا جن برتنوں اور ساغروں میں پیش کی جارہی تھی وہ شیشے کی طرح چمکتی چاندی کے تھے اور ایک حور بے تمثال ساقی کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ غلمان زنجبیل کی آمیزش کے جام ناپ ناپ کے دے رہے تھے اور نہر سلسبیل کے آس پاس طفلان پاک طینت آہو بچوں کی مانند کلانچیں بھرتے اور کل کاریاں مارتے پھر رہے تھے۔ دور سے وہ بچے بکھرے موتیوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور جگنوؤں کے مانند جگر مگر کر رہے تھے۔ یہ وہ بچے تھے جو کم سنی میں فوت ہو گئے تھے اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باغ عدن کے پھول بن گئے تھے۔

اتنے میں مرزا نے دیکھا کہ دو غلمان خراماں خراماں ان کی طرف بڑھے چلے آرہے ہیں۔ غلمانوں نے قریب آ کر مرزا کو فرشی سلام کیا اور انھیں درختوں کے ایک کنج میں لے گئے۔ انھیں دوسرے جنتیوں کی طرح مہین اور موٹے ریشمی کپڑے پہنائے گئے اور ایک شاندار تخت پر بٹھایا گیا۔ دم کے دم میں چار حسین و جمیل حوروں نے انھیں اپنے گھیرے میں لے لیا۔ جن کے لباس سے عود و عنبر کے بھپکے اٹھ رہے تھے اور بدن پھولوں کی خوشبو سے معطر تھے۔ سب سے پہلے غالب کی خدمت میں شراب طہورا کا ایک جام پیش کیا گیا۔ غالب نے پہلا گھونٹ بھرا، شراب ایسی ذائقہ دار تھی کہ بادۂ گلفام مشک بو اس کے آگے ہیچ تھی۔ غالب جرعہ جرعہ شراب طہورا کا لطف لیتے رہے اور میوہ ہائے رنگا رنگ کا مزہ چکھتے رہے۔ وہاں نہ رات تھی نہ دن تھا۔ بس ہر وقت ایک خوش گوار کیفیت فضا پر چھائی رہتی۔

☆

ایک عرصے بعد جب غالب شراب طہورا سے جی بھر کے لطف اندوز ہو چکے، مطہرات فردوس کی بے فیض صحبتوں سے سرگشتہ اور غلمانوں کی بے طلب نوازشوں سے ہلکان ہو چکے تو خدا کے حضور میں ایک عرضی داغی اور ملاقات کے ملتمس ہوئے۔ کئی یادداشتیں بھیجنے کے بعد آخر خدائے قدوس نے انھیں اپنے دربار خاص میں طلب کیا اور پوچھا: ''کہو کیا بات ہے؟''

غالب بے تحاشا سجدے میں گر گئے۔ غیب سے آواز آئی: ''بس بس اٹھو، دنیا میں تو کبھی ایک

وقت کی نماز نہیں پڑھی اور یہاں سجدے پہ سجدے کیے جارہے ہو۔"

خیر غالب پشیمان تو کیا ہوتے، تاہم سر جھکائے چپ چاپ کھڑے رہے۔ آوازِ غیب آئی:

"تمھاری ساری خرافتوں اور خروج و خروش کے باوجود ہم نے تمھاری شاعری کے عوض جنت الفردوس میں جگہ دی۔ یہاں تمھاری ناز پروری کے لیے غلمان اور دل بستگی کے لیے حوریں موجود ہیں۔ انواع و اقسام کے میوے ہیں۔ سب سے بڑھ کر تمھاری سیرابی کے لیے شراب طہورا ہے، پھر بھی تم بے چین و مضطرب ہو۔"

غالب دست بستہ عرض گزار ہوئے: "خدائے بزرگ و برتر مجھ جیسے مور و ملخ سے بدتر ہستی کو تو نے بلند درجات سے سرفراز کیا جس پر ولیوں اور شاہوں کو بھی رشک آتا ہے۔ یہ کفران نعمت ہوگا اگر میں تیری بے حد و حساب کرم فرمائیوں اور لاتعداد مہربانیوں کا اعتراف نہ کروں مگر......"

غالب دم بھر کو رکے۔ پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوئے: "تیری فردوس میں سب کچھ ہے بارالہا مگر نہ جانے کیوں مجھے کہیں کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے اور کسی طور تشفی نہیں ہوتی۔"

پوچھا گیا: "کیا چاہتے ہو؟"

غالب نے رسان سے اپنا شعر پڑھا:

کیوں نہ دوزخ کو بھی جنت میں ملا لیں یا رب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

اتنا سننا تھا کہ جنت میں اس سرے سے اس سرے تک کھل بلی مچ گئی۔ حور و غلمان بوکھلا گئے۔ رضوان بہشت کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، جنتیوں میں جس نے سنا ماتھا پیٹ لیا اور خدا خود اپنے بندے کی اس عجیب و غریب خواہش پر حیران رہ گیا۔

☆

آخر جنت میں اس قدر شور و غوغا ہوا کہ مرزا کی آنکھ کھل گئی۔ مرزا پسینے سے تر بستر پر پڑے اپنے اس حیران کن خواب پر غور کرنے لگے۔ رہ رہ کر خود انھیں اپنا ایک شعر یاد آرہا تھا۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہے خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اتنے میں خادم ایک ویسا ہی لفافہ لے آیا جو دوپہر میں کھانا کھاتے وقت چٹھی رساں دے گیا تھا۔ ساتھ ہی حالی کے آنے کی اطلاع بھی دی۔ "انھیں اندر بھیج دو۔"

چند لمحے نہیں گزرے کہ مولانا حالی سراپا نیاز حاضر خدمت ہوئے اور آداب بجالائے۔ غالب

نے خوش دلی سے کہا: ''آؤ میاں حالی آؤ، بیٹھو۔''

حالی ایک طرف بیٹھ گئے۔ مرزا حالی کو تازہ لفافہ دکھاتے ہوئے مسکرا کر بولے:

''دیکھ لو میاں، حریف ناشکیبائی مجھے آزار پہنچانے میں کس قدر مستعد ہے۔ اب پتہ نہیں اس چٹھی میں کس کی گالی دی ہے نیک بخت نے۔''

حالی نے ندامت بھرے لہجے میں کہا: ''حضور والا، میں دل سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھے ان ناصواب چٹھیوں کا کوئی علم نہیں تھا۔ دوپہر میں جو گستاخی مجھ سے سرزد ہوئی اس کے لیے تاعمر شرمندہ رہوں گا۔''

غالب ہنس دیے: ''نہیں میاں، تمھیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر اب ان نابکار چٹھیوں کا اثر نہیں ہوتا۔ تمھاری باتوں کا برا کیوں مانوں۔ تم نے جو لکھا اپنے مزاج اور طبیعت کے حساب سے ٹھیک ہی لکھا۔''

حالی نے تلافی مافات کے لیے کہا: ''لایئے میں پڑھ دیتا ہوں اس چٹھی کو۔''

غالب نے گردن ہلاتے ہوئے کہا: ''نہیں میاں، اب کسی بھی چٹھی کو پڑھنے کی ضرورت نہیں۔''

اور لفافے کو چاک کیے بغیر سلگتے آتش دان میں ڈال دیا اور ایک سرشاری کے عالم میں گنگناتے ہوئے حمام کی طرف بڑھ گئے۔

نہ سنو گر برا کہے کوئی — نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

''ابن مریم ہوا کرے کوئی''

Mob: 9967330204

■■

افسانہ

عبدالصمد

طوفان میں گھرا ساحل

"اندر آسکتی ہوں سر......"

میں اس وقت کچھ انتہائی ضروری کاغذات کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ اگر اس آواز میں ایک جانی بوجھی، بھولی بسری خوشبو اچانک مجھے کسی اور ہی دنیا میں نہ پہنچادیتی تو میں ہرگز سر نہیں اٹھاتا۔ آواز کی بجلی اتنی سرعت سے میرے اندر سمائی کہ میں وہ رہا ہی نہیں جو چند لمحے قبل تھا۔

دروازہ اور کمرے کے درمیان اندرونی دھند لکے اور باہری روشنی کے ملے جلے اشتراک میں شرابور ایک ہیولہ سا نظر آیا جس کے وجود سے ایک جانی بوجھی خوشبو نشر ہو رہی تھی جس نے مجھے کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ وہ چاندنی ہی تھی۔

ایک ادھیڑ بلکہ اس سے بھی آگے کے کسی نامعلوم مقام پر کھڑی عورت کے اندرون یقیناً چاندنی ہی چھپی ہوئی تھی، وہ روشنی کا ایک ایسا ہالہ تھی جو ہزار پردوں میں چھپ کر بھی چاندنی ہی رہتی۔ اس تیز وطرار لمحے نے مجھے جیسے اچھال کر اُن گلیوں میں پہنچا دیا جس کی فضاؤں اور ہواؤں کی خوشبوئیں میرے اندر اندر بسی ہوئی تھیں اور میرے ہزار کوشش کرنے کے بعد بھی پرانی نہیں ہوئی تھیں۔ ان

کچی پکی گلیوں میں قدموں کے جو نشان تھے، وہ ماضی کی دھندلاہٹ سے مٹے نہیں تھے۔ بھلے ہی وہ گلیاں اپنا وجود کھو چکی ہوں اور ان کی بوسیدگی اور پکا کچا پن چمکیلی سڑکوں میں تبدیلی ہو چکی ہوں، مگر مجھے ان تبدیلیوں سے کیا لینا دینا......

چاندنی کو اپنے اندر چھپائے ہوئے وہ شخصیت میرے خوابوں کی دنیا تھی جو بہت دشوار گزار راستوں سے تعبیر کی صورت میرے سامنے تھی، یہ تعبیر ہی تو تھی کہ اس وقت میز کے اس طرف میں بیٹھا تھا اور دوسری طرف وہ۔ ہمارے درمیان اجنبیت کا وہ پردہ زبردستی حائل تھا جس کا وجود تار تار ہو چکا تھا، پھر بھی وہ استادہ تو تھا ہی۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پا کے پوچھا۔

''تو آپ تبادلے پر آئی ہیں......؟''

''جی......!''

نہایت مختصر جواب......اس کی یہ عادت گویا ابھی تک برقرار تھی بلکہ کبھی کبھی تو وہ سر ہلا کے یا ہاتھ کے اشارے سے ہی اپنا مافی الضمیر ادا کر دیتی، ویسے وہ جب بھی بولتی تو یوں کہ وہ بولے اور سنا کرے کوئی۔ اس کی نگاہیں بظاہر میری طرف مرکوز نہیں تھیں، پھر بھی میری نگاہوں سے براہ راست ٹکرا رہی تھیں بلکہ شاید وہ میری نگاہوں کی زد ہی میں تھیں۔ اس کا انداز اور اطوار یہ پتہ نہیں دیتا تھا کہ وہ بھی اس وقت انہیں گمشدہ فضاؤں میں تیر رہی ہے جہاں میں پہنچ گیا تھا۔ زمینی حقیقت یہ تھی کہ میں اس وقت اس کالج کا پرنسپل تھا جہاں وہ اپنے ٹرانسفر کے بعد جوائن کرنے آئی تھی۔ میں نے اسی حقیقت کو اپنی مٹھی میں کسنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے پروفیشنل انداز میں دریافت کیا۔

''آپ کی تو سروس کم ہی ہوگی، پھر آپ کا یہاں ٹرانسفر......؟''

اس کے چہرے پر افسردگی کے آثار نمایاں ہوئے اور وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''جہاں میں تھی، وہاں کسی اور کو لانا تھا......''

میں بھی افسردہ ہو گیا۔

''ان لوگوں نے عورت کا بھی خیال نہیں کیا۔ آپ کو کورٹ جانا چاہئے تھا......''

اس نے جواب دیا۔ ''کچھ لوگوں نے مشورہ دیا تھا، مگر سوچا، اب اس عمر میں مقدمے وغیرہ کے چکر میں کہاں پھنسوں، پھر یہ شہر میرے لئے اجنبی بھی نہیں۔ میری ننھیال یہیں ہے اور کچھ رشتہ دار بھی یہاں رہتے ہیں......''

فی الوقت آگے کچھ کہنے کی گنجائش باقی ہی نہیں رہی۔ میں نے گویا سپر ڈال دی۔

''میں نے آپ کی جوائنگ پر دستخط کردیا ہے، آفس چلی جایئے......''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔

اتنی دیر میں میری دنیا اتنی بدل گئی کہ کہاں تو میں کچھ انتہائی ضروری کاغذات میں کھویا ہوا تھا، کہاں اب خود کہاں کھوگیا۔ تیس چالیس پہلے نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دھیرے دھیرے گھیرا تنگ ہوتا گیا اور میں اس جکڑن کے سبب ایک عجیب لذت سے دوچار ہوگیا۔

اپنے ماتھے پر پڑے وقت کے گرد وغبار کو پھونکوں سے ہٹانے کے بعد وہ زمانہ اچانک روشن ہوگیا۔ میرا گھر اور اس کا گھر...... پڑوس سے بڑھ کر قربت......

ایک گھر میں کوئی خاص ڈش پکتی تو اس میں دوسرے گھر کی لازمی طور پر حصہ داری ہوتی۔

میں یونیورسٹی کے آخری سال میں تھا اور وہ کالج کے ابتدائی درجے کی طالب علم۔ وہ خوشی خوشی اپنی کتابیں لے کر میرے پاس آجاتی۔ اس وقت کوئی لطیف جذبے کی خوشبو ہمارے درمیان بیدار نہیں ہوئی تھی، یا ہوئی ہو تو ہمیں پتہ نہیں تھا، میں تو اس قسم کی چیزوں کا مذاق اڑاتا تھا، مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ چپکے چپکے یہ خوشبو میرے اندر سرایت کر چکی ہے۔ وہ آنکھوں کے سامنے نہیں رہتی، پھر بھی اس کے بدن کی خوشبو مجھے اپنے ہالے میں لئے رہتی۔ وہ سامنے ہوتی تو وقت دبے پاؤں ہمیں چھوئے بغیر آہستہ سے اپنی راہ لیتا اور ہمیں اس کے جانے کی خبر بھی نہ ہوتی۔ گو مجھے اپنی زبان سے تب بھی اعتراف نہیں تھا جب کہ کوئی نامعلوم مگر مضبوط جذبہ اندر اندر مجھے للکار چکا تھا اور مجھے زیر کرنے کے سارے حربے استعمال کر رہا تھا۔

اس زمانے میں اس قسم کے جذبے برق رفتار گھوڑوں پر سوار نہیں ہوئے تھے۔ موبائل، وہاٹس اپ، انٹرنیٹ وغیرہ کا تو تصور بھی نہیں تھا۔ محبت آسمانوں پر نہیں اڑتی تھی، آہستہ آہستہ زمین پر رینگتی تھی، اور منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کی گرفت بہت مضبوط ہوجاتی۔ اس کی آنکھیں، آواز، بدن کی رعنائیاں، چمکیلے لمبے بال، اس کا گہرا سانولا رنگ، یہاں تک کہ اس کے ہاتھ پیر کی انگلیوں کی بناوٹ کسی اور لڑکی میں مجھے دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ وہ سامنے رہتی تب میرا دل اس کے سامنے سرنگوں رہتا، نہیں رہتی تو اس کا سراپا، اس کا تصور مجھے ہر چہار طرف سے گھیر لیتا۔ پہلے اس نے میرے اندر کی خالی جگہوں کو بھر دیا، پھر جو جگہیں میری اپنی تھیں، ان پر قبضہ کرلیا۔ میں نے انجانے پن میں اس میں اپنے آپ کو کھودیا۔ جب میں اپنے اندر ابلتے ہوئے ٹھنڈے شعلوں سے لمحہ بھر کے لئے باہر آتا تو مجھے یہ چیزیں absurd معلوم ہوتیں، مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوتی کہ میں اپنا پتہ کیسے بھول گیا۔ میں اس جال میں ایسا پھنسا کہ خود مجھے پتہ نہیں چلا اور اب اس جال سے ہوش وحواس کے سہارے

نکلنا چاہوں تو یہ چیز میرے بس میں نہیں رہی تھی۔ کبھی کبھی اپنے آپ میں واپس آنے کے لمحوں میں، میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کی کوشش بھی کرتا کہ آخر کون سی ایسی بات ہے جو مجھے اس کی طرف کھینچتی ہے۔ میں اپنا ذہن دوسری طرف، تیسری طرف یا کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا تو مجھے شرمندگی کی حد تک ناکامی کا احساس ہوتا۔

میرے تصور میں ایک بھرپور عورت کی جو بھی شبیہ ابھرتی، اس میں وہ پوری اترتی تھی، نگاہوں میں آنے والی ہر عورت اور لڑکی کا موازنہ لاشعوری طور پر چاندنی سے کرتا تو ہمیشہ چاندنی کا پلڑا بھاری ہو جاتا۔ میں قائل ہو گیا تھا کہ محبت صرف روحانی نہیں، جسمانی بھی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات جسم روح پر بھاری ہو جاتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عورت مرد کے رشتے کے درمیان روحانیت کیا شے ہوتی ہے۔ روحانیت کا سفر جسم کی طرف نہیں جاتا، جسم کا سفر روح کی جانب مائل بہ پرواز ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے بہت سے فلسفے اور گتھیاں خالی اوقات میں میرے ذہن میں چکر لگاتے رہتے، خاص طور سے اس وقت جب چاندنی یا اس کا تصور کسی وجہ سے مجھ سے الگ ہوتا۔

پڑھائی کے بہانے چاندنی کا مجھ سے قریب آ جانا کسی کی نگاہوں میں کھٹکتا نہیں تھا اور میں تو ہر وقت اس کی قربت کے بہانے ہی ڈھونڈتا رہتا۔ اپنی پڑھائی کو بالائے طاق رکھ کے میں نے چاندنی ہی کے کورس کو اپنا لیا۔ وہ خود کم پڑھتی، اس کی پڑھائی میں کرتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاندنی کا ریزلٹ غیر معمولی طور پر شاندار رہا۔ امتحان اس نے دیا تھا، مگر اس کی تیاری میں نے کی تھی۔ یہ بات چاندنی اچھی طرح جانتی تھی، میرے لئے یہی بہت تھا کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی ایسی بات ضرور ہے جو صرف ہمارے ہی تک محدود ہے، کسی تیسرے کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اس احساس سے میرے اندر ایک سرشاری کی کیفیت پیدا ہو جاتی تھی۔

چاندنی سے قربت کے میں ایسے ایسے بہانے ڈھونڈتا جو دوسروں کی نگاہوں میں ضرور مضحکہ خیز ہوں گے مگر میرے احساسات اور میری آنکھیں ان چیزوں کو دیکھنے سے قاصر تھیں اور اس وقت تو مجھے شدت سے یہ محسوس ہوا کہ میں اپنے آپ کو کھو چکا ہوں جب چاندنی دو ہفتوں کے لئے اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں دوسرے شہر چلی گئی۔ فضائیں میرے لئے پھیکی پڑ گئیں، گھر کاٹ کھانے لگا، موبائل وغیرہ تو بہت دور کی بات تھی یعنی خواب و خیال میں بھی نہیں تھا اور میں چاندنی سے اس کے رشتہ دار کا فون نمبر نہیں مانگ سکتا تھا۔ مانگ بھی لیتا تو کیا ہو جاتا۔ میں اس کو فون تو کر نہیں سکتا تھا، میں تو اس کے گھر پر بھی فون نہیں کرتا تھا۔ بظاہر اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا جب کہ بات وہاں پہنچ چکی تھی جہاں خود ہماری سوچ بھی نہیں پہنچی تھی۔ یہ دو ہفتے یوں گزرے کہ انہوں نے میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ ایک

کیمیائی تبدیلی سے میں گزر گیا۔ مجھے یاد ہی نہیں کہ اس عرصے میں، میں نے کیا کیا، بس یہ کہ کسی طرح زندہ رہا۔ نچوڑ یہ تھا کہ یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ میں چاندنی کے بغیر شاید زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ خیر، وقت جیسا بھی ہو، اپنی خصوصیت کی بنیاد پر گزر ہی جاتا ہے۔ چاندنی اپنے 'بن باس' سے لوٹی تو ہم یوں ملے جیسے زندگی میں پہلی بار ملے ہوں...... مگر نہیں، شاید بیان کرنے میں مجھ سے ایک چوک ہو رہی ہے، یہ تو مجھے پتہ ہی نہیں تھا کہ چاندنی میرے بارے میں کیا سوچتی ہے، اس سے ابھی تک باقاعدہ میرا کوئی اقرار محبت تو ہوا نہیں تھا۔ بس میں اسے دیکھتا، اس سے باتیں کرتا اور اپنے اندر ایک قسم کی توانائی کا احساس کرتا رہتا۔ وہ سامنے نہیں ہوتی تو جیسے میرا کوئی وجود باقی ہی نہیں رہتا تھا۔ یوں باتیں بے شمار تھیں مگر تقریباً سب کی سب میرے دل ہی میں مچلتی تھیں، پتہ نہیں کیوں، مجھے یہ یقین یا گمان تھا اور آج بھی ہے کہ چاندنی کے سوچ کی سطح بھی وہی تھی جو میری تھی۔ مجھے تو وہ سرشار سرشار سی دکھائی دیتی، اس کا انگ انگ جیسے مجھ سے سرگوشی کرتا رہتا۔ اس کی جھیل جیسی گہری آنکھوں میں بے شمار کہی ان کہی کہانیاں ہمکتی رہتیں۔ ممکن ہے وہ خود بھی ان کہانیوں کی معنی خیزی سے واقف نہ ہو مگر میری نگاہوں کے سامنے تو کہانیوں کی کتابیں کھلی ہوئی تھیں اور میں ان کے مطالعے سے ایک خوشنما دنیا کی ڈگریاں حاصل کرتا رہتا۔

چاندنی یوں تو کم گو تھی مگر اس کا انگ انگ بولتا تھا، اس کی خاموش دل فریب مسکراہٹ بیشمار قہقہوں پر بھاری تھی۔ میری بے تاب نگاہیں اس کے جسم کا طواف کرتی رہتیں اور مجھے محسوس ہوتا کہ اس کا انگ انگ میرے اندر سمایا جاتا ہے۔ شاید عام نگاہوں میں وہ ایک عام لڑکی ہو، مگر میرے لئے ہرگز نہیں۔ میں نے بے شمار لڑکیوں کو دیکھا، ان سے ملا، ان سے باتیں کیں، لیکن جو اپیل چاندنی میں مجھے محسوس ہوتی، اس کا عشر عشیر کہیں اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چاندنی کے تصور اور اس کے وجود سے میری دنیا آباد تھی۔ میری جو بھی سوچ تھی وہ سیدھی اسی کی طرف جاتی۔ مگر جذبات کی اس شدت نے میرے ہونٹوں پر ایسا تالہ لگا دیا تھا جس کی چابی کھو گئی تھی۔ میں اس تالے کو کھولنے کی ہزار کوشش کرتا، مگر پتہ نہیں کیا بات تھی کہ تالہ کھلتا ہی نہیں تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ چاندنی اور میرے درمیان دور دور تک سناٹے اور خاموشی کی دبیز چادر تن گئی جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر میں کسی طرح ہونٹوں پر لگے تالے کو کھولنے کی کوشش کر سکتا تھا، شاید چاندنی بھی اس کوشش میں میرا ساتھ دیتی، ویسے میں یقین کے ساتھ اب بھی یہ نہیں کہہ سکتا، یوں بھی پہل میری ہی جانب سے ہونی چاہئے تھی، مگر جب بھی یہ سنہرا موقع آتا تو پتہ نہیں کون سی چڑیا میرے کانوں میں پھونک دیتی کہ ابھی نہیں، تھوڑا اور انتظار...... اور انتظار...... یہ انتظار کس چیز کا تھا، یہ میں نہ تو اس وقت جانتا تھا نہ اب جانتا ہوں۔ میں چاندنی کے

چہرے، آنکھیں اور اضطرابی کیفیتوں کا گہرائی سے مطالعہ کرتا رہتا، مگر وہ ایسا سمندر تھی جس کا منتھن کر کے گوہر مقصود کو حاصل کرنا ممکن نہیں دکھائی دیتا تھا، پھر بھی میں اپنے دل کو تسلی دے لیتا کہ شاید ابھی وہ مقام نہیں آیا، ابھی مجھے کچھ اور ٹھہرنا چاہئے...... وہ آئے گا، ضرور آئے گا۔

اس افلاطونی رشتے کا جو نتیجہ نکلنا تھا، وہ نکلا۔ چاندنی کے ایک دور کے رشتہ دار خاندان کو وہ پسند آ گئی اور ان کے بزنس مین بیٹے سے اس کی چٹ منگنی پٹ بیاہ ہو گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں کے طوطے پھڑ پھڑا کے اڑ گئے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے کانٹے دار درخت پر پھیلے ہوئے میرے وجود کو کھینچ لیا اور میرا پورا جسم لہولہان ہو گیا۔ گو اصل لہولہان میری روح ہوئی تھی۔ زخم اندر اندر تک پہنچ گیا، کسی نے نہ تو میرے جسم کا زخم دیکھا نہ روح کا، میرے منہ سے چیخ تک نہیں نکلی۔ میں اپنے آپ کو چاندنی گھرانے کا ایک فرد اور چاندنی کے بہت قریب سمجھتا تھا، مگر میں تو حاشیے پر ڈال دیا گیا تھا۔ اصل شکایت تو مجھے چاندنی سے تھی، اس نے تو مجھے اس کی بھنک بھی نہیں لگنے دی۔ میں جیسے زمین سے اکھڑ گیا اور ہواؤں میں ڈولنے لگا۔ میرا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ زندگی نے میرے لئے اپنا معنی کھو دیا اور زندہ رہنے کے سارے وجوہات یکسر ختم ہو گئے۔ وہ تو بہت بعد میں مجھے اس کا احساس ہوا کہ جس کھیل میں، میں اپنے آپ کو گلے گلے تک ڈوبا ہوا سمجھ رہا تھا، دراصل وہ کوئی کھیل تھا ہی نہیں، ایک طرفہ کھیل کیا چیز ہوتا ہے...... اس ہوائی کھیل میں مصروف ہو کے میں جو اپنے آپ کو بڑا عاقل و بالغ سمجھتا تھا، خود اپنی ہی نگاہوں میں سخت احمق ثابت ہوا۔ چاندنی کے تئیں میں نے شکایتوں کا ایک پہاڑ کھڑا کر لیا تھا، مگر یہ پہاڑ تاش کے خیالی پتوں کا تھا، جب چاندنی سے میری کوئی بات ہی نہیں ہوئی، کوئی وعدہ وعید ہی نہیں ہوا، کوئی باہمی اقرار نہیں ہوا تو پھر کس بل بوتے پر اس سے امیدیں اور شکایتیں۔ میری شکایتوں کے اصل حق دار تو اس کے والدین تھے یا پھر میرے والدین، مگر ان سے بھی کیا شکایت، انہیں چاندنی کے لئے ایک مناسب رشتہ نظر آیا اور انہوں نے حامی بھر دی۔ ان کی سوچ کے پھیلے ہوئے کینوس میں، میں شاید کہیں پر موجود ہی نہیں تھا۔ چاندنی سے میری قربت لوگوں کی نگاہوں میں ضرور ہوگی، آخر اس قربت کو انہوں نے کون سا رنگ دے رکھا تھا۔ ان کی آنکھیں، ان کی سوچ اس سلسلے میں انہیں کیا اطلاعات فراہم کرتی تھیں ــــ؟

بہرکیف، میں تو وہ جنگ ہار ہی چکا تھا جو میں نے لڑی ہی نہیں تھی۔ جنگ کی جو بھی صورت ہو، اس میں کسی کی شکست بھی ہوتی ہے، اس جنگ میں میرے سوا کس کی شکست ہوئی تھی ــــ؟ میرے ساتھ میری ذمہ داریاں بھی تھیں، ماں باپ کی امیدوں اور ارمانوں کا چراغ میرے اندر بجھا نہیں تھا، اگر چہ دنیا کی نیرنگیوں پر سیاہی پھر گئی تھی اور اب اس پر رنگوں کا واپس آنا بظاہر ناممکن ہی تھا، سو میں نے

اپنے شکستہ جذبوں کو بالائے طاق رکھ کران فرائض کو پورا کرنے کی ٹھان لی جو درحقیقت میرے وجود کا سبب تھے۔ میں نے اپنی تعلیم مکمل کی، کالج میں لیکچرر مقرر ہوا اور ماں باپ کی خواہشوں کے سامنے سرنگوں ہو کے اپنے سر پر سہرا بھی باندھ لیا۔ جس لڑکی کے ساتھ میری شادی ہوئی وہ عام نگاہوں کے مطابق بہت خوبصورت تھی مگر اس کو کیا کیا جائے کہ خوبصورتی کا میرا معیار تو چاندنی کے قدموں میں جا کے ختم ہو جاتا تھا۔ مگر میں اپنی بیوی کو اپنے شکستہ جذبات کے لئے قربانی کا بکرا نہیں بنانا چاہتا تھا۔ وہ عورت تو بالکل بے قصور تھی۔ وہ جو تمنائیں اور جذبوں، ارمانوں کی دنیا لے کر میرے پاس آئی تھی، ان کا احترام کرنا میرا فرض تھا۔ شکست میری ہوئی تھی، اس کی نہیں۔ اسے اپنے شکست میں شامل کرنے کا میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔

چاندنی میرے تصورات اور ذہن سے نکلتی ہی نہیں تھی۔ پتہ نہیں کیوں، اکثر بے خیالی میں اور بے ہوش وحواس بھی مجھے لگتا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں، اس سے باتیں کر رہا ہوں، جس عورت یا لڑکی کو بھی دیکھتا، اس میں چاندنی کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا، اس کے ایک ایک اعضا سے چاندنی کے اعضا سے مقابلہ کرتا۔ اپنی بیوی سے بھی میری اصل قربت اسی وقت ہوئی جب بہت کوششوں کے بعد میں اس کے اندر چاندنی کو پا سکا، قربت کے وقت چاندنی میرے ذہن میں رہتی اور سامنے بیوی کا جسم ہوتا۔ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا جس کا تعلق صرف اور صرف میرے اندرون سے تھا۔ میری بیوی کو اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی سے بہت خوش اور مگن تھی اور اسے اپنی خوش قسمتی اور کامیابی کا معراج سمجھتی۔ چاندنی کے بارے میں اس کی جانکاری بس یہی تھی کہ وہ میرے پڑوس میں تھی اور پڑھائی میں، میں اس کی گاہے گاہے مدد کر دیا کرتا۔ اس بیچاری کو کیا پتہ کہ اس کی کامیابی اور خوش قسمتی کے پیچھے دراصل کس کا ہاتھ ہے یہ ایک طرفہ تماشا تھا جس میں، میں نے ان دونوں کے درمیان ایک ایسا خلا تلاش کر لیا تھا جس میں دونوں سما گئی تھیں۔ میں چاندنی کا ہمیشہ احسان مند رہا کہ اس نے انجانے پن میں میری زندگی کی ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا، اپنی بیوی کا بھی کہ وہ اپنی بے خبری میں چاندنی کی ایسی معاون بن گئی تھی جس سے میری زندگی خوشگوار ہو گئی تھی۔

چاندنی کے اتنے برسوں کے بعد یکایک آ جانے سے میری زندگی کا ایک نیا اور انوکھا باب کھل گیا۔ اس کی آمد سے میرا یہ یقین مضبوط ہوا کہ میں آج تک اسے بھولا نہیں ہوں۔ میں نے اسے ہر عورت میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور اپنی بیوی پر یہ تلاش ختم ہوئی۔ ہم یعنی میں اور چاندنی زندگی کے بڑے اور اہم ترین حصے گزار چکے اور ہمارے پاس نیا کچھ کرنے کی بالکل گنجائش نہیں تھی۔ ہم اپنی زندگیوں کے راستے پر اتنا آگے جا چکے تھے کہ اب وہاں سے واپس آنا مشکل ہی نہیں، ناممکن

تھا، مگر پتہ نہیں کیوں اس وقت چاندنی کا اچانک آجانا مجھے بے حد معنی خیز لگ رہا تھا، گو کسی معنی تک
میری رسائی نہیں تھی، بس یقین سا تھا کہ اس عمل میں معنی کی ایک دنیا ضرور پوشیدہ ہے۔

چاندنی جوائن کر چکی تھی۔ اس کی فائل میرے پاس آ گئی تھی اور میں نے اس پر اپنے دستخط بھی
ثبت کر دئے تھے۔ میں یہ سب کام مشینی انداز میں انجام دے رہا تھا کیوں کہ میں تو چالیس پینتالیس
برس پہلے کی یادگلی میں گم ہو چکا تھا۔ چاندنی کو کھونے کے بعد میں نے اپنی زندگی کو ایک خاص
ڈھرے پر ڈال دیا تھا اور ابھی تک اپنی سوچ کو اس پر گامزن کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا کہ یہ سفر
اچانک دوسری طرف مڑ گیا۔ چاندنی کو اچانک دیکھتے ہی مجھے بہت سی باتیں یاد آگئیں، بہت سی بھول
بھی گیا، بہت سی ایسی باتیں جن پر باقاعدہ اس وقت دھیان نہیں گیا تھا، مگر وہ ذہن کے وسیع وعریض
کینوس میں کہیں نہ کہیں دبکی پڑی تھیں۔ چالیس پینتالیس سال پہلے کی چاندنی آج کی چاندنی میں
چھپ چکی تھی، آج کی چاندنی کے ڈھلکے ہوئے جسم کے اندر ایک جوان چاندنی پوشیدہ تھی۔ اس کی
گہری اور بے حد معنی خیز روشنیاں گو مدھم پڑ گئی تھیں، مگر ابھی بھی ان گمشدہ چمک کو تلاش کیا جا سکتا تھا،
اس کی آواز کی موسیقیت ختم نہیں ہوئی تھی، صرف دھیمی ہو گئی تھی۔ دور ہی سے مہکنے والا اس کا جسم اپنے
آپ میں سمٹ گیا تھا، مگر قریب سے اس کی خوشبو محسوس کی جا سکتی تھی۔ مگر سب سے اہم ترین سوال
تھا اس وقت اس کے اتنے قریب جانے کا۔

ماضی کے لمبے لیکن پلک جھپکتے سفر کے بعد میں واپس آیا تو ایسا لگا کہ چاندنی مل تو گئی ہے مگر
دوسرے انداز میں۔ ہماری ملاقات سوفی صد رسمی تھی یا ہم نے جان بوجھ کے اسے رسمی بنا دیا تھا۔ میں
نے تو اسے فوراً پہچان لیا تھا، اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا، یہ میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا تھا۔ اگر وہ مجھے
پہچان کر بھی اجنبیت دکھاتی رہی تو وہ یقیناً ایک بڑی اداکارہ ہے۔ حالانکہ میں نے بھی پہچان ظاہر نہیں
کی، شاید یہ میری احتیاط تھی، مصلحت یا دفتری ڈسپلن یا پھر اس کی توقع کہ پہل اس کی جانب سے ہو۔
پتہ نہیں کون صحیح تھا کون غلط۔ بہر کیف یہ سوچ کر مجھے ایک گونہ تشفی سی ہو رہی تھی کہ کم از کم چاندنی
میرے پاس آ تو گئی ہے۔ اب تو اس سے روز ہی واسطہ پڑے گا۔ مگر سخت احتیاط کے ساتھ، اور یہ
ذمہ داری میری تھی کہ بے ساختگی جذبات میں مجھ سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جس سے اس
نازک رشتے پر آنچ آجائے جس سے صرف ہم ہی واقف تھے...... ہم نہیں بلکہ صرف میں۔ میں اس
کے بارے میں یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا تھا کہ ہماری زبانیں اور ہمارے لب اس رشتے کے کبھی
رازدار تو بنے نہیں تھے۔

ٹیچر اور پرنسپل کے درمیان ہزار ذاتی قربت رہے، مگر ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ ایک باوقار فاصلہ

ضرور بنا رہے، اور میں اس اصول پر سختی سے کاربند ہونے کی کوشش بھی کرتا تھا، حالانکہ چاندنی کے سلسلے میں کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا کہ شاید میرا یہ اصول اندر ہی اندر متزلزل ہو رہا ہے۔ خواہش تو میری یہ ہوتی کہ چاندنی ہر دم میرے سامنے رہے، میں اس کو دیکھتا رہوں، اس سے باتیں کرتا رہوں، میں اسے دیکھتے رہنے اور باتیں کرنے کا جواز بھی تلاش کرتا رہتا۔ یوں یہ سب میرے منصب کے منافی تھیں اور اب تک جو عزت اور وقار کی کمائی کی تھی، وہ پل بھر میں ضائع ہو سکتی تھی۔ چاندنی کو ہر وقت میرے پاس آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ شعبے سے متعلق کوئی ضرورت ہوتی تو یہ سنیئر ٹیچر کی ذمہ داری تھی اور چاندنی تو بہرکیف کالج میں نئی نئی آئی تھی۔ میری اصل پریشانی یہ تھی کہ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ فی الوقت، چاندنی کے دل میں میرے لئے کیا جذبات ہیں۔ اس کے انداز سے تو یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی بھی ہے۔ حالانکہ یہ ممکن نظر نہیں آتا، برسوں کا ساتھ رہا ہے، پہلے شاید اس وقت مجھ سے زیادہ اس کی کسی سے قربت بھی نہیں تھی۔ ہمارے درمیان وہ رشتہ ہی نہیں تھا جس کا تعلق دل سے ہوتا ہے، اگر تھا بھی تو یک طرفہ۔ مگر سوال یہ ہے کہ کوئی انسان بیتے ہوئے اوقات کو کھرچ کھرچ کے اپنی یادوں سے نکال سکتا ہے کیا ——؟

بہت اندرونی جستجو کے بعد میں نے کالج کے سبھی شعبوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لئے اساتذہ کے ساتھ میٹنگ طے کی۔ انگریزی شعبے کی میٹنگ میں چاندنی بھی شریک ہوئی، مگر وہ آخری کرسی پر بیٹھی۔ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''آپ وہاں کیوں بیٹھی ہیں میڈم ——؟ آگے تشریف لائیے، اب تو آپ کالج برادری میں شامل ہو چکی ہیں......''

چاندنی قدرے تکلف کے بعد اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی آگے کی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ پتہ نہیں کیوں مجھے محسوس ہوا کہ لوگوں کی نگاہوں میں کچھ مبہم قسم کے سوالات ابھر آئے۔ شاید یہ میرے دل کا چور تھا جو قدم قدم پر مجھے مختلف قسم کے واہمے میں مبتلا کرتا تھا۔ میں نے گویا اپنی خفت مٹانے کی کوشش کی۔

''چاندنی صاحبہ کالج میں بھلے نئی نئی آئی ہیں، مگر یہ ٹیچر نئی نہیں ہیں اور کالج میں نیا اور پرانا کیا......؟''

سب کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی رینگ گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس میں کوئی معنی خیزی دکھائی نہیں دی جس سے مجھے تسلی سی ہوئی۔ میں رٹے رٹے انداز میں بولتا رہا اور رسمی طور پر ان کی سنتا رہا۔ میرے لئے یہی بہت تھا کہ چاندنی میرے سامنے، میرے اتنے قریب بیٹھی ہوئی تھی،

ہمارے درمیان کا برسوں کا طویل فاصلہ اچانک مٹ گیا تھا۔ ہم دونوں اپنی عمر طبعی کو پہنچ رہے تھے۔ جو کچھ ہم پر بیت گئی تھی، وہ ہماری ذاتی تاریخ کا حصہ تھی، آگے کیا ہوگا، ہم بالکل نہیں جانتے تھے، جب تک میٹنگ چلتی رہی، میں اندرونی طور پر ایک سرشاری کی کیفیت میں مبتلا رہا۔ ختم ہوئی تو جیسے اتنے لوگوں کی موجودگی میں، میں بالکل تنہا و یکہ رہ گیا۔ زندگی کے جس خلا کو میں طرح طرح کے رنگوں سے دور کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا، وہ خلا ساری کاوشوں، ساری بندھنوں اور سارے رنگوں کو تیاگ کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ مگر میں اس سے آنکھیں ملانے میں شرما رہا تھا۔

اب ایک دوسری خلش نے مجھے آگھیرا۔ چاندنی سے اگرچہ میرا سامنا کم ہوا تھا، مگر اس کے کسی عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی بھی ہے۔ حالانکہ میرا دل اس کو تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ جس کا برسوں کا ساتھ رہا ہو، وہ ملنے کے بعد اپنے آپ پر یوں قابو رکھے۔ شاید وہ کسی مصلحت کے تحت ایسا کر رہی ہو یا پھر وہ ایک غیر معمولی اداکارہ ہے۔ جب تک کوئی بات ثابت نہیں ہو جاتی، مجھے چین و قرار کہاں۔ جب میں کچھ دیر کے لئے اپنے جذبات پر قابو پاتا تو اپنے آپ پر لعنت بھیجنے کو جی چاہتا۔ میں پہلے کیا تھا اور اب کیا ہو گیا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر، معزز پیشہ، بالغ بال بچوں والا، ایک ایسی عورت کا شوہر جو ہمیشہ اپنے شوہر کی وفادار رہی، میری لمحہ بھر کی بے احتیاطی اور بے اختیاری سے میرے اندرونی جذبات جھلک گئے تو میں کہاں پر رہوں گا — ؟ سماج کو منہ دکھانے کے لائق بھی رہوں گا......؟ جس وقار اور عزت کی زندگی بھر کمائی کی، وہ کس بدنامی کی کھائی میں جا گرے گی......

جب تک یہ باتیں مجھ پر حاوی رہتیں، میں دوسرا ہی آدمی ہوتا، مگر یہ وقفہ بہت کمزور اور وقتی ہوتا، میں جلد ہی اس دنیا میں لوٹ آتا جہاں صحیح و غلط سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی۔

چاندنی سے روز تو سامنا نہیں ہوتا تھا، مگر جب بھی ہوتا، کوئی مضبوط مقناطیسی تار مجھے اس سے باندھ دیتا۔ ہزار کوشش کرتا کہ اس پر بس ایک اچٹتی ہوئی نگاہ سے زیادہ نہ پڑے، مگر میری نگاہیں میرے ارادے کو ماننے سے صاف انکار کر دیتیں۔ اس سے بہت باتیں کرنے کو جی بھی چاہتا، لیکن پیروں میں ایسی بیڑیاں پڑی تھیں کہ میں صرف اپنی ہی جگہ پر اچھل کود کر سکتا تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ اچھل کود بھی میرے اندرون کی اس سطح پر ہوتی جو باہری نگاہوں سے دور تو تھی ہی، خود میری پہنچ بھی وہاں نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ چاندنی کے پیروں میں کون سی بیڑیاں پڑی ہیں کہ وہ قدم بھی نہیں مار سکتی۔ ایسا محسوس ہوتا کہ ہم دونوں ایک مصنوعی دنیا میں میں سانس لے رہے ہیں جہاں ہر چیز دکھلاوہ ہے، مصلحت سے ڈھکی چھپی ہے۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ میں اپنی تمام پریشانیوں اور الجھنوں کے لئے چاندنی کو ایک کٹہرے میں کھڑا کر دوں اور اس سے جرح کروں، میں یہ بھول

جاتا کہ ٹھہرے، میں تو دراصل مجھے کھڑا ہونا چاہئے اور چاندنی مجھ سے جرح کرے، کبھی اس کی جانب سے۔ میں سوچ کے راستے پر گامزن ہوتا تو سارا قصور اپنا نکل آتا۔ میں بے معنی اور کبھی کبھی معنی سے پُر سوال و جواب کے ایک عجیب بھنور میں پھنس گیا تھا۔ طرح طرح کے سوال میرے اندر سے تیر کی طرح نکلتے، پھر کہیں سے جواب نہیں ملنے پر واپس میرے پاس آجاتے۔ اس بھنور سے نکلنے کا کوئی راستہ مجھے نہیں سوجھتا تھا۔

یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا یا کوئی انہونی، میں بھی شاید کسی اتفاق ہی کا منتظر تھا کہ میری گاڑی عین ایک ریستوراں کے سامنے جام میں پھنس گئی۔ میرے ڈرائیور نے ریستوراں کے باہر لگی ایک گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ''نئی میڈم کی گاڑی ہے سر......''

میں نے بے خیالی میں دریافت کیا۔ کون سی نئی میڈم......؟''

جواب ملا۔ ''ابھی حال ہی میں ٹرانسفر پر آئی ہیں، شاید انگریزی کی......''

میرا دل بلیوں اچھل گیا۔ ڈرائیور کو بھی چاندنی کے بارے میں گویا کچھ معلوم ہے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاکے دھیرے سے کہا۔

''گاڑی یہیں روک دو، جب تک جام ہے، میں چائے پی کے آتا ہوں......''

اس وقت مجھے مطلق خیال نہیں آیا کہ چاندنی اپنے شوہر یا فیملی کے ساتھ بھی تو ہوسکتی ہے۔ آخر کس امید پر میں نے اپنی گاڑی رکوادی اور کیا سوچ کر میں ریستوراں میں چلا گیا۔ مگر میں تو ایک مکمل ٹرانس میں آچکا تھا۔ سارے سوال جواب اور مصلحتیں میرے لئے بے معنی ہو چکی تھیں۔

چاندنی مجھے ایک کونے کی میز پر تنہا بیٹھی نظر آگئی۔ لمحہ بھر کے لئے میں ٹھٹک گیا، مگر وہاں زیادہ ٹھٹکنے کا بھی موقع نہیں تھا، چنانچہ میں فوری طور پر اس انداز سے اس کی میز کے پاس سے گزرا گویا یہ بھی اتفاق......یعنی اتفاقات کا ایک سلسلہ چل نکلا تھا۔ چاندنی مجھے دیکھ کر کھڑی ہوگئی، اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''سر......آپ یہاں......؟''

میں نے بھی چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے جواب دیا۔

''اوہ آپ......؟ باہر بہت جام لگا ہوا ہے، سوچا اتنی دیر میں یہاں چائے پی لوں......''

وہ مسکرائی، اس کے کچھ کہنے سے پہلے اضطراری طور پر میری زبان سے نکلا۔

''اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ ہی کی میز پر بیٹھ جاؤں......؟''

مجھے محسوس ہوا کہ لمحہ بھر کے لئے وہ جھجکی، پھر بول اٹھی۔

''سر...... یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی......''

میں نے کچھ تکلف کا پوز کرتے ہوئے ایک کرسی سنبھال لی، میرے بعد وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھی اور میرے کچھ کہنے سے پہلے دریافت کیا۔ ''سر، آپ چائے کے ساتھ کیا لیں گے......؟''

میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میڈم، یہ تو میرا فرض ہے، میں آپ سے سینیئر ہوں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ چائے منگوا چکی ہیں، اس کا بل بھی میں ادا کروں گا، ساتھ ہی آپ کو کچھ اسنیکس بھی لینا ہوگا......''

وہ مسکرا کر رہ گئی۔ ''جیسی آپ کی مرضی......''

میں نے ویٹر کو بلا کر آرڈر دے دیا۔ میرے اندر ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ جس لمحے کا میں بے چینی سے منتظر تھا، وہ لمحہ اچانک آ پہنچا تھا بلکہ میرے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ مگر اس لمحے کا کیا مصرف تھا، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا اور اب کچھ سوچنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے اپنی پوری قوت ارادی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اندر کے سارے اتار چڑھاؤ کو یکلخت درکنار کیا اور ساری جھجک اور مصلحتوں پر قابو پا کے سیدھے سیدھے اس سے دریافت کیا۔

''چاندنی صاحبہ، یہ بتایئے، آپ مجھے پہچانتی ہیں یا نہیں......؟''

اس کے چہرے کا رنگ فوراً کچھ سے کچھ ہوگیا۔ ہونٹوں، آنکھوں کی پتلیوں، چہرے بلکہ سارے جسم پر ایک دکھائی نہ دینے والی نامعلوم قسم کی کیمیائی تبدیلی رونما ہوئی، اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹوں سے نکلا۔ ''بھلا یہ ممکن ہے کہ میں آپ کو نہ پہچانوں......؟''

میری ہمت پوری قوت کے ساتھ اچانک عود کر آئی اور میں نے دریافت کیا۔

''پھر آپ......تم نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا......؟''

مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ بھی اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ 'آپ' سے 'تم' سن کر اس کے چہرے پر ایک خوبصورت رنگ ابھر آیا، جو شاید مجھے ہی نظر آ سکتا تھا۔ اس نے بھی فوراً جواب دیا۔

''یہی سوال میں کروں تو......؟''

سچ ہے کہ میرے پاس فوری طور پر کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ یوں کہنے کو تو بہت کچھ کہہ سکتا تھا، مگر وہ سب باتیں میرے اپنے سوچ کی پیداوار تھیں، میں چاندنی کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کا بالکل حق نہیں رکھتا تھا، میرے لیے اس وقت یہی بہت تھا کہ وہ میرے سامنے تھی، ہمارے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا، کوئی جانا انجانا دباؤ نہیں تھا، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ اس وقت اس کے وقت کا میں تنہا مالک تھا، گویا وہ اس وقت میرے قبضے میں تھی، سوچ کی حد تک ہی سہی، ایک سرشاری کی کیفیت میں، میں

مبتلا ہو گیا۔ زبان گنگ ہو گئی، سوچنے سمجھنے کی ساری طاقت بس ایک نقطے پر آ کے مرکوز ہو گئی۔ چاندنی میرے سامنے تھی، ہمارے درمیان کوئی نہیں تھا، میں لاشعوری طور پر اپنے آپ کو اس حقیقت کا یقین دلانے کی بار بار کوشش کر رہا تھا، مگر دل تھا کہ ہر بار بند مٹھی سے نکل جاتا۔ اس کا مطلب تھا اتنے لمبے عرصے میں، میں چاندنی کو بھولا نہیں تھا، اپنے آپ کو بھول بیٹھا تھا، اپنے آپ اپنے کو اپنے آپ میں واپس لانا کس قدر کٹھن ہوتا ہے، میں اس وقت اسی کٹھنائی سے دو چار تھا۔ میں اپنے سامنے بیٹھی چاندنی کے اندر اس چاندنی کو ڈھونڈ رہا تھا جو زندگی کے عروج میں مجھ پر چھائی رہی تھی...... وہ عرصہ مجھے برسوں پر نہیں صدیوں پر مشتمل لگتا تھا۔ بہر کیف، دنیاوی تقاضے کے پیش نظر میں نے اپنی زندگی کے اس بڑے عرصے پر ایک نگاہ غلط انداز ڈالی اور چاندنی سے مخاطب ہوا۔

''تمہارا سوال اپنی جگہ پر ہے چاندنی، ایک تو تم پر اچانک نگاہیں اس وقت پڑیں جب میں مایوسی کا بھی ایک بڑا عرصہ گزار چکا تھا، پھر ذہن میں طرح طرح کے سوالوں کے بلبلے اس قدر تیزی سے بن اور ٹوٹ رہے تھے کہ میں اپنی زبان کی پہرے داری کرنے پر مجبور تھا......''

چاندنی مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا، بس وقت کا ایک دھندلا سا سایہ پڑ گیا تھا۔ گو میں نے تو اس وقت اپنے اور اس کے درمیان وقت کے فاصلے کو مٹا دینے کی کوشش کی تھی۔ اتنے دنوں تک میں بھی تو وقت ہی کی مٹھی میں بند رہا تھا، چاندنی نے وقتی طور پر اس قید سے مجھے نجات دلائی دی تھی۔ وہ بولی۔

''ہاں وقت تو بہت آگے نکل گیا۔ میرے تو بچے بھی اپنی زندگیاں شروع کر چکے۔ شوہر البتہ نہیں رہے، ایک حادثے میں وہ اپنی جان گنوا بیٹھے۔ مگر میری بھی زندگی ہے اور آپ کو دیکھ کے یہ احساس ہوا کہ...... آپ نے مجھے نہیں پہچانا تو مجھے شدت سے اس کا احساس ہوا کہ شاید ہمارے درمیان اجنبیت کی ایسی دیوار اٹھ گئی ہے جسے پاٹنا بہت مشکل ہے......''

میں حیرت سے چاندنی کو بولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا کھل کر کبھی نہیں بولتی تھی، البتہ بعض جملوں کو نامکمل چھوڑ دینے کی اس کی عادت ابھی تک برقرار تھی، جس کی نا تکمیلیت میں ہزار معنی پوشیدہ ہوتے اور میں معنی کے سمندر میں ڈوب ڈوب جاتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ زمانے کے طویل سرد و گرم سے پُر سفر نے اسے صرف بولنا نہیں سکھا دیا تھا بلکہ اس میں بہت کچھ سمجھ بھی آ چکی تھی۔ میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ میرے سامنے جو چاندنی تھی، اسے میں لاشعوری طور پر اسی چاندنی کو سمجھنے پر مصر تھا جسے چالیس پینتالیس سال پہلے زندگی کے ایک بے معنی موڑ پر چھوڑا تھا۔ میں بار بار بھول جاتا کہ اب جو چاندنی میرے سامنے ہے وہ ایک مرد کی بیوی، اپنے بچوں کی ماں، ایک باشعور، سنجیدہ، زمانے کو

دیکھی اور پرکھی ہوئی عورت تھی، پھر یہ کہ وہ اس وقت میری ماتحت تھی، یہ تمام حقیقتیں بیچ بیچ میں اپنی جھلک دکھلا کے غائب ہو جاتیں، شاید لاشعوری طور پر میں ان باتوں کو درکنار کر کے اور کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''چاندنی جو باتیں تمہارے ذہن میں آئی تھیں، وہی میرے ذہن میں بھی پیدا ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم اپنی پہچان کی منزلوں سے بہت دور نکل گئے ہیں، تم سے مل کر ایسا لگتا ہے کہ ہماری کھوئی ہوئی پہچان واپس آ گئی۔ بہر کیف، تم سے مل کر، تم سے باتیں کر کے میں اپنے اندر ایک توانائی سی محسوس کر رہا ہوں۔ بھولا ہوا زمانہ یادوں کے دوش پر اچانک سامنے آ جاتا ہے تو چند لمحوں کے لئے ہی سہی، ایسا لگتا ہے ہم اسی زمانے میں واپس پہنچ گئے۔''

چاندنی کے کچھ بولنے سے پہلے اچانک اس کا موبائل بج اٹھا۔ وہ کسی سے بولی...... ''آ رہی ہوں بیٹا' جام میں پھنس گئی تھی اور ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں بیٹھ کر اس کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہی ہوں، تم وہیں رکو، بس میں آتی ہوں......''

کہتے کہتے چاندنی کھڑی ہو گئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔

''چلتی ہوں سر...... میرا پوتا اسکول سے واپس آ گیا ہے، اسے لنچ دینا ہے، میرے پاس ہی رہ کے اپنی پڑھائی کرتا ہے، بیٹے بہو فارن میں ہیں......''

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں شاید کوئی خواب دیکھ رہا تھا جو اس وقت شروع ہوا جب چاندنی جوائن کرنے میرے کمرے میں داخل ہوئی تھی، نیند ٹوٹی تو ایک سنجیدہ، ذمہ دار، سن رسیدہ خاتون مجھے خواب سے جھنجھوڑ کر اپنی راہ لگ گئی۔ چند لمحے تک میں مبہوت سا رہ گیا۔ میرے تصورات کی جو دلکش عمارت میرے اندر تعمیر پانے لگی تھی، وہ اچانک ڈھے گئی۔ کیا یہ وہی چاندنی تھی یا کوئی اور عورت، جو اپنے بال بچوں، گھر بار اور اپنی سماجی اور معاشی ذمہ داریوں سے لدی پھندی ہے۔

ظاہر ہے میں مزید یہاں بیٹھ کر تماشا نہیں بننا چاہتا تھا، مرے مرے قدموں سے میں باہر آیا۔ جام ٹوٹ چکا تھا اور میرا ڈرائیور سیٹ کو پیچھے کر کے بڑے آرام سے سویا ہوا تھا، میں نے آہستہ سے گاڑی پر دستک دی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ میں نے دریافت کیا۔ ''جام کب ٹوٹا......؟''

اس نے جواب دیا۔ ''وہ تو آپ کے اندر جاتے ہی ٹوٹ گیا تھا......''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اندر بیٹھ کر اسے گاڑی اسٹارٹ کرنے کو کہا۔ میں اس سے کیا بتاتا کہ جام تو اب میرے اندر لگا ہے، جو کب ٹوٹے گا، کچھ پتہ نہیں۔

میں نے تو سمجھا، کہانی ختم ہوئی، مگر یہ میری غلط فہمی تھی، کہانی ختم نہیں ہوئی، اس نے بیک وقت کئی رخ اختیار کرلیا۔ چاندنی نے اپنے انجانے پن میں مجھے بھی احساس دلادیا تھا کہ میں بھی عمر کے تلاطم سے بھرے حصے کو پار کر چکا ہوں۔ میں بھی ایک ادھیڑ عمر عورت کا شوہر اور بالغ و باشعور بچوں کا باپ ہوں۔ میں نے چاندنی سے چھٹنے کے بعد آنکھیں بند کر کے جس سفر کا آغاز کیا تھا، وہ اب بظاہر بہ خیر و خوبی اپنی منزل کو پہنچ رہا ہے۔ میں ایک ذمہ دار، عزت دار شخص ہوں، اپنے اندر...... بہت اندر دبے ہوئے تلاطم کو کریدنا اور راکھ میں سے زبردستی چنگاری پیدا کرنے کی کوشش مجھے ہرگز زیب نہیں دے گی۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ زندگی اور حالات نے مجھے جس مقام پر لا کھڑا کیا ہے، اس سے روگردانی ہرگز مناسب نہیں۔ مجھ سے زیادہ باشعور تو چاندنی ہے جس نے اس وقت تک اپنے اوپر قابو رکھا جب تک کہ میں نے دبی ہوئی پرت کو ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

کبھی کبھی میں چاندنی کے بارے میں اپنی سوچ پر سنجیدگی سے غور کرتا تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آجاتی، ہنسی کیا، میں اپنی ہی نگاہوں میں ایک احمق ثابت ہوتا۔ چاندنی سے بظاہر میرا رشتہ سپاٹ سا تھا، اس رشتے میں کوئی اتار چڑھاؤ نہیں تھا، عہد و پیماں یا کسی قسم کے رنگین تاروں کی جھرمٹ نہیں تھی جن سے یہ رشتے باندھے جاتے ہیں۔ بہت سے رشتے دلوں میں جنم لیتے ہیں اور دلوں کے اندر ہی ختم ہوجاتے ہیں، انہیں باہر کی وہ روشنی نہیں ملتی جن سے یہ پھلیں پھولیں۔ چاندنی سے پہلے اور اس کے بعد بھی بے شمار لڑکیوں اور عورتوں سے میرا واسطہ پڑا، کسی نے بھی لمحہ بھر کو رک کر میرا راستہ نہیں روکا تھا، مگر چاندنی......؟ اپنے آپ کو سمجھانے بجھانے کی میری ساری کاوشیں اس وقت دم توڑ دیتیں جب چاندنی سے میرا سامنا ہوجاتا۔ ایسا لگتا کہ میں کوئی خس و خاشاک ہوں جو دریا کے تیز بہاؤ میں بہا جاتا ہوں۔ میں جو قوت ارادی کا پہاڑ سمجھا جاتا تھا، وہی پہاڑ کپاس کی طرح بیٹھتا ہوا محسوس ہوتا۔

چاندنی پر نگاہیں پڑتیں تو بس وہیں پر رک جاتیں۔ میرا جی چاہتا کہ وہ ہر وقت میرے سامنے رہے اور میں اسے یک ٹک تکتا رہوں۔ ظاہر ہے یہ بالکل ممکن نہیں تھا۔ نگاہوں کی بھی اپنی آواز ہوتی ہے، جس کی نگاہیں ہوتی ہیں، وہ سنے نہ سنے، سننے والے تو سن ہی لیتے ہیں۔ چاندنی مجھ سے چھٹی اور میں نے سب کچھ بھلا کے اپنی زندگی پر قانع ہونے کی کوشش کی تو سمجھا کہ اب چاندنی ہمیشہ کے لئے مجھ سے دور ہوگئی اور اب ہم شاید قیامت میں ملیں تو ملیں، مگر اب جو چاندنی میرے سامنے آگئی تو میں حیران و پریشان کہ اتنا لمبا فاصلہ پلک جھپکتے میں کیسے طے ہوگیا۔ صاف بات تو یہ ہے کہ مجھے اس پر یقین ہی نہیں آتا تھا اور بار بار مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میر ہنوز خواب میں ہوں۔ آج کی چاندنی میں

مجھے کل کی چاندنی صاف دکھنے لگی۔ یہ وہی چاندنی تھی جس کو جب میں دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا، اس کے جسم کا پور پور، اس کا پورا وجود پوری شدت کے ساتھ مجھے پکارتا اور میں جیسے تیرتا ہوا بے ساختہ اس کی جانب کھنچ جاتا۔

چاندنی اتنے دنوں کے بعد ملی تو بس اتنا ہوا کہ اس نے مجھے پہچان لیا اور میں تو اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا، وقت، مصلحت اور ذمہ داریوں کی دبیز چادر اس پر ضرور پڑ گئی۔ مگر اس چادر کا وجود اتنا ہی تھا کہ وہ ہوا کے ایک جھونکے میں کہاں سے کہاں اڑ گئی۔ اس کے بعد صرف خلا تھا۔ چاندنی اور میرے درمیان وہ ڈور کبھی اجاگر ہی نہیں ہوئی جس کے سرے کو کبھی پکڑا جا سکتا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان ایک لکشمن ریکھا قائم تھی، ادھر میں تو ادھر وہ تھی۔ شاید ہم کبھی اس لکشمن ریکھا کو پار کرنے کی سوچتے بھی تو یقیناً جل جاتے۔ ہمارے کاندھوں پر صرف ہماری زندگی نہیں لدی تھی بلکہ کچھ ذمہ داریوں کے بوجھ سے ہمارے کندھے جھک گئے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا کہ ہمارے درمیان پہلے کبھی ایسی بات نہیں ہوئی تھی جس کی گمشدہ ڈور کو پکڑنے کے ہم گناہ گار ہوتے۔ میں چاندنی سے کیا چاہتا تھا...... پہلے بھی کیا چاہتا تھا اور اب بھی کیا۔ شاید چاہت کی وہ منزل راستے ہی میں کہیں کھو گئی تھی اور اب جب ہم ملے تو کسی منزل کا دور دور پتہ نہیں تھا۔ ہم ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے اور بس۔

یہ عجیب وغریب گمان مجھے اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا کہ چاندنی اب بھی میرے لئے بہت اہم ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ہم دونوں اپنے اپنے دریاؤں کو پار کر کے کنارے لگنے والے تھے۔ دھارائیں مختلف سمتوں میں بہہ رہی تھیں اور ان کے ملنے کی توقع رکھنا ہرگز ہوش مندی نہیں تھی۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنے والا ان باتوں کا تجزیہ کرے تو پتہ نہیں کیا تاثر لے کے اٹھے۔ ویسی باتیں نہ سنی گئیں نہ دیکھی گئیں۔ وہ تو لاکھ شکر یہ ہے اس دبیز چادر کا جو ہوا کے جھونکے میں اڑنے کے باوجود اپنی جگہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس چادر نے کتنے راز، کتنی جاوبے جا تمناؤں اور کتنی حسرتوں کو چھپا لیا۔

جام میں تو میری گاڑی کئی بار پھنسی اور اس ریستوراں سے بھی کئی بار گزرا، مگر چاندنی کی گاڑی پھر دکھائی نہیں دی۔ وہاں پر کئی بار میں نے اپنی گاڑی کی رفتار دھیمی بھی کرائی، ایک آدھ بار کسی بہانے وہاں ٹھہرا بھی، مگر...... چاندنی کالج میں تو نظر آتی تھی، اور کہیں نہیں اور کالج میں میری گاڑی نہیں، میں خود جام میں پھنسا رہتا۔ اگر کوئی نامعلوم طاقت، جواب ایسی نامعلوم بھی نہیں رہی تھی، قدم قدم پر میری لگام کھینچتی نہیں رہتی تو شاید میں چاندنی کو اپنے کمرے میں طلب بھی کر لیتا، اس سے

باتیں کرنے کے بہانے ڈھونڈتا رہتا، میرے معاملات تو یوں بھی اتفاق پر ٹکے رہتے تھے اور اتفاق کی خصوصیت یہ ہے کہ ہوا، ہوا نہیں ہوا۔ میرے ساتھ اتفاق کا رویہ بہت دوستانہ کبھی نہیں رہا۔ یہ اتفاق ہی تو تھا کہ جب میں چاندنی سے اتنا قریب آ گیا تھا کہ شاید کسی بھی لمحہ اس کا اظہار بھی کر دیتا تو وہ اس وقت ہمیشہ کے لئے مجھ سے چھن گئی۔ اتفاق نے مجھے زندگی کے اس راستے پر ڈال دیا جس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ بھی اتفاق کہ جب ہم کنارے لگنے لگے تو چاندنی پھر سامنے آ گئی، اور یہ بھی اتفاق کہ اس کے آنے نہ آنے نے بظاہر کوئی بڑا فرق پیدا نہیں کیا۔ ہم دونوں ایک ایسے متوازی راستے کے مسافر بنے رہے جو ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں، باتیں بھی کر سکتے ہیں، مگر ایک دوسرے کو چھو نہیں سکتے۔

انجانے پن میں چاندنی نے اپنے وجود سے میری ازدواجی زندگی کو خوش گوار بنا دیا، اسے میں بھول نہیں سکتا۔ اس کے سامنے آنے کے بعد اس احساس میں بہت شدت آ گئی۔ چاندنی کی یک طرفہ قربت نے لاشعوری طور پر مجھے سیدھے راستے کا ایک مسافر بنا دیا۔ میرے ذہن میں ایک مکمل، بھرپور عورت کا خاکہ جب بھی ابھرتا، چاندنی ہی اس پر کھری اترتی تھی۔ کسی اور لڑکی یا عورت کے بارے میں جب بھی میں سوچتا تو اس سوچ میں چاندنی اپنے پورے وجود کے ساتھ کود پڑتی۔ میرے یہ اندرونی احساسات ایسے تھے جن سے میں اندر ہی اندر سرشار ہوتا رہتا، اپنی زبان اور اپنے اظہار کو کبھی میں نے اپنا رازدار نہیں بنایا۔ آج بھی چاندنی سامنے ہوتی تو میں اسی کیفیت کو پانے کی کوشش کرتا، مگر مکمل کامیاب نہیں ہو پاتا۔ کچھ ادھوری سی کیفیت، کچھ اڑے اڑے سے جذبات میرے آس پاس اٹھکھیلیاں کرتے رہتے تھے۔

چاندنی سامنے آ جاتی تو میں اپنے آپ کو جیسے بھول جاتا ہوں، چاندنی کو بھی بھول جاتا ہوں، میں جس چاندنی کو دیکھتا ہوں وہ تو شوہر بچوں والی خاتون ہے، ناتی پوتے والی...... اس کے ذہن و تصور میں تو بس اس کے بال بچے ہی ہوں گے، اسے کچھ اور سوچنے اور سمجھنے کی کہاں فرصت۔ وہ تو محض اتفاق ہے کہ وہ اس کالج میں اپنی نوکری کے ایام پورا کرنے کو آ گئی، یہاں نہ آتی تو کہیں اور چلی جاتی، اور میں پرنسپل نہ ہوتا کوئی اور ہوتا، اس سے کیا فرق پڑ جاتا۔ یہاں اس کا مجھ سے ملنا اس کے منصب کا ایک حصہ ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اسے یوں بھی باہر نکلنے کی کم ہی فرصت ملتی ہوگی۔ میں اس کے اندر اپنی اس چاندنی کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا جس کی تلاش میں، میں لاشعوری طور پر آج بھی سرگرداں ہوں۔ وہ چاندنی اس کے اندر اگر چھپی ہے تو اتنی گہرائی میں کہ اب اس کا سراغ ملنا ناممکن ہے۔ جس سن رسیدہ عورت میں میری چاندنی نے اپنے آپ کو چھپا لیا ہے، اس کو دیکھے سے

تو میرے اندر وہ خاص رگ پھڑک ہی نہیں پاتی جو یوں بھی مرجھا چکی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود میرے اندر کون سی بے چینی اور اضطراب ہے اور میں کیا ڈھونڈ تا ہوں۔ یہ سوال مجھے اپنے آپ سے کرنا چاہئے، اس کا جواب اور کوئی دے بھی نہیں سکتا، اور میرے پاس تو دور دور اس کا جواب نہیں۔ وقتی طور پر اپنے آپ کو سمجھانے سے مجھے کچھ راحت ضرور ملتی ہے۔ چھپی ہوئی چاندنی میرے اس انجانے سفر میں میرے ساتھ تھی جب میں روح سے جسم کے سفر کی طرف گامزن تھا۔ سامنے والی چاندنی کے اندر وہ بجلی نہیں ہے جو کبھی میرے اندر کرنٹ دوڑا دیتی تھی، پھر بھی اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہے وہ بہر حال چاندنی ہی......... جسم سے روح کے سفر کی طرف رواں دواں......

Mob.: 07739838768

افسانہ

فرحت جہاں

بازار

"سیب کیا کلو ہیں؟"

آواز سن کر قادر خان جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ کبھی ڈری آواز سے اس کے کان بخوبی واقف ہیں۔ اس لیے وہ اپنی زبان نہیں ہلانا چاہتا۔ حیثیت آواز کو یا تو بہت اونچا کر دیتی ہے یا بٹھا دیتی ہے۔ قادر خان پھل فروش وکو دن بھر دوکان پر بیٹھے بیٹھے بہت سے تجربے ہوتے رہتے ہیں۔ کون آواز نکالنا جانتا ہے لیکن نکال نہیں پاتا، نگاہ مٹھلی کی جانب اور مٹھی ضرورتوں کے نرغے میں رہتی ہے، کھلنا چاہے بھی تو نہ کھل پائے۔ روزن داری پہ رکھا چھوکرا اس کے ذمہ پھلوں کو دھونا، چمکانا اور ٹوکریوں میں رکھنا شامل ہے۔ اس کو نبھانا خوب آتا ہے۔ جب اس کا مالک نہ بولے تو وہ بولے، وہ جواب دیتا ہے، "130 روپے کلو سیب ہیں۔"

خستگی اور بے چارگی سے واقف چھوکرا ایک نظر سامنے کھڑے شخص پر ڈال کر پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ایسا دن میں کئی مرتبہ ہوتا ہے۔

''سیب کیا کلو ہیں؟''

خریدار کی آواز کی کڑک، جوش، بے باکی، لاپرواہی قادر خان کے کانوں کو فوراً کھڑا کر دیتی ہے اور وہ بڑے ادب سے جواب دیتا ہے۔

''آیئے، آیئے حضور والا، 130 روپے کلو سیب ہیں۔ یہ کشمیری سیب، قندھاری انار، یہ بے موسم دسہری، چوسا، یہ تو صرف آپ جیسے شوقین لوگ ہی خرید سکتے ہیں۔ ایرے غیرے کا کام نہیں حضور، ہیرے کی پہچان جوہری کو ہی ہو سکتی ہے۔ آپ جیسے لوگوں سے ہی ہماری دوکان چلتی ہے۔''

قادر خان کی زبان عاجزی، انکساری میں آنکھیں بچھانے میں اس طرح مصروف ہو جاتی ہے جیسے دانہ چگنے میں پرندہ، حلق حضور والا بولتے بولتے لاکھ خشک ہونے لگے لیکن وہ بتیسی نکالتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہیں آتا۔ یہ وقت اس کے لیے بہت قیمتی ہوتا ہے۔ صرف آپ کے لیے، صرف آپ کے لیے بولتا رہتا ہے، خوشامدی لفظ ہمک ہمک کر آگے بڑھنے میں دیر نہیں کرتے۔ کبھی اسلام علیکم اور کبھی ہاتھ جوڑ جوڑ کر گھگھیاتے ہوئے، نمستے کرنا بزنس کا پہلا اصول مانتا ہے۔

عاجزی سے بات کرنے میں ماہر، لفظوں کو ہتھیار کے طور پر آزمانے میں یکتا گنجا قادر خان خریدار کو اتنا خوش کر دیتا ہے کہ بھاؤ تا کی نوبت ہی نہیں آتی۔ چاپلوسی کے الفاظ اور رویہ کام آ جانے اور کچھ کہے بغیر ایک اندازِ تمکنت سے خریدار مطلوبہ قیمت ادا کر دینا اس کی انا کو بھی کہیں نہ کہیں تسکین ملتی تھی۔

قادر خان کی دکان کے عین سامنے سلامت میاں پھل فروش کی دکان تھی۔ بیچ میں پتلی سی سڑک تھی۔ سڑک کیا تھی بس راہ گیروں کے چلنے کی جگہ تھی۔ سلامت میاں ہر آہٹ پر چونک پڑتے تھے۔ ان کی نگاہ راہ گیروں کے قدموں پر منڈلاتی رہتی۔ کون سا قدم ادھر رُکتا ہے یا اُدھر۔ لیکن 'حضور والا' کی کشش کو قادر خان کی دکان تک لے جانے میں دیر نہ کرتا اور سلامت میاں کی آنکھ حضور والا کے خوشامدی لفظوں کا تماشہ دیکھ کر غصے سے انگارہ ہو جاتیں۔ چیچک زدہ چہرہ، دھنسی آنکھیں اور پھیلی ناک والا چہرہ اور بگڑ جاتا۔ پھر وہ خیال کی نوک پر نیزہ اٹھا کے اور قادر خان کو چھیدنے لگتے۔ خوشامدی، مکار، مطلبی، کم ظرف، لفظوں کا جادوگر جب اس کی زبان سے اتنے خوشامدی میٹھے میٹھے لفظ نکلتے ہیں تو اندر کتنا ڈھیر لگا ہوگا۔ اندر کا باہر پورا تھوڑا ہی نکل آتا ہے۔

اس کو خیال آتا رہتا کہ چچا کے پاس بھی میٹھے میٹھے لفظوں کا خزانہ تھا۔ جس کو وہ دھیرے دھیرے

نکالتے رہتے تھے۔

''بیٹا روءمت! تیرا باپ مر گیا لیکن تیرا چچا تو موجود ہے۔ باپ کی موت کا غم تو ٹھیک ہوتا چلا گیا لیکن چچا کی میٹھی زبان بند ہونے میں ہی نہ آتی تھی اور وہ نمک کا مزہ بھول گیا اور جب نمک کی ڈلی دانتوں کے نیچے آئی تو پستہ آ گیا۔ جگر کا ٹکڑا کہتے کہتے باپ کی ساری جائداد چچا نے ہڑپ لی۔ خنجر سے مارنے کے بجائے لفظوں کے پھولوں سے چچا نے سلامت کو نیم مردہ کر دیا۔ وہ ٹوٹے پھوٹے مضمحل بیٹھے رہتے۔ دیکھ کر یوں لگتا جیسے چراغ جلتے جلتے بجھ گیا ہے۔ اب ان میں بچا ہی کیا تھا، وقت نے لفظوں پر سے اعتبار اٹھالیا۔ اپنے ہونٹ سی لیے لیکن دل کی سوزش پہ قابو نہ پا سکے۔ اگر کوئی خریدار ان کی دوکان کا رخ کر بھی لیتا تو چپ چاپ ترازو اٹھاتے، پھل تولتے، پوتھین میں ڈالتے اور اُس کو پکڑا دیتے۔ کیا مجال جو چاپلوسی کا کوئی لفظ ان کے منہ سے نکل جائے۔ مکھیاں ان کے پھلوں کا رس چوسنے میں مصروف رہتیں اور وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گم سُم بیٹھے نظر آتے۔ چہرے پہ بیزار، آنکھوں میں اداسی، اعصاب میں تشنج، ہونٹوں پہ خاموشی رہتی۔ اگر ہوا کا کوئی خوشگوار جھونکا اُدھر سے گزرتا اور ان کے چہرے کو تھپتھپاتا لیکن وہ بھی اُن کو لُو کا طمانچہ لگتا۔ قادر خان اپنی بکری زیادہ ہونے پر اور سلامت میاں کی بکری کم ہونے کی وجہ بھی خوب جانتا تھا۔ اور جب جانتا تھا تو اور زیادہ بولتا تھا۔ زبان پر سان پڑھاتے جاتا، الفاظ کی پھلجھڑیاں ایسے ایسے کرتب دکھاتیں کہ ان کی ترازو میں پھل برابر تلتے رہتے۔ ایسے موقعوں پر سلامت میاں کی جھکی گردن کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ان کی اوپر دہرا حملہ ہو رہا ہے، ایک تو پھل فروخت نہ ہونے کا اور دوسرا قادر خان کا تمسخرانہ انداز...

صندوقچی میں پیسہ ڈالتے وقت قادر خان کی آنکھ فاتحانہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے سے باز نہ آتی... لے بیٹا اور ہونٹوں سے گوندھ چپکائے بیٹھا رہ، اینٹھا رہ، کچھ مت بول... بڑا صاحب بہادر ہے نہ، جو خوشامد نہیں کرے گا۔ ہاتھ خالی رہیں گے تیرے سمجھا... بس قہقہہ مارتے مارتے وہ رہ جاتا۔

سلامت میاں کی نگاہ جاسوسی میں لگی رہتی۔ سڑک پر موٹر گاڑیاں دوڑتی پھرتیں۔ چاروں طرف شور و غل ہوتا لیکن ان کی آنکھ کے کینوس پر قادر خاں ہوتا۔ اپنے گھر میں بھی وہ ان کی ہی پاتے...

رات دکان میں تالہ ڈال کنجی واسکٹ کی جیب میں رکھ کر گھر کی طرف روانہ ہوتے تو الجھنوں کی رفوگری راستہ بھر کرنے کی کوشش میں لگے رہتے کہ گھر میں خوشی کا منہ لے کر داخل ہوں۔ لیکن رفوگری تو اس دھاتے سے کی جاتی ہے جو مضبوط اور ثابت ہو، ان کی جیب میں تو چھوٹے چھوٹے سکوں کے کچے دھاگے پڑے رہتے تھے۔ بڑی آہستگی سے گھر کے دروازے کے پٹ کھولتے کہ اہلِ خانہ کو خبر نہ ہو۔ لیکن کوئی نہ کوئی منہ پھاڑ کے بول پڑتا، ''دودھ والا کل سے دودھ نہیں دے گا۔

مال مکان کا لڑکا کرایے کے لیے کئی چکر لگا چکا ہے۔"

ایک دن نجم النساء دیگچی سے سالن نکالتے میں بولیں، "کل میں جمیلہ خالہ کے گھر میلاد شریف میں گئی تھی تو قادر خاں کی بیوی کے تو رنگ ہی نرالے تھے۔ بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھی۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کر رہی تھی۔ سونے کے بندے کانوں میں ہل رہے تھے، کیا آج کل اس کی دوکان خوب چل رہی ہے حنیفہ کے ابا؟"

وہ تو اور بولتیں کہ حنفیہ بیچ میں بول پڑی، "ابا اپنی دوکان بھی تو اسی جگہ ہے... پھر آخر... اپنی دوکان؟"

گھبراہٹ میں لفظ آگے پیچھے ہونے لگے۔ جواب سننے کے لیے گھر کے دوسرے افراد نے بھی اپنے کان کھڑے کر لیے۔

تیوری پر بل ڈال کر سلامت میاں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، چلا کر بولے، "خاموش ہو جاؤ... سب اچھے ہیں... بس میں ہی بے جگہ پڑا پتھر ہوں۔"

ایک ہی سانس میں پانی کا گلاس خالی کر دیا۔ اس وقت تو معاملہ رفع دفع ہو جاتا لیکن دوسرے دن پھر کوئی نہ کوئی سوال کی گولی ان پر داغ دیتا۔ جواب دینے والی سلامت میاں کی زبان پناہ کی جگہ نہ ملنے کے سبب کہیں نہ کہیں زخمی ہو ہی جاتی اور گھر والے ان کے چہرے پر غصے کی تلملاہٹ ابھرتی دیکھ کر اپنی اپنی نامراد سوچوں کی گپھا میں چلے جاتے اور وہ اس آگ میں گرم گرم آنسو چپکے چپکے پیتے رہتے۔ ایسے موقعوں پر خوشامدی اور چاپلوسی کے لفظ ان سے لڑنے بھڑنے کے لیے کمربستہ ہو جاتے۔ "ہوش میں آجا سلامت، قادر کو دیکھ اس کی زبان تعریف کرنے میں پھرکنی بن جاتی ہے، پیروں کو چھونے میں نہیں جھجکتی۔ تیری عقل کیا گدی میں چلی گئی ہے۔ اتنا نہیں سمجھتی کہ تعریف آدمی کو اوپر لے جاتی ہے اور خود کو طرم خان سمجھنے لگتا ہے اور اپنا سب کچھ دینے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ بیوقوف تو بھی عقل کے ناخن بڑھا۔ ہر بڑے آدمی کی تعریف کے گن گا۔ سفید میں سیاہ ملا اور سیاہ میں سفید۔ اپنی سوچ کی اگر مگر کو دفع کر۔"

نہیں... نہیں... میرے کان مت کھاؤ۔ کیوں تعریف کروں، بولو کیوں تعریف کروں۔ کیوں جھوٹ بولوں... ہر ایک کو دھوکہ دے کر پھل فروخت کروں۔ کوئی اپنی زبان مجھ پر بھی خرچ کرتا ہے؟ کبھی پوچھتا ہے کہ سلامت پھل فروش تیرا چہرہ اتنا بگڑا کیوں رہتا ہے؟ کس عارضے نے تجھے بتلا کر دکھا ہے؟ کون سی دیمک تجھے کھائے جا رہی ہے؟"

گھر میں کھانے والے کتنے افراد ہیں، سوچو تو ذرا... نو لوگوں کا ٹبر بوڑھی ماں، ان کو ہر وقت بھوک

ہی لگتی رہتی ہے، کس کس کا کہوں۔ پیر ڈھانکو تو ہاتھ کھل جاتا ہے۔ ہاتھ ڈھانکو تو پیر کھل جاتا ہے۔ زخمی سوچوں کے کرب کا عکس ان کے چہرے پہ جھلکنے لگتا، لیکن ذہنی رویہ کسی طرح بدلنے پر راضی نہ ہوتا۔ دیوار سے لہرائیں ٹکراتی رہتیں۔ لیکن شگاف نہ کر پاتیں۔ خواب پورے نہ ہوتے تھے۔ اس لیے آنکھیں خوابوں سے دور دور رہنے لگیں۔ رات بھی چین سے نہ گزرتی۔ کھلی آنکھوں سے چھت کو تکتے رہتے۔ بستر پر بیوی کی سوکھی ہڈیوں پر بھی ہاتھ نہ رکھ پاتے۔ کروٹیں بدلتے بدلتے سحر ہوجاتی۔ ان کے دبلے پتلے جسم کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ اندر وہ آگ روشن نہیں ہوئی ہے جو وقت کے تقاضوں کے دیکھا دیکھی غم کی دھندلاہٹ کو کم کرنے میں مدد کردے۔ جوان کے وجود پر چھائی رہتی ہے۔

پھر وہ کیا کریں؟

ایک دن ان کے کان کے پاس بم پھٹا۔

''ابا... ابا''

ان کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ بیڑی منہ سے نکال کر دور پھینکی اور بے صبری سے پوچھا، ''اتنی گھبراہٹ میں کیا کہنا چاہتا ہے۔ بول؟''

''آج جب آپ مغرب کی نماز پڑھنے مسجد گئے تھے تو قادر خان سے نیتا جی چپکے چپکے باتیں کررہے تھے۔''

''کون نیتا؟''

''ارے وہی نیتا۔ وہی پنڈت جی جس کی پکچر اکثر اخباروں میں آتی رہتی ہیں۔ پچھلے بدھ کو منگلوارہ میں تقریر کررہے تھے۔ اس میں بہت بھیڑ تھی ابا۔ جب وہ بولتے ہیں اتنے ہی لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔''

وہ تو دونوں روز ہی بری گھٹ گھٹ کر باتیں کرتے ہیں۔ قادر خاں تو ان کے سامنے گھگھیاتا ہی رہ جاتا ہے۔''

''تو سنو تو سہی ابا'' وہ قریب کھسک آیا۔

''نیتا جی قادر خاں سے کہہ رہے تھے کہ تم کارپوریشن کے الیکشن میں کھڑے ہوجاؤ ہماری پارٹی کی طرف سے۔''

''بھونچکا ہوکر قادر خاں بولا، ''حضور والا یہ آپ کیہ کہہ رہے ہیں؟''

''ہم بلکل سچ کہہ رہے ہیں۔ ہماری بُدھی کی جو آنکھ ہے نا، وہ تم میں بہت سی باتیں دیکھ رہی ہے۔ بولنے میں تم ماہر، خوشامد کا پانسہ پھینکنے میں تم سب سے آگے، شبدوں کا جادو تمھاری زبان پر،

قادر خاں آج کل صرف شبدوں سے کام چلتا ہے۔ شبدوں کے جال میں بڑی مچھلی آسانی سے پھنس جاتی ہے۔''

''ابا، اس وقت قادر خاں کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ ان کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔ آنکھیں پنڈت جی کے چہرے پر کنکھجورے کے پنجوں کی طرح گڑ گئی تھیں۔ پھر انھوں نے پوچھا، ہمیں ووٹ کون دے گا؟''

''ہماری پارٹی تم کو جتوائے گی۔ تمھارا نام ہی کافی ہے، اسلامی نام کافی ہوتا ہے۔''

''لیکن آپ کی پارٹی نے تو بابری مسجد گرائی تھی۔ ہم بھلا آپ کی پارٹی میں... کہتے کہتے وہ رکنے لگے۔''

''مندر توڑ کے مسجد بنی۔ مسجد توڑ کے مندر بنے گا۔ تو بھیا معاملہ برابر ہو گیا، تم خود سوچو قادر خاں۔''

''ارے رفیق یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟''

''ہاں پروردگار کی قسم ابا۔ ہم آپ سے جھوٹ بولیں گے؟''

سلامت میاں کا چہرہ غصّے سے سرخ ہو گیا۔ انھوں نے حقارت سے زمین پر تھوکا۔ خوشامد کر کے اور تعریفوں کا جادو زبان پر چلا کے اب وہ نیتا بنے گا۔ غصّے اور نفرت کے پھڑ پھڑاتے پرندے نے اندر ہی اندر ان کو کھرچنا شروع کر دیا۔

جو بات سرگوشیوں میں ہو رہی تھی۔ اب وہ سر پہ چڑھ کر بولنے لگی۔

''قادر خاں الیکشن لڑ رہا ہے۔''

''تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ سچ بتا یار۔''

''تیری جان کی قسم۔ میں جھوٹ بول کر کیا میں تجھ سے اپنی چمڑی ادھڑوا نگا۔''

پان کی دوکان پہ بے فکر لونڈے باتیں کر رہے تھے۔

الیکشن کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ دیواروں پر جب قادر خاں اپنا نام دیکھتا، پوسٹروں میں اپنی تصویر چھپی دیکھتا تو پھولا نہ سماتا۔ سیدھا ڈھیلا ڈھالا پاجامہ۔ اونچی کالر کا کرتہ پہنے بالوں میں خوب تیل لگا کر بار بار زردہ کا پان منہ میں دبائے وہ الیکشن کی میٹنگوں میں جانے لگا۔ اب وہ اسپ برق رفتار پر سوار ہو چکا تھا۔ خیالوں کا چابک اس کے ہاتھ میں تھا ہی۔ جہاں چاہتا رفتار اور تیز کر دیتا۔ خوشامدی اس کے آگے پیچھے گھومنے لگے تھے اور وہ لیڈری کی کرسی پر بیٹھا حکم صادر کر رہا تھا۔ احساسِ برتری کی آنکھ نت نئے تماشے دیکھنے میں مصروف تھی۔

کیا واقعی میں وہی قادر خاں ہوں جو الف کے نام بھالا نہیں جانتا۔ بلکل اجڈ اور گنوار ہے۔ جس کے گھر میں ایک دوسرے کو ماں بہن کی گالیاں دی جاتی ہیں۔ اللہ تیری شان۔ وہ کلمہ پڑھنے لگتا۔ لا اللہ اللہ....

تماشائیوں کے لیے تماشہ دیکھنے کا وقت تو اس وقت آیا۔ جب دونوں کی گنتی ختم ہوئی اور قادر خاں کے جیتنے کا اعلان ہوا۔ قادر خاں زندہ باد، دیش کا نیتا کیسا ہو... قادر خاں جیسا ہو..... گلے گلے تک ہار پہنے جیپ میں کھڑا قادر خاں چاروں طرف ہاتھ جوڑ جوڑ کر جھک جھک کر نمستے کر رہا تھا۔ یار لوگوں کے چہرے قابلِ دید تھے۔ ایک بڑا جلوس راہ گیروں کا راستہ روکے ہوا تھا۔ رفیق بھیڑ میں ایسا پھنسا کہ کسی طرح نہیں نکل پا رہا تھا۔ حواس باختہ ادھر سے اُدھر گرتا پڑتا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آخر دھکے کھاتا ہانپتا کانپتا دکان تک پہنچا۔ بھولی سانس میں آواز دی، ''ابا''۔

پھر چپ ہو گیا۔

سلامت میاں نے اس کی طرف بھونچکا ہو کر دیکھا۔ وہ اس کی خاموشی توڑنے سے ڈر رہے تھے اگر وہ بولا تو ایک سنسناتی گولی ان کے لگے گی اور وہ مر جائیں گے۔ کیونکہ نجم النساء کی پسلیوں کے نیچے اٹھنے والے درد اور خون کی قے ان کی آنکھیں دیکھتی رہتی تھیں۔ گھٹی سانسیں جب پھیپھڑوں سے باہر نکلتیں تو وہ مرمر کر جی اٹھتے تھے۔ بیٹے کے منہ پر ہوائیاں اور ہونٹوں کو خاموش دیکھ کر نا قابل برداشت چبھن کلیجے میں محسوس کرنے لگے۔

''ابا فوراً گھر چلو.....اماں...'' وہ بولتے بولتے رک گیا۔

سلامت میاں کے دل پر ایک وزنی کلہاڑی بڑی اور وہ درد بھری آواز میں چیخے، ''تو چل، میں آرہا ہوں۔''

''انھوں نے اٹھنا چاہا، ایک دبی ہوئی کراہ ان کے حلق سے نکلی۔

''میری جان تو مر نہ جانا۔''

دہشت نے آنکھوں میں اندھیرا ابھر دیا۔ سوچ کا لمحہ جو لرزا تو آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔ وہ بے تحاشا اپنے گھر کی طرف دوڑے اور اس تیزی سے دوڑے جیسے نجم النساء کو اپنی سانس دیئے جا رہے ہوں۔ قب اس کے کہ اس کی سانس کا سلسلہ ٹوٹے، دبی کراہ حلق سے نکلی۔ ''یا اللہ کیا کروں؟''

سڑک سے گزر کے اندھی گلی میں داخل ہوئے۔ چھلانگ لگا کر گھر کی چوکھٹ پار کی گھر کے لوگوں کے چہروں پہ وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے حنیفہ کے حلق سے غیر واضح آواز نکلی،

''اماں بے ہوش ہے۔''

حالات کو سمجھنے میں ان کو دیر نہ لگی۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ''دوا پلائی تھی۔''

''دوا ہے کہاں؟ ابا دوا کی شیشی تو کب سے خالی پڑی ہے۔'' بغیر ڈھکن کی شیشی زمین پر گھڑونچی کے نیچے پڑی تھی۔

سلامت میاں تیزی سے آگے بڑھے۔ جھک کر نجم النساء کو اٹھانے لگے۔ ہاتھ نبض پر گیا، سانس کی آمد ورفت بند ہو چکی تھی۔ وہ غش کھا کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑے۔

گھر میں کہرام مچ گیا۔ غم کے بھالے سے گھر والے زخمی ہو چکے تھے۔

کتنی ہی بار نجم النساء کو چونکنے کے بعد پورا گھر خاموش ہو گیا۔ رہا نے کھری حنیفہ نہ رونے میں تھی نہ خاموش رہنے میں۔ گم ہو جانے والا احساس باقی رہ گیا۔

اچانک زندگی کی موت سے مڈبھیڑ ہونے پر سوچ بھی اسی طرح مرنے لگتی ہے۔

''اماں تیرے بالوں میں تیل ڈال دوں؟'' وہ چونکنے کو ہی تھی کہ آواز آئی، ''آدمی اندر آرہے ہیں میت اٹھانے۔''

پھر وہی آہ و فغاں کا شور گھر میں برپا ہونے لگا۔ میت کے اردگرد سب جامع ہو گئے۔ اشک بار آنکھوں سے آخری دیدار کیا کہ نگاہ اب کبھی اس صورت کو نہ دیکھ پائے گی۔ ایک ایک کر کے غمگسار اور رشتہ دار رخصت ہوئے۔ گھٹنوں میں منہ ڈالے سلامت میاں گھر کے ایک کونے میں بیٹھے رہتے لیکن دکان کھلنے کے خیال کو کب تک اپنے سے الگ رکھتے۔ دوکان کھلنا ہی تھی۔

خود کو گھسیٹ کر دوکان تک لے گئے۔ ابھی سلامت میاں کے ہاتھوں دکان کے پٹ پوری طرح کھل بھی نہ پائے تھے ایک قدم اندر رکھا تھا اور ایکبا ہر کہ اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز نے انھیں جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

''اپنی زبان کاٹ کر دوسری زبان لگا سلامت۔''

ان کی جھکی نظر جو اٹھی تو ایک خریدار آگے بڑھنے کو ہی تھا۔

''آیئے حضور والا... آیئے جناب والا... جناب یہ دیکھیے سیب، قندھاری انار، بے موسم آم... انگور بہت میٹھے اور تازہ ہیں۔ یہ صرف آپ جیسے بڑے لوگ ہی خرید سکتے ہیں۔ صرف آپ جیسے حضور... صرف آپ... وہ بار بار اپنے اندر دہرانے لگے۔

سوچ اور زبان کے تال میل میں دیر جو ہوئی اتنے میں خریدار آگے بڑھ چکا تھا۔

محسن خان

کشتی پر اچھلتی ہوئی مچھلیاں

بابا جان ایک ہاتھ سرہانے رکھے، پیروں کو پیٹ کی جانب سمیٹے اس طرح سو رہے تھے جیسے بچہ ماں کے پیٹ میں نشونما پا رہا ہو۔ ان کے سونے کا کوئی زاویہ مقرر نہیں ہے۔ کبھی کسی کروٹ سو جاتے ہیں کبھی تکیہ کی ٹیک لگا کے بیٹھے بیٹھے سو جاتے ہیں۔ اس طرح سوتے وقت اکثر ان کی گردن ٹیڑھی ہو جاتی ہے اور ان کے حلق سے نہایت کرخت اور وحشت ناک خراٹے نکلتے ہیں۔ کبھی ہاتھ پاؤں

سیدھے کر کے اس طرح سو جاتے ہیں جیسے کوئی جنازہ پڑا ہو۔ دیکھ کر دل میں ہول اٹھنے لگتی ہے وہ گہری نیند نہیں سوتے ان کی نیند چڑیا کی نیند جیسی ہوتی ہے۔ اک ذرا آہٹ ہوئی نہیں کہ پٹ سے آنکھ کھل گئی۔ کہتے ہیں جوانی میں خوب سو لئے سب نیند ختم ہو گئی۔ دل کو ذرا قرار آتا ہے تو بستر پر رکھی ہوئی دواؤں اور چورنوں کی پڑیوں اور پوٹلیوں کو اس طرح ٹٹول کر دیکھتے ہیں جیسے کوئی ایسی چیز تلاش کر رہے ہوں جو ان کے دل کو قرار بخش دے گی۔ مگر ان پڑیوں اور پوٹلیوں میں ان کے دل کا قرار کہاں ان کے دل کا قرار تو ہمارے آبائی مکان کے ملبے میں دب کر رہ گیا ہے۔

بابا جان کی دنیاں اب اپنے کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ آنکھوں پر ہاتھ کی چھتری لگا کر دروازے سے ڈائننگ روم کی جانب اور باہر کی جانب کھلنے والی کھڑکی سے اتنا آسماں دیکھ لیا کرتے ہیں جو اپنی وسعت میں کھڑکی کے فریم تک محدود ہے۔ ایک دن کہہ رہے تھے۔

بینائی اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے اور پتنگیں بھی دکھائی نہیں دیتیں۔ کسی زمانے میں بابا جان کو کبوتر اور پتنگیں اڑانے کا شوق تھا۔ ادھر کچھ دن پہلے تک تاریخی اور مذہبی کتابیں بڑی آمادگی سے پڑھتے تھے نسیم حجازی ان کا محبوب ناول نگار اور صلاح الدین ایوبی آئیڈیل کردار تھا مگر اب ان کا دل کتابوں سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ ویسے بھی کمزور بینائی نے لاچار کر دیا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ اب بابا جان نمازیں اور وظیفے بھی پہلے کی طرح خشوع وخضوع کے ساتھ نہیں پڑھتے۔ نمازیں اور وظیفہ پڑھتے وقت ان پر غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ ہاں صبح کے وقت کچھ تازہ دم دکھائی دیتے ہیں۔ تکیہ کی ٹیک لگا کے قدرے اطمنان کے ساتھ تسبیح پڑھتے ہیں اور اسکول کے لئے تیاریاں اور چہلیں کرتے ہوئے بچوں کو شفقت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں۔ بچوں کے اسکول جانے کے بعد جب سناٹا ہو جاتا ہے تو وہ دل بہلانے کے لئے آسمان کی جانب دیکھنے لگتے ہیں۔ کھڑکی سے دکھائی دینے والا آسمان کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا گویا ان کی زندگی کا ایک خوش رنگ حصہ ہے۔ جب بابا جان کی نگاہ تیز تھی تو وہ کھڑکی سے روشنی کی طرف دیکھ کر اور سورج کے قیام کا اندازہ لگا کر صحیح وقت بتا دیا کرتے تھے۔ مگر اب نہیں بتا پاتے۔ ساجدہ اور بچوں سے گھڑی گھڑی وقت پوچھا کرتے ہیں۔ ایک دن ساجدہ نے کہا۔ اذان کی آواز تو آ ہی جاتی ہے تو پھر بابا جان ذرا ذرا دیر کے بعد وقت کیوں پوچھتے رہتے ہیں۔ میں نے ہنس کر کہا۔ وقت ہی تو ہے جو انسان کو اس کے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔

اس وقت بابا جان تکیہ کی ٹیک لگائے اور گردن نیوڑھائے بڑے بے تکے ڈھنگ سے سو رہے

تھے۔ ان کا منہ مضحکہ خیز انداز میں کھلا ہوا تھا اور کسی ذبح شدہ جانور کے حلق سے نکلنے والی آوازوں کی طرح وحشت ناک خراٹے نکل رہے تھے۔ یہ مناسب وقت نہیں تھا۔ بکس کھینچنے سے بابا جان کی نیند ٹوٹ سکتی تھی۔

جگا دیجئے، ویسے بھی وہ بے چینی کی نیند سو رہے ہیں۔ ساجدہ نے کہا۔ میں نے آہستہ سے بابا جان کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اس سے پہلے کہ انھیں آواز دیتا انھوں نے گھبرا کے آنکھیں کھولیں اور کھنکارتے ہوئے تشویشناک لہجے میں پوچھا... کیابات ہے۔

بکس کی چابی کہاں ہے۔ میں نے پوچھا۔ بابا جان نے بلا تامل چابی تکیہ کے نیچے سے نکال کر میری جانب بڑھادی۔ تعجب ہوا کہ بابا جان نے چابی مانگے جانے پر کوئی استفسار نہیں کیا۔ بکس سے بابا جان کی جذباتی وابستگی تھی۔ بکس کی چابی ہمیشہ بابا جان کے تکئے کے نیچے رہتی تھی اور وہ بکس کھولنے کی کسی کو اجازت نہیں دیتے تھے۔ ساجدہ اکثر کہتی ... بابا جان کے بکس میں وصیت یا کوئی قیمتی چیز رکھی ہے جو ہمارے بچوں کے کام آسکتی ہے۔ حالانکہ بابا جان کے نام نہ تو کوئی جائداد تھی اور نہ زندگی میں اتنے پیسے کمائے تھے کہ وہ ہمارے یا ہمارے بچوں کے مستقبل کے لئے کوئی قیمتی چیز خرید پاتے۔ سرکاری اسکول کے پرائمری سیکشن میں استاد کے عہدے پر فائز رہنے کے بعد معمولی پینشن مقرر ہوئی تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ بابا جان نے بڑے جتن کے بعد ایک چھوٹا سا مکان بنا کر ہمارے سروں پر سائے کا انتظام کر دیا تھا۔

بابا جان کے بکس سے جو سامان برامد ہوا اس میں پرانے سکوں کی پوٹلی، کچھ مذہبی اور تاریخی کتابیں، کرم خوردہ ڈائری کے کچھ اوراق جس میں گھریلوں ٹوٹکے اور بے ربط تحریر میں لکھے گئے ان کی زندگی کے حالات و واقعات تھے۔ کچھ نسخے ایکسرے، ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانے ایک زنگ آلود اور کرم خوردہ شجرہ۔ چند تصویریں اور خطوط کے دھندلے اقتباسات موجود تھے۔ سکے محفوظ تھے مگر سکوں کی پوٹلی اور دوسری چیزوں کو دیمک نے اس طرح چاٹا تھا کہ وہ ماضی کا مرثیہ بن کر رہ گئی تھیں۔ بکس سے جو چیزیں برامد ہوئی تھیں وہ میں نے لڑکپن میں دیکھیں تھیں۔ ایک تصویر دادا جان کے زمانے کی تھی اس میں دادا جان مولانا محمد علی، شوکت علی اور بعض دوسری سرکردہ سیاسی شخصیات کے ساتھ کرسیوں پر نہایت تدبر کے ساتھ بیٹھے تھے بابا جان، چچا جان اور محلے کے دوسرے بچے پھندنے دار ٹوپیاں لگائے اور ہاتھوں میں خلافت پارٹی کے پرچم تھامے زمین پر پالتھیاں مارے بیٹھے تھے۔ تصویر اپنے سیدھے رخ سے بکس کی تہ میں چپک کر زنگ آلود اور اس قدر دھندلی ہوگئی تھی کہ چہروں کے نقش ونگار باقی نہیں رہے تھے۔ یہ سمجھ پانا بھی مشکل تھا کی ان کے

بدن پہ کون سے لباس تھے۔ مسخ چہرے اور بریدہ لباس حنوط شدہ لاشوں کا تاثر پیش کر رہے تھے۔
بابا جان کے بکس سے برامد ہونے والی چیزیں غیر دلچسپ اور بیکار تھیں ہاں ان کی ڈائری میں محفوظ رہ جانے والے چند اوراق اور چچا جان کے خطوط پڑھے جا سکتے تھے۔ گو کہ ڈائری اور خطوط کے اکثر اوراق دیمک کی نذر ہو چکے تھے۔ ایک لفافے کی پیشانی پر جناح کی تصویر دھندلے نقوش کے ساتھ محفوظ رہ گئی تھی حالانکہ دیمک نے ان کے چہرے کو چاٹ کر داغ دار کر دیا تھا اور ان کی کیپ کی جگہ ایک خلاء پیدا ہو گیا تھا۔ لفافے سے برامد ہونے والے خطوط کے چند اقتباسات ہی محفوظ رہ گئے تھے۔ ایک اقتباس کچھ اس طرح تھا۔
بے خبری کے اس طویل عرصے میں کیسے کیسے واقعات و سانحات رونما ہوئے۔ بابا جان اور چچا جان چلے گئے اور ہم ان کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ افسوس صد افسوس۔ اب ہمارا کوئی بزرگ باقی نہیں رہا اس خبر نے اور بھی ملول کر دیا کہ اب ہمارا مکان بھی باقی نہیں رہا۔ شاید اب تم نے اس مقام پر پختہ مکان بنا لیا ہوگا۔ اپنے اس کچے مکان کے نقش و نگار اور وہ طاق میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ جس میں اماں جان چراغ رکھا کرتی تھیں مرکزی جگہ پر بنے اس طاق میں رکھا ہوا چراغ سارے گھر کو روشن کر دیا کرتا تھا افسوس اب ہم اس مکان کو خواب اور تصور میں ہی دیکھ سکیں گے یہ جان کر بہت صدمہ پہنچا کہ سجاد مکان کا قضیہ لے کر عدالت چلے گئے ہیں۔ یہاں آنے کے بعد میں قانونی طور پر اپنے حق سے محروم ہو گیا اب اس مکان پر تمہارا اور سجاد کا ہی مالکانہ حق ہے تم دونوں بھائی بیٹھ کر سہولت کے ساتھ مفاہمت کا راستہ نکال سکتے ہو آپسی اختلافات اور مقدمے بازیاں نہ صرف باعث شرمندگی ہوتی ہیں بلکہ خاندانی ساکھ کو نقصان بھی پہنچاتی ہیں۔ دادا جان کے اپنے بھائی کے ساتھ اختلافات کیسے عبرت ناک انجام کو پہنچے تھے۔ بہر حال میں عملی طور پے کچھ نہیں کر سکتا خطوط کے ذریعے نیک مشورے ہی دے سکتا ہوں۔ امید ہے تم نے بابا جان اور اماں جان کی قبروں کی مرمت کرا دی ہوگی اور ان پر دوبارہ کتبے لگا دیے ہوں گے۔
اس کے بعد کے اقتباسات دیمک نے چاٹ لیے تھے۔ دوسرے صفحہ پر یہ تحریر باقی رہ گئی تھی۔
اب زندگی میں یہی اک آرزو رہ گئی ہے کہ مرنے کے بعد اپنے آبائی قبرستان میں اماں جان اور بابا جان کے پہلو میں دفنا یا جاؤں۔ یہاں کے حالات پہ کیا تبصرہ کروں ہماری کیفیت تو اس مسافر کی سی ہو گئی ہے جو کسی جزیرے پر بیٹھ کر غیبی مدد کا انتظار کر رہا ہو۔ حال ہی میں تقسیم سے متعلق مولانا آزاد کی بصیرت افروز تقریر دوبارہ سنی۔ مولانا بھی کیسے صادق اور دور اندیش آدمی تھے۔ آج مسلمانوں کو ایسے ہی قائد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد کے اقتباسات ضائع ہو چکے تھے۔

دوسرا خط غالباً میرے چچا زاد بھائی خالد کا تھا۔ جس کے ابتدائی اقتباسات ضائع ہو چکے تھے ایک اقتباس کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی۔

بابا جان کا مزاج بچوں کا سا ہو گیا ہے بچوں کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلتے ہیں ان کے کھلونے چھین لیتے ہیں۔ کوئی بات مزاج کے خلاف ہو جائے تو بچوں کی طرح رونے لگتے ہیں۔ سائرہ کو اماں جان اور مجھے ابا جان کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کو اپنے ہندو دوستوں کے ناموں سے پکارتے ہیں۔ یہاں کے محلوں کو وہاں کے محلوں کے نام دے رکھے ہیں ایک دن میرے ساتھ صدر بازار گئے تو وہاں کی عمارتوں کو دیکھ کر کہہ رہے تھے لکھنؤ کتنا بدل گیا ہے۔

ڈاکٹروں نے دوائیں تو دی ہیں مگر ان کا کہنا ہے کہ انہیں کوئی ایسی بیماری ہو گئی ہے جس کا علاج ممکن نہیں۔

میں نے اس شجرے کو کھولنے کی کوشش کی جو چار تہوں میں لپیٹ کر نہایت احتیاط کے ساتھ رکھا گیا تھا شجرہ خستہ اور بریدہ ہو چکا تھا۔ جب میں نے اس کی تہیں کھولنے کی کوشش کی تو یہ چار ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا۔ میں نے ہر ٹکڑے کو آنکھوں کے قریب کر کے نہایت انہماک سے پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ سمجھ نہیں آیا۔ سب نام معہ حسب نسب معدوم ہو چکے تھے اور اب اسے خورد بین سے بھی پڑھا جا سکنا ممکن نہیں تھا۔

جو چیزیں میں نے بکس سے نکالی تھیں دوبارہ بکس میں رکھ دیں۔ بکس کو مقفل کر کے چابی بابا جان کی طرف بڑھائی تو بابا جان نے بے آب آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ کیا ڈھونڈ رہے ہو۔

میں نے بابا جان کو موجودہ صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ایسے دستاویز کی ضرورت ہے جس سے ثابت ہو سکے کہ ہم ہندوستان کے باشندے ہیں۔

کیا ہمارے شجرے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ بابا جان نے بڑی معصومیت سے کہا اور ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے کسی سراب کی جانب دیکھ رہے ہوں۔

سامنے کے کمرے میں ساجدہ بچوں کے ساتھ موبائل پر ڈیٹینشن کیمپ سے متعلق خفیہ کیمرے سے بنائی گئی دستاویزی فلم دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے پاس گیا اور اس کے ہاتھ سے موبائل لے کر فلم ڈیلیٹ کر دی۔

■■ Mob.:9335453034

گوشہ فہمیدہ ریاض۔ نظمیں

فہمیدہ ریاض ۱۹۴۶ء میں میرٹھ، ہندوستان میں پیدا ہوئیں اور عمر کے اولین برس حیدر آباد، سندھ میں گزارے۔ فہمیدہ ریاض نے پاکستان میں جمہوریت کے لیے عملی جدوجہد کی تھی۔ تانیثیت اور روشن خیالی کا ہم اُنھیں بنیادی حوالہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق کے عہد میں اُن پر دس مقدمے کیے گئے جس کے بعد انھیں سیاسی جلاوطنی کے سات برس ہندوستان میں بھی گزارنے پڑے تھے۔ ان کا شعری مجموعہ 'اپنا جرم ثابت ہے' جنرل ضیاء الحق کے ظلم وستم کو بیان کرتا ہے۔ ۲۲ سال کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ منظرِ عام پر آیا۔ 15 ر ادبی کتابوں کی مصنفہ کی پوری زندگی تنازعات سے گھری رہی، جب ان کا مجموعہ 'بدن دریدہ' منظر عام پر آیا تو ان پر شہوت انگیز اور حساس الفاظ استعمال کرنے کا الزام لگایا گیا۔

۲۱ر نومبر ۲۰۱۸ کو اُنھوں نے لاہور میں وفات پائی۔ (ادارہ)

☆

کھڑکی میں چاند (آخری نظم)

میں جس کمرے میں رہتی ہوں
اس کمرے میں ایک کھڑکی ہے
گر رات کو میری آنکھ کھلے
میں مُڑ کر اس کو تکتی ہوں
تب مجھے دکھائی پڑتا ہے
کھڑکی میں چاند چمکتا ہے
میں ہولے سے مُسکاتی ہوں
اور مجھ کو ایسا لگتا ہے
وہ چاند بھی جیسے مسکایا
پھر موند کے اپنی آنکھوں کو
ہولے ہولے سو جاتی ہوں

تب مجھے خیال یہ آتا ہے
میں نہیں اکیلی دنیا میں
یہ کائنات اور یہ تارے
چاند اور سورج کے نظارے
یہ موٹر کار کی آوازیں
یہ انجان پروں کی پروازیں
ہیں ایک ہی گوہر سے یہ بنیں
جو میرا بھی ہے تیرا بھی، جو اِس کا بھی ہے اُس کا بھی
میں نہیں اکیلی دنیا میں

وقت

صاف سڑک تھی امبر گہرا نیلا تھا
اک سفر کا پورا راگ رسیلا تھا
اس نے کہا تھا، ''دن کتنا چمکیلا ہے!''
میں نے دور گھنے جنگل کو دیکھا تھا
جس میں دونوں جا سکتے تھے
ہم جنگل میں کھو سکتے تھے
اور جنگل کو پا سکتے تھے
کوئی کنواں بنا سکتے تھے
پانی کھینچ کے لا سکتے تھے
بَن پریوں سے مل سکتے تھے
ان کی پیاس بجھا سکتے تھے
کسی چکارے کو ہم اپنا
گہرا دوست بنا سکتے تھے
کسی شجر کو سجدے کر کے

ہم جل پان چڑھا سکتے تھے
کسی شاخ پر باندھ کے دھاگے
اثر دعا میں لا سکتے تھے

جگ مگ دن جب آنکھیں میچے
رات پڑے تاروں کے نیچے
ایک الاؤ جلا سکتے تھے

بھولی بسری کسی گپھا تک
راہ کھوجتے جا سکتے تھے
گپھا کے منہ رستہ جبڑا ہے
پھن کاڑھے اک ناگ کھڑا ہے
اس کو دور بھگا سکتے تھے

ایک خزانہ وہاں گڑا ہے
برسوں سے اَن چھوا پڑا ہے
دیکھ کے اس کی جھل جھل جوتی
ہم آنکھیں جھپکا سکتے تھے
اپنی اوک میں بھر سکتے تھے
باہوں میں سمٹا سکتے تھے
ہم جی بھر کر ہنس سکتے تھے
گیت پرانے گا سکتے تھے

لیکن جانا دور کہیں تھا
پاس ہمارے وقت نہیں تھا

نیا بھارت

تم بالکل ہم جیسے نکلے
اب تک کہاں چھپے تھے بھائی؟
وہ مورکھتا، وہ گھامڑ پن
جس میں ہم نے صدی گنوائی
آخر پہنچی دوار تمہارے
ارے بدھائی، بہت بدھائی!

بھوت دھرم کا ناچ رہا ہے
قائم ہندو راج کرو گے
سارے اُلٹے کام کرو گے
اپنا چمن تاراج کرو گے

تم بھی بیٹھے کرو گے سوچا
پوری ہے ویسی تیاری
کون ہے ہندو، کون نہیں ہے
تم بھی کرو گے فتوے جاری

ہوگا کٹھن یہاں بھی جینا
دانتوں آجائے گا پسینا
جیسے تیسے کٹا کرے گی
یہاں بھی سب کی سانس گھٹے گی

ماتھے پر سیندور کی ریکھا
کچھ بھی نہیں پڑوس سے سیکھا؟

کیا ہم نے دُردَشا بنائی
کچھ بھی تم کو نظر نہ آئی؟

بھاڑ میں جائے سِکھشا وِکھشا
اب جاہل پن کے گن گانا
آگے گڑھا ہے یہ مت دیکھو
واپس لاؤ گیا زمانہ!

کل دکھ سے سوچا کرتی تھی
سوچ کے بہت ہنسی آج آئی
تم بالکل ہم جیسے نکلے
ہم دو قوم نہیں تھے بھائی

مشق کرو تم آجائے گا
الٹے پاؤں چلتے جانا
دھیان نہ من میں دوجا آئے
بس پیچھے ہی نظر جمانا

ایک جاپ سا کرتے جاؤ
بارم بار یہی دُہراؤ
"کتنا ویر مہان تھا بھارت!
کیسا عالی شان تھا بھارت!"
پھر تم لوگ پہنچ جاؤ گے
بس پرلوک پہنچ جاؤ گے

ہم تو ہیں پہلے سے وہاں پر

تم بھی سے نکالتے رہنا
اب جس نرک میں جاؤ وہاں سے
چٹھی وٹھی ڈالتے رہنا

اَن سنی

جوالاسی جب لپکی تھی لَے
پنچم بجا ستار

بھیگ رہا تھا سارا عالم
ایسی تھی بوچھار

گھنن گھنن جب گرج رہا تھا
پورا میگھ ملھار
پور پور میں گونج رہا تھا راگ
تو پھر ایسے پل میں
آپ نے کہاں سنا ہوگا
میں خود سن کر حیراں تھی
اتنے کومل سُر میں جھنکتا
ایک اکیلا تار

حریفوں سے

جہاں ایک جنگل اُگا ہے
بہت دیر سے ایک عورت وہاں گھاس پر چل

رہی ہے
کبھی مسکراتی، کبھی گنگناتی
کبھی اشکِ گرم آستیں میں چھپاتی
پھر خود کلامی میں اکثر گنواتی
کبھی انگلیوں سے ہوا میں پرندے بنا کر اُڑاتی

یہ کیوں آگئی ہے؟
یہ کیا چاہتی ہے؟
ہماری حدوں میں خلل ڈالتی ہے!

اگر اس پر حملہ کریں ہر طرف سے
تو لاریب مغلوب کر لیں گے اس کو
وہ اپنے خیالات میں غرق ہے
اور اسے غالب آنے کی فرصت نہیں ہے
اگر اس کے چہرے پہ ڈالیں خراشیں
تڑپ کر یقیناً بہائے گی آنسو
مگر بھول جائے گی پل بھر میں سب کچھ
کہ ناخون اس کے
بناتے ہیں کچھ نقش اِک رقص کرتے شجر کے تنے پر
انھیں آپ کے خشم گیں رخ تک آنے کی
فرصت نہیں ہے

منڈپ میں

ہوش سنبھالنے پر ہی میں نے

صاف بتا دیا تھا دنیا کو
میں تیرے اشارے پر نہیں ناچوں گی
میں نے اپنے بھاؤ بتائے، اپنے قدم اٹھائے
اپنی مرضی سے باز و لہرائے
شاید کسی نے دنیا نے بھی کچھ کہا تھا مجھ سے
اس پل سنی اَن سنی میں نے کر دی تھی
دنیا نے بھی کہا تھا مجھ سے
تیرے اشارے پر میں بھی نہیں ناچوں گی
اپنی تال اور اپنی لے پر رقص کیا ہے دنیا نے
اس منڈپ میں، ہم نے اپنے اپنے بھاؤ بتائے
ہیں
اور باز و لہرائے ہیں
اور منڈپ سے پرے جہاں اندھیارا ہے
بیٹھی ہے خلقت، تماشا دیکھ رہی ہے
پاپ کارن کھاتی، سوڈا پیتی
آپس میں بتیاتی
ایک دبا دبا سا شور ہمیشہ جاری رہنے والا
جاری رہا ہمیشہ
اب جب میں نے ہاتھ جوڑ کر انھیں کیا ہے
الوداعی سلام
کسی نے دیکھا اور کسی نے نہیں
تین دو ایک نے تالی بھی بجائی اور کہا
خوب

جگل بندی تھی یہ
ایک طرح کی

تم دکھانا چاہتے تھے

دیر سے گرم سفر پرواز میں ہے اِک پرند
جو ابھی پہنچا نہ تھا
سبز پانی کے کنارے
کنکروں کے ڈھیر تک

بے کراں ہے آسماں
ہم سے اوجھل
تیرتا ہوگا وہیں
شاید اِک پیغام سینے میں دبائے
ایک گہرا زخم پانکھوں میں چھپائے
تم نے جو دیکھا نہیں
دیر سے گرم سفر ماندہ پرند
جو نہیں پہنچا کہیں

■■

شمیم حنفی

کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے!

فہمیدہ ریاض کی زندگی اور شاعری

(ایک تذکرہ)

کوئی ستارے چھو سکتا ہے، راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے۔

یہ مصرعہ اخترالایمان کی ایک نظم کا ہے۔ اس وقت فہمیدہ ریاض کے بارے میں سوچتے وقت اچانک یاد آگیا، تو کیا واقعی فہمیدہ نے ستارے چھو لینے کے خواب دیکھتے ہوئے زندگی گزار دی، اس طرح کہ ابھی وہ راستے میں تھیں اور موت نے انھیں آلیا۔ ان سے میری آخری گفتگو، ان کی موت سے صرف دو روز پہلے ہوئی۔ ان کے لہجے اور آواز میں وہی جانی پہچانی سی معمول کی لہر، بلکا سا دباد با اصرار، مگر اس وقت مجھے انوار ناصر اور محمد سلیم الرحمٰن سے ملاقات کے لیے، پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ریڈنگز جانا تھا۔ اگلی صبح لاہور سے کراچی کے لیے روانگی تھی۔ سوچا واپسی پر ملاقات ہو جائے گی۔ اس ملاقات کے نہ ہونے کا افسوس مجھے ہمیشہ رہے گا۔

زندگی اس حد تک غیر یقینی بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی لمحہ آخری لمحہ ہو سکتا ہے۔ ایک عرصے سے فہمیدہ جینے سے زیادہ مرنے کی مشق کر رہی تھیں۔ دوائیں چھوڑ دیتی تھیں۔ بے تحاشہ تمباکو نوشی کی لت لگا رکھی تھی۔ ان کھانے پینے میں کسی احتیاط اور پرہیز کی قائل نہیں تھیں۔

کچھ زندگی نے بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جسمانی صحت خراب، ذہنی اور جذباتی زندگی

کی ناہمواریاں اور مسائل اپنی جگہ۔ اِدھر سب سے بڑا صدمہ ایک حادثے میں کبیرؔ کی موت کا۔ غرض کہ ایک عجیب، وحشت ناک اور غم آلود سلسلہ تھا۔

یہ زندگی ایک جیتی جاگتی، درد بھری اور ہولناک سچائی تھی، ایسی کہ اس پر افسانے کا گمان ہوتا تھا۔ مگر اس زندگی یا کہانی میں کسی طرح کے پچھتاوے کی گنجائش نہیں تھی۔ فہمیدہ کا وجود خود رحمی اور خود تزئینی (Self-glorification) کے عنصر سے بالکل خالی تھا۔ وہ اپنے خوابوں، ارادوں، منصوبوں، تجربوں، غلطیوں، سب میں سچی تھیں۔ جیسا کہ عامر حسینؔ نے لکھا ہے:

فہمیدہ ریاض کے وژن کا وقار ایک جرأت مندانہ روح ہے۔ وہ صرف پاکستان کی ادیب خواتین کی 'میر کارواں' ہی نہیں (ہیں) گزشتہ تین دہائیوں میں ابھرنے والی کوئی نصف درجن اہم ترین ادیبوں میں بھی شامل ہیں۔ وہ ہمیں درحقیقت ایسے یاد رہیں گی، جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے، ایک ایسی ادیب

جو اپنی کہنی کہہ گزری
تا عمر نہ ہرگز پچھتائی

(فہمیدہ ریاض کا فن، سب لعل و گہر، ص: ۱۵)

۱۹۶۰ء کی دہائی میں فہمیدہ کی شاعری کا آغاز ہی شہرت سے ہوا۔ 'پتھر کی زبان' کے شائع ہونے سے پہلے 'فنون' لاہور میں اُن کی کچھ نظمیں احمد ندیم قاسمی نے شائع کی تھیں۔ اُن کے مصرعے اور اُن کا نام دیکھتے دیکھتے زبانوں پر چڑھ گیا۔ فہمیدہ کی شاعری میں اور شاید زندگی میں، یہ ایک طرح کی کچی رومانیت کا دور تھا۔ لیکن اس رومانیت کا تخلیقی مزاج اور ذائقہ اردو شاعری کی روایتی رومانیت اور اظہار و بیان کے معاملے میں تھکا دینے والی یکسانیت سے مختلف تھا۔ شاید اسی لیے فہمیدہ کی چند ہی نظمیں سامنے آئی تھیں کہ اُن کا تذکرہ عام ہونے لگا۔ اُس وقت سب نے محسوس کیا کہ اردو کی جدید شاعری، خاص طور سے خواتین کی شاعری میں نئے امکانات سے بھرا ہوا ایک بڑا واقعہ نمودار ہوا ہے۔ ہر چند کہ فہمیدہ کی ابتدائی نظموں پر فیض صاحب کے طرزِ احساس اور لسانی کلچر کے اثرات بہت نمایاں تھے، مگر اس شاعری میں ایک خلقی سادگی، معصومیت اور ایک گہرا وجودی عنصر بھی صاف دکھائی دیتا تھا۔ ان اوصاف کو کچھ کمک فہمیدہ کی شخصیت نے بھی پہنچائی۔ عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ اردو کی نئی شاعری میں ایک نئی نسائی آواز ابھری ہے، تمام پیش رو خواتین کی آواز سے مختلف۔ اور یہ کہ نئی شاعری کے ایوان میں فہمیدہ کے ساتھ ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا آیا ہے۔ فہمیدہ کے بہت بعد اس جھونکے کی ایک اور مثال پروین شاکر کے ساتھ سامنے آئی، مگر پروین شاکر کی بہ نسبت فہمیدہ کی شاعری میں دبازت زیادہ تھی۔ فکری سطح پر ثروت مندی زیادہ تھی اور ایک نئے امکان کی بشارت کا عنصر زیادہ مستحکم تھا۔ فہمیدہ کے

یہاں خیالات اور محسوسات کی رنگا رنگی بھی زیادہ تھی۔

اُن کی شاعری کے ان تمام محاسن اور اوصاف کو ایک واضح سمت ملی اُن کے دوسرے مجموعے 'بدن دریدہ' کے ساتھ۔

یہ ایک حیران کن، اردو شاعری کے عام قارئین کی اکثریت کے لیے ایک خاصا پریشان کن، اسی کے ساتھ ساتھ ایک لذت آمیز تجربہ تھا۔ یہ اپنے آپ میں بہت حوصلہ مندانہ اور عریانی کی حد تک بے تکلف، بہت بے حجابانہ اور قدرے غیر متوقعہ قسم کی شاعری تھی۔ "بدن دریدہ" کی بیشتر نظمیں دیکھتے دیکھتے لوگوں کی زبان پر چڑھ گئیں اور اُن کے بارے میں پُر جوش گفتگو ہونے لگی۔ فہمیدہ نے بہت جلد ایک طرح کی مثالی اور Iconic حیثیت اختیار کر لی۔ دلی میں اپنی آمد کے موقع پر، ایک انٹرویو دیتے ہوئے پروین شاکر نے واضح الفاظ میں اعتراف کیا کہ فہمیدہ اُن کے لیے ایک طرح کی فیض رسانی کا ذریعہ رہی ہیں اور یہ کہ اُن کی نسل اور عمر کی شاعرات کے لیے فہمیدہ نے اظہار و ادراک کا راستہ بہت صاف کر دیا ہے، اس طرح کہ "سارے کانٹے چن کر اپنی جھولی میں ڈال لیے ہیں۔"

فہمیدہ ریاض نے اپنے دور کی شاعری میں یہ حیثیت بڑی خاموشی کے ساتھ اختیار کی... اُن کی تخلیقی شخصیت میں توانائی بہت تھی، تنوع بہت تھا اور کشش آمیز تابندگی کے باوجود کسی قسم کا تصنع نہیں تھا۔ منصوبہ بندی اور پبلک ریلیشننگ اور سطحیت نہیں تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فہمیدہ کی شخصیت میں کسی طرح کا یک رُخا پن نہیں تھا۔ وہ ایک جامع الکمالات ہستی کی مالک تھیں۔ شاعری کے علاوہ نثر کے مختلف اسالیب پر بھی ماہرانہ گرفت رکھتی تھیں، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں۔ "بدن دریدہ" کی اشاعت کے بعد اُن کا جو شعری سرمایہ سامنے آیا، اس سے یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں کہ اب اُن کے تجربوں کی سطحیت اور ترجیحات میں تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اُن کے احساسات میں تبدیلی کی رفتار ویسے بھی نارمل انسانوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ تیز تھی۔ "پتھر کی زبان" لے کر سامنے آنے والی نو عمر لڑکی اپنے "رومانوی کرب" کے ساتھ کب کی غائب ہو چکی تھی۔ فہمیدہ ریاض کے اندر چھپی ہوئی باغی اور بے خوف عورت "بدن دریدہ" کی نظموں میں ایک بے ساختہ اور بے باک لب و لہجے کے ساتھ اپنے گوشت پوست کے وجود سے ہمیں کچھ اس طرح متعارف کراتی ہے کہ نسائی شاعری کا مانوس رنگ اور اس شاعری کی روایت، دونوں کا سراغ اب آسانی سے نہیں ملتا۔ خالد حسین کے لفظوں میں، فہمیدہ کے واسطے سے اب ہم ایک نئی عورت سے روشناس ہوتے ہیں، جو نہ تو اپنے عورت ہونے سے شرمندہ و پشیمان ہے، نہ گرد و پیش کی دنیا سے اسے کسی طرح کا ڈر ستاتا ہے۔ "محبت کے رومانی تجربے سے نکل کر (اب وہ) ایک دوسری سطح پر ظہور کرتی ہے اور (اس کا) تجربہ صرف ایک اندھی جبلت نہیں بلکہ کائنات کی

پُراسرار قوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔""بدن دریدہ" کی بعض نظموں سے نسائی شاعری کی ایک نئی بوطیقا مرتب ہوتی ہے۔ یہ نظمیں جسم اور روح کی روایتی ثنویت کے عیب اور عذاب سے محفوظ اپنے قاری کو ایک طرح کی عضوی اکائی کے تصور پر مبنی تجربات کی سمت لے جاتی ہیں اور اُسے خواہ مخواہ کی بقراطیت اور لایعنی بحثوں سے دور رکھتی ہیں۔ یہ نظمیں جذبات کے خوف سے مکمل رہائی کا راستہ دکھاتی ہیں اور ایک واضح ارضیت کا آہنگ اور رنگ لیے ہوئے ہیں۔ تخلیقی اور فن کارانہ وضع کے اعتبار سے "بدن دریدہ" کی شاعری کا زمانہ فہمیدہ کی زندگی میں اُنھیں میسر آنے والی سنہری فصلوں کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے تخیل کی زرخیزی، تجربے کی گرمی اور شدت، اظہار و بیان کے شعری وسائل پر اُن کی گرفت اور قدرت کا یہ سب سے زیادہ ثروت مند اور بارآور زمانہ تھا۔

بدن دریدہ کے بعد کا دور، فہمیدہ ریاض کی شاعری کے حساب سے مجھے ایک نمایاں اور واضح ٹھہراؤ کا دور دکھائی دیتا ہے۔ اب ایسا لگتا ہے کہ فہمیدہ کی زندگی اپنی سمت بدل رہی تھی اور وہ نئے راستوں کی تلاش میں تھیں۔ انحراف اور انکار کے ساتھ ساتھ، اُن کے سوشل کمٹ منٹ (Social Commitment) کی ایک نئی روداد شاید (بدن دریدہ کے بعد کے) اس دور میں شروع ہوتی ہے۔ دھوپ (جس میں ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۹ء کا کلام شامل ہے) "فہمیدہ کی طویل نثری نظم، کہ تم پورا چاندنہ دیکھو گے" (۱۹۸۰ء) 'ہم رکاب' (مارچ ۱۹۸۱ء سے دسمبر ۱۹۸۷ء تک کی نظمیں جب انھوں نے جلاوطنی اختیار کی اور دلی میں اُن کا قیام رہا۔) اور "آدمی کی زندگی" (۱۹۸۸ء سے ۲۰۰۰ء) تک کہی جانے والی نظمیں یکجا کی گئی ہیں)

اُن کے یہ تمام مجموعے اُن کی تخلیقی تھکن نہ سہی، مگر بیشتر مقامات پر ایک طرح کی نثریت، بیان کے سپاٹ انداز اور براہِ راست اظہار سے بوجھل ہیں۔ یہ دنیا کو اپنے آپ سے باہر بتا کر، جذبات کی دھند سے نکل کر اور آنکھیں پوری طرح کھول کر، دنیا کو دیکھنے، سمجھنے اور پرکھنے کی ایک نئی روداد تھی۔ ایک نئی سرگزشت یا سفرنامہ، اجتماعی زندگی یا دنیا کے تئیں ایک نئے عہدِ وفا کو نبھانے کی ایک نئی کوشش۔ اپنی پہچان اور اپنے آپ کو پانے کی ایک نئی جستجو۔ اپنے شاعرانہ تجربوں کی زمین پر اب فہمیدہ اپنی خلقی جذباتیت، اپنے مزاج کی پرانی رومانیت اور اپنی جانی پہچانی حیرتوں سے بچ نکلنے اور باہر آنے کے لیے بے چین دکھائی دیتی ہیں۔ تخلیقی زندگی کے مقاصد اور ادب کی افادیت کا ایک نیا تصور، اُن کی تحریروں میں بتدریج نمایاں ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے کہ اب وہ اپنی پوری ہستی کے ساتھ، خود کو دنیا کے حوالے کر دینا چاہتی تھیں۔ اُن کی نظموں میں خیال کی متانت، برہمی اور طنز و تمسخر کی مثالیں اسی دور کی یادگار ہیں۔ معلوم نہیں کس وجہ سے فہمیدہ نے اپنی کچھ دل چسپ نظمیں "سب لعل و گہر"

(کلیات؟) میں شامل نہیں کیں۔ ان میں پیروڈیز تھیں (لینن خدا کے حضور میں کو سامنے رکھ کر لکھی جانے والی)، سماجی طنز کی مثالیں تھیں (ان میں معروف ترین نظم: تم بالکل ہم جیسے نکلے/ اب تک کہاں چھپے تھے بھائی، ارے بدھائی ارے بدھائی)

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، 'بدن دریدہ' کے بعد کی شاعری، سفرنامے، فکشن پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ وابستگی کے ادب میں بڑھتے ہوئے یقین، ادب کی افادیت کے تصور میں بڑھتے ہوئے یقین اور ادیب یا آرٹسٹ کی ذمہ داریوں کے احساس میں بڑھتے ہوئے یقین کے ساتھ ساتھ اب ہمارے سامنے فہمیدہ کا ایک نیا جنم روپ، ایک نیا مزاج آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک حد تک اب اپنے آپ سے منحرف ہوتی جارہی ہیں اور اپنے عہد سے، اس عہد کی دنیا سے، اپنے گرد و پیش کی تمام زندگی کے معاملات سے، سیاست سے اُن کا شغف اور ربط بہت تیزی کے ساتھ بڑھتا جارہا ہے۔ اس میں ایک واضح رول فہمیدہ کے اپنے ماحول (اور ملک) میں وقوع پذیر ہونے والے سیاسی اور معاشرتی تغیرات کا بھی رہا۔ یہاں اس حقیقت پر غور کرنا بھی ضروری ہے کہ فہمیدہ کے ساتھ ساتھ اُن کے عصر کی زندگی اور تجربوں میں شریک، کئی شاعرات نے ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کی دہائی میں مزاحمت، انحراف اور احتجاج کی یہ روش اپنائی۔ کشور ناہید اور فہمیدہ نے تو خیر کم و بیش ایک آدرش اور Icon کی حیثیت اختیار کرلی، مگر چھوٹی بڑی متعدد شاعرات نے، جن کا تعلق سرحد پار کی روایت سے تھا، یہی شیوہ اختیار کیا۔ اس کی تفصیل ایک الگ مطالعے کا موضوع ہے۔

فہمیدہ کا امتیاز یہ ہے کہ اب اُن کا میلان صحافت، سیاست، سماجی تبدیلی کے مسائل، عوامی زندگی اور ادب، بالخصوص سندھی معاشرے اور زبان کی جانب شدید تر ہوتے گیا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ شاعری سے زیادہ اب وہ نثر کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اُن میں تخلیقی اپج اور لسانی اظہار کے بیک وقت متعدد پیرایوں پر ماہرانہ گرفت غیر معمولی تھی۔ اُن کی ہم عصر تمام خواتین قلم کاروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔ تخلیقی اور غیر تخلیقی (صحافتی، علمی اور سماجی) قسم کی نثر و نظم کے ترجمے کی صلاحیت بھی بہت تھی۔ ادب کے علاوہ تھیٹر، فلم، فوک آرٹ کے مضمرات پر ان کی نظر بھی خاصی گہری تھی۔ اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق فہمیدہ کو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تقریباً یکساں طور پر اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کا سلیقہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی حد تک تخلیقی اور فن کارانہ نثر کے انگریزی اسالیب بیان پر بھی قادر تھیں۔ انگریزی میں ایک ناول The People کا مسودہ فہمیدہ نے مکمل کرلیا تھا۔ یہ بات میرے علم میں نہیں کہ اس کی اشاعت ہوئی یا نہیں۔ دلی کے دوران قیام میں فہمیدہ پینگوئن پبلشرز سے اس ناول کی اشاعت کے لیے کوشاں تھیں مگر یہ کوشش اس وقت کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ بہر نوع، اگر یہ ناول ابھی تک چھپا نہیں تو اسے

چھپ جانا چاہیے۔ اس کا تعلق فہمیدہ کے سوانح سے بہت گہرا ہے اور یہ اُس صعوبتوں اور آزمائشوں سے بھرے ہوئے دور کی یادگار ہے جب فہمیدہ اپنے شوہر ظفر اور بچوں ویرتا اور کبیر کے ساتھ، دلی میں جلاوطنی اور خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہی تھیں۔

اس دور کا آغاز فہمیدہ کے اپنے ریکارڈ کے مطابق، مارچ ۱۹۸۱ء میں ہوا۔ اس کا خاتمہ دسمبر ۱۹۸۷ء میں۔ اسی طرح تقریباً سات برس انھوں نے ایک تکلیف دہ مسافرت کے عالم میں گزارے۔ اُن کی طویل نظم "کہ تم پورا چاند نہ دیکھو گے!" ہم وطنوں کے نام ایک مراسلے اور ایک سندیسے کے طور پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

فہمیدہ کی زندگی کا وہ زمانہ ضیاء الحق کے اقتدار کا تھا۔ اب اس پر خواب کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن اس دور میں فہمیدہ اور اُن کے مختصر سے کنبے پر کیا کچھ گزری، وہ اپنے آپ میں ایک کہانی ہے۔ دلی آنے کے بعد انھوں نے کچھ روز دربدری کے گزارے، کبھی اس بے مہر اور بے تحاشا پھیلے ہوئے شہر کے ایک کنارے میں، کبھی دوسرے کنارے میں۔ اجنبی فاصلے، انجانے لوگوں کی بھیڑ اور بے یقینی کی زندگی کا بوجھ کاندھوں پر۔ کبیر اُس وقت مشکل سے سال بھر کا رہا ہوگا۔ فہمیدہ اسے گود میں لے کر چلتی تھیں، کچھ گھبرائی ہوئی سی۔ قدرے اطمینان اور آسودگی کی صورت اُس وقت پیدا ہوئی جب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں انور جمال قدوائی صاحب نے، جو اُن دنوں وائس چانسلر تھے، فہمیدہ کو Poet in Residence کے طور پر بلا لیا۔ اس کے بعد ظفر اجن بھی جامعہ کے شعبۂ سیاسیات میں کسی پروجیکٹ سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے ماس کمیونی کیشن انسٹی ٹیوٹ کے کیمپس میں، اس کے بعد جامعہ کی آبادی سے ملحق ایک محلّے میں ان کی رہائش کا انتظام ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اِن انتظامات کے بعد بھی، یہ زندگی اپنے مسئلوں سے خالی تو نہ رہی ہوگی۔ آپ اپنے گھر دیس میں جینے کے لیے کتنے جھنجٹ برداشت کرنے ہوتے ہیں۔ یہاں تو معاملہ بدیس کا تھا۔

مگر فہمیدہ اور ظفر میں فرق چاہے جتنا رہا ہو، کچھ ملتی جلتی باتیں بھی تھیں۔ دونوں پیدائشی رومینٹکس (Romantics) تھے، خواب دیکھنے والے، موہوم امیدوں سے لَو لگانے والے اور اپنی خستہ حالی میں بھی مگن رہنے والے۔ دونوں نے اپنے اجتماعی مستقبل سے جیسی تیسی امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ دونوں کو پیپلز پارٹی (PPP) کی کارکردگی میں غیر متزلزل قسم کا بھروسہ تھا اور دونوں اپنے قائد سے عشق کرتے تھے۔ جامعہ ملیہ میں صابری برادران (غلام فرید صابری اور مقبول صابری) کی قوالیاں ہوئیں تو اُن کا اپنا جوش بھی دیدنی تھا۔ بس نہیں چلتا تھا کہ دونوں خود بھی اسٹیج پر پہنچ کر تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ "بھٹو صاحب کو یہ قوالی بہت پسند تھی۔" فہمیدہ بار بار یہ جملہ دوہراتی تھیں۔ اُن میں یہی جوش

اور ولولہ اُس روز دکھائی دیا جب جنرل ضیاء الحق ہندستانی حکومت کی دعوت پر دلّی آئے۔ فہمیدہ اور ظفر انجن نے ایک علامتی احتجاج کا بندوبست کیا۔ کبیر تو خیر ابھی بھی بہت چھوٹے تھے، البتہ ویرتا نے جامعہ نگر کے کچھ اور بچوں کے ساتھ کالی جھنڈیاں اٹھالیں اور جس وقت جنرل ضیاء کا جہاز اوپر نمودار ہوا تو تمام بچے تھے، حسب ہدایت جھنڈیاں لہرانے لگے! انسان جہاں حقیقت کے سامنے بے بس ہو، اس طرح بھی استعارے پر قانع ہوجاتے ہے۔ فہمیدہ اور ظفر کی کئی شامیں اس واقعے کے تذکرے اور بیان میں گزر گئیں۔ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے دونوں سادہ اور معصوم تھے۔ اُنھیں یہ انداز نہیں تھا کہ وہ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی! اور یہ کہ" اُس کے زمانے عجیب" ہوتے ہیں۔ وہ نوے دنوں کو نو برسوں میں منتقل کرسکتا ہے۔ دونوں کو یقین تھا کہ سماجی انصاف پر مبنی ایک معاشرہ بہت جلد وجود میں آنے والا ہے۔

فہمیدہ کے دوستوں کا ایک حلقہ بھی بن گیا تھا۔ اردو کے تو معدودے چند، لیکن ہندی کے بہت سے ادیب اور شاعر اُن کے حلقے میں شامل ہوتے گئے۔ فہمیدہ کی شہرت اور مقبولیت کا دائرہ خاصا وسیع تھا۔ دلّی کی مختلف یونی ورسٹیوں، بالخصوص جواہر لال یونی ورسٹی کے طلبہ، ہندی اور انگریزی کے بہت سے صحافی، شمالی اور جنوبی ہندوستان کی زبانوں میں لکھنے والے جو دلّی میں قیام پذیر تھے، جن وادی لیکھک سنگھ کے اراکین، سوشل ایکٹی وسٹ اور آرٹسٹ، ہر طرح کے لوگ قریب آتے گئے۔ اُنھیں اپنے جلسوں اور نشستوں میں بلانے لگے۔ دور دراز کے شہروں سے بھی اُنھیں مدعو کیا جانے لگا۔ اُن کے دلّی سے باہر کے دوستوں میں، وبھوتی نرائن رائے (شہر میں کرفیو، تبادلہ جیسے معروف ہندی ناولوں کے مصنف) اور ہمارے نامور سماجی مصلح اصغر علی انجینئر بھی تھے۔ انجینئر کی دعوت پر فہمیدہ نے مغربی ہندوستان کا سفر کیا۔ اسی سفر کے دوران انھوں نے اپنے ناول" گوداوری" کا خاکہ تیار کیا تھا۔

اُن کے لیے، ایک بہت بڑا جذباتی سہارا یہ بھی تھا کہ میرٹھ سے دلّی کی دوری بس برائے نام تھی۔ یہ شہر فہمیدہ کے بزرگوں کا وطن تھا اور یہاں اب بھی اُن کے کچھ رشتے دار آباد تھے۔ فہمیدہ کے ٹھکانے پر اُن کے آنے جانے کا سلسلہ لگا رہتا تھا۔ فہمیدہ کی بہنیں اور اُن کی والدہ بھی اُن سے ملاقات کے لیے دلّی آئیں۔ کچھ دنوں کے لیے فہمیدہ کی بڑی بیٹی سارہ بھی، جو اب امریکا میں ہے اور وعظ و تبلیغ کے کام میں مصروف...!

انور جمال قدوائی صاحب، پرانے وقتوں کے نہایت لبرل، روشن خیال، ترقی پسند انسان، انھوں نے فہمیدہ اور ان کے خاندان کا بہت خیال رکھا۔ یوں بھی اُس دور میں عام صورت حال آج کی جیسی مسموم اور خراب نہیں ہوئی تھی۔ جامعہ کا ماحول بہت کشادہ، بہت وسیع النظری اور بے تعصبی کا تھا۔ دنیا

بھر سے آنے والے دانشور، ادیب اور شاعر دلّی آتے تو سیدھے جامعہ کا رخ کرتے۔ علمی ادبی اور تعلیمی حلقوں میں اُن کا خیر مقدم کیا جاتا۔ اُن کے لیکچرز اور مذاکروں کا اہتمام عام بات تھی۔ جامعہ کے اوپن ایئر تھیٹر میں رونق رہتی تھی۔ حبیب تنویر کچھ عرصے کے لیے بہ طور وزیٹنگ پروفیسر آ گئے تھے۔ اپنے ڈرامے اسٹیج کرتے تھے۔ جامعہ کا آرٹ انسٹی ٹیوٹ نامور مصوروں کی آماجگاہ تھا۔ رام چندرن، پرم جیت سنگھ، جتن داس تو باقاعدہ فیکلٹی کا حصہ تھے۔ اِن سے قطع نظر، طیب مہتہ، کرشن کھنہ، ستیش گجرال، دِوان سندرم، ایم ایف حسین، وید نیر، گوگی سروج پال اور ارپتا سنگھ کی آمد و رفت آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے معمول میں شامل تھی۔ ہمارا قیام اُن دنوں بسیرا میں تھا، سیدین منزل سے ملحق کاٹیج میں۔ اس چھوٹے سے گھر کی بھی ایک الگ تاریخ ہے۔ ہمارے آنے سے پہلے عینی آپا (قرۃ العین حیدر) یہاں مقیم تھیں۔ اس سے پہلے یہ عمارت ڈاکٹر عابد حسین اور ''اسلام اینڈ ماڈرن ایج'' (Islam and the Modern Age) کا دفتر تھی۔ ہمارے آنے کے بعد بہت سے مصور اور ادیب دوستوں کے لیے اس کی حیثیت ایک مرکز کی ہو گئی۔ خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ فہمیدہ اور اُن کے بچے تقریباً روز یہاں آتے تھے۔ اُنھوں نے یہاں کئی نئے دوست بنا لیے۔

اُس دور میں دلّی آج کی جیسی سونی اور وحشت خیز نہیں تھی۔ لوگوں میں ملنا جلنا بہت تھا۔ اکثر محفلوں میں فہمیدہ موجود ہوتی تھیں، اردو سے زیادہ ہندی شاعروں ادیبوں کی محفل میں۔ اُنہی دنوں مشتاق گزدر اور سعیدہ گزدر بھی جامعہ نگر کی آبادی میں شامل ہوئے۔ مشتاق گزدر کی فلم The are killing the Horse۔ (جنرل ضیاء کے دور کا احاطہ کرنے والی فلم) اس کے کئی شوز ہوئے۔ ماس کمیونی کیشن سینٹر کے ایک ہال میں پرویز ہود بھائی بھی کشمیر کے بارے میں اپنی دستاویزی فلم کے ساتھ آئے۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا۔ ہم کہاں تھے کہاں آ پہنچے ہیں!

کتنی ہی زندگیاں اسی طرح سفر کرتے ہیں، جانے انجانے راستوں سے جانے انجانے راستوں کی طرف۔ اور کراچی سے دلّی کا فاصلہ تو ایک ایک سفر ہے۔ کبھی مختصر، کبھی طویل۔ دو پڑوسی ملکوں کی سیاست میں کرۂ ارض پر ایسی کوئی اور بھول بھلیاں شاید ہی کہیں ہو۔ نظیر اکبر آبادی کے لفظوں میں:

''ہم ہیں پتنگ کاغذی، ڈور ہے اس کے ہاتھ میں سات برس کے بن باس کے بعد، فہمیدہ، ظفر، ویرا اور کبیر نے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ کراچی میں پھر سے اُن کا ایک گھر بس گیا۔ اپنے وطن میں بھی ایک طرح کی بے وطنی کا دائمی احساس اور تجربہ فہمیدہ کی تقدیر تھی۔ جینے کے لیے ایک مستقل تگ و دو، بیماری آزادی، سکون اور بے سکونی کا ایک اور سلسلہ، زندگی کی کتاب کا ایک اور ورق لکھا جانے لگا۔

فہمیدہ کی تخلیقیت محض ایک طے شدہ راستے کی پابند نہیں تھی۔ اس کی بہت سی جہتیں تھیں۔ ہمہ

جہت جاندار اور کشش انگیز۔ شاعری کے ساتھ ساتھ، بلکہ ان کی شاعری سے زیادہ ثروت مند اور اپنے زمانے سے ہم آہنگ دور... اب فہمیدہ کی تخلیقی شہرت کا دور شروع ہوگیا۔ اُنھوں نے سفرنامہ لکھا۔ ترجمے کیے۔ اب ان کا قلم فکشن کی طرف چل پڑا۔ زندگی نے اُنھیں شاید تھکا دیا تھا لیکن تخلیقی تھکن سے وہ ابھی بہت محفوظ اور بہت دور دکھائی دیتی تھیں۔ کمال تو یہ ہے کہ تخلیقی ادب کے علاوہ سماجی اور صحافتی سطح کی تحریروں کے جو ترجمے فہمیدہ نے کیے، اُن پر بھی اپنی ایک الگ پہچان ثبت کر دی۔ فوزیہ سعید کی TABOOS کا ترجمہ 'کلنک' صرف لاہور کے شاہی محلے سے متعلق معلومات مہیا نہیں کرتا۔ اسے ایک دلچسپ کہانی، ایک تخلیقی دستاویز کے طور پر بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ اور فہمیدہ کی کہانیاں، جن کی داد اُنھیں انتظار حسین سے بھی ملی، ہمارے دور میں لکھے جانے والے فکشن کا ایک مستقل اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ منظوم ترجمے اس دور میں فہمیدہ نے کم کیے۔ اور اچھا ہی کیا جو کم کیے۔ سندھی شاعری کے تراجم کی بابت میں کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ رومی کے اشعار کا جو ترجمہ انھوں نے کیا، وہ بڑی حد تک ناکام ہے اور بہت بے رنگ، پھیکا... تصوف، مابعد الطبیعات اور سرّی تجربوں کی زمین فہمیدہ کے لیے شاید نامانوس اور اجنبی تھی۔ یہ دنیا اُن کی دنیا تھی ہی نہیں۔ اُنھوں نے اپنے زمانے اور اس زمانے کے آدمی کی زندگی کو ایک عام آدمی کی طرح دیکھا اور برتا۔ اسی زندگی کی تعبیر و تفسیر کے لیے فہمیدہ اِس خانۂ آب و گِل میں آئی تھیں اور یہ فریضہ انھوں نے بڑے خلوص، انہماک اور بے خوفی کے ساتھ انجام دیا۔ نہ اپنے آپ سے ڈریں نہ دنیا سے۔ اُن کا تمام تر شعری سرمایہ زمین سے زمین تک کے تجربوں کا پابند ہے۔ اُن کی شاعری ایک ٹھوس ارضی اساس رکھنے والی، زندہ و تابندہ تجربوں کی شاعری ہے۔ اُن کی ہم عصر شاعرات میں سرّی، مابعد الطبیعاتی تجربوں سے شغف سب سے زیادہ، شفیق فاطمہ شعریٰ کے یہاں ملتا ہے۔ کچھ اچھی مثالیں یاسمین حمید کی نظموں میں۔ کشور ناہید کی طرح، فہمیدہ ریاض کے مزاج کو بھی اس نوع کی فکر اور مذہبی اور متصوفانہ طرزِ احساس سے مناسبت نہیں تھی۔

فہمیدہ کی شاعری کی آخری کتاب "تم کبیر..." جس کی اہم ترین نظم بھی "تم کبیر" ہی ہے، اس کی باقی ماندہ نظموں میں فہمیدہ کا لہجہ بالعموم براہِ راست ہے اور اُن کی آواز بالعموم اونچی۔ زندگی اس طرح بھی شاعری کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ شاعری جاتی ہے تو جائے، زندگی کا حق ادا ہوتے رہنا چاہیے۔

پہلی نظم (تم کبیر) کا آہنگ کبیر سے یا اپنے آپ سے سرگوشی ہے۔ میں نے شدتِ جذبات سے تھرتھراتی ہوئی اس نظم کو ابھی صرف ایک سوانحی ریکارڈ کے طور پر دیکھا ہے، اپنی اسی حساس، ضدی، گھڑی بھر میں بکھر جانے والی، اپنی ایک یکتا اور بے مثال شاعرہ کی ڈائری کا ایک ورق سمجھ کر۔ میرے لیے یہ صرف شاعری نہیں ہے! ■■

آصف فرّخی

آدم نو کی ہم سفر

استنے دن ہو گئے وہ آواز میرے ساتھ چلی آ رہی ہے۔
میں جہاں جاتا ہوں میرے کانوں میں گونجنے لگتی ہے۔ ان کی ہنسی کی کھنکتی ہوئی آواز۔ اس ہنسی کے بغیر میں ان کا تصور نہیں کر پاتا۔ اور میں ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا، حالاں کہ ان مل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے موت کے موقع پر ہنسی کو یاد کرنا۔ ان کا نام سُن کر جگہ جگہ پہنچ جانے کی کوشش کرتا ہوں، میں فہمیدہ ریاض کا مستقل ماتم دار بن گیا ہوں۔ بار بار اپنے بکھرے ہوئے احساسات کو جمع کرتا ہوں۔ زندگی کے دوسرے بڑے صدمات کی طرح اس کو مندمل ہونے میں وقت لگے گا مگر میں تعزیت سے بڑھ کر فہمیدہ ریاض کی زندگی اور ادبی کارنامے کو سیلی بریٹ کرنا چاہتا ہوں، ایک جشن کی طرح جو ختم ہو کر بھی تمام نہ ہو۔

آخری ملاقات کے وقت انداز ہ نہیں ہو پایا مگر آخری دم تک ان سے پہلی ملاقات یاد رہے گی۔
میں نے جب انہیں پہلی بار دیکھا تھا اور حیران رہ گیا تھا۔ وہ انگلستان سے تازہ تازہ واپس آئی تھیں اور کراچی کے ادبی حلقوں میں گفتگو کا موضوع بن گئی تھیں۔ ادارہ یادگار غالب کے مہتمم مرزا ظفر الحسن نے غالب لائبریری میں بیرون ملک سے واپس آنے والی دو خواتین، فہمیدہ ریاض اور عرفانہ عزیز کے ساتھ گفتگو اور شعر خوانی کی محفل کا اہتمام کیا۔ اس زمانے میں غالب لائبریری، جو ناظم آباد میں واقع ہے، ایسی ادبی محفلوں کا مرکز بن گئی تھی۔ چھوٹی عمر سے ہی میرے والد مجھے ادبی محفلوں، مشاعروں میں لے کر جایا کرتے تھے۔ اس لیے مجھے کئی بار جوش ملیح آبادی کو قریب سے سننے کا اتفاق ہوا اور فیض احمد فیض کو بھی، احسان دانش کو سنا اور حفیظ جالندھری کو دیکھا۔ فہمیدہ ریاض کو سننے سے پہلے، ان کو دیکھنا یاد رہ گیا۔

اس محفل میں کسی نے میرے والد کو ٹوک دیا۔ ''ڈاکٹر صاحب، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ اپنے ساتھ بیٹے کو بھی لے کر آئے ہیں۔ یہ خیال نہیں کہ لڑکے کے اوپر کتنا بُرا اثر پڑے گا؟'' میرے والد نے تو ہنس کر ٹال دیا۔ مجھے فکر ہو گئی کہ بُرا اثر آخر کس بات کا پڑے گا۔ شعر و شاعری تو میں خوب سُنا کرتا تھا۔ شاید اس کا تعلق اس بات سے ہو کہ میں نے پہلی دفعہ کسی خاتون کو سرِ محفل سگریٹ پیتے ہوئے دیکھا، وہ فہمیدہ ریاض تھیں۔ سگریٹ کا کوئی اثر یوں نہیں پڑا کہ تھوڑے دنوں بعد دل کے شدید دورے کے بعد میرے والد نے یہ کام یکسر ترک کر دیا جو سارے گھر والوں کے لیے حیرت اور تحسین کا موجب بنا۔ سگریٹ نوشی سے بڑھ کر فہمیدہ ریاض کی شاعری کا اثر ہوا۔

میرے والد ہنستے ہوئے سنایا کرتے تھے کہ یہ نظمیں سُن کر، جن میں زُبانوں کا بوسہ بھی شامل تھی۔ میں نے ذرا بلند آواز میں پوچھا، ''اور تو باتیں میں سمجھ گیا لیکن یہ زمین دوز ریلوے کیا ہوتی ہے؟''

وہ بات قہقہوں میں دب گئی، اس لیے اس کا جواب مجھے خود ہی تلاش کرنا پڑا۔ پھر ایک عرصے تک میں اس تلاش میں سرگراں رہا۔ اس وقت کیا معلوم تھا کتنا کچھ زمین دوز ہوتے ہوئے دیکھنے کو ملے گا۔

کراچی کی محفلوں میں فہمیدہ ریاض کو برابر دیکھتا، ان سے بات چیت بھی ہوتی۔ ان کی شاعری نے بہت گہرا تاثر مرتب کیا تھا۔ لیکن ''بدن دریدہ'' کے بعد ''دھوپ'' کچھ let-down سی معلوم ہوئی۔ نیا نیا قلم سنبھالا تھا، اس پر ریویو آرٹیکل لکھا جو حمید زمان صاحب نے ''مورننگ نیوز'' کے صفحات میں شائع کیا۔ کراچی یونیورسٹی میں انجمن طلباء کے منعقد کردہ مشاعرے میں فہمیدہ ریاض کو دھیمے لہجے میں گرج دار نظم پڑھتے ہوئے سنا۔ پھر سمجھ میں آ گیا کہ سرکاری تعلیمی اداروں میں فہمیدہ ریاض کے پڑھنے پر بالخصوص اور مشاعروں پر بالعموم پابندی کیوں لگ گئی۔

پھر سنا کہ فہمیدہ ریاض ہندوستان چلی گئی ہیں۔ اس پر بہت قیاس آرائیاں ہوئیں۔ تفصیلات آہستہ آہستہ معلوم ہوئیں۔ ان کا حال احوال بھی تھوڑا بہت معلوم ہوتا رہا۔ پہلی بار دہلی جانے کا موقع ملا تو کسی نہ کسی خیر خواہ نے سختی سے خبردار کیا، فہمیدہ ریاض سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ ان کی باقاعدہ نگرانی ہوتی ہے اور ان سے ملنے والوں کی انکوائری شروع ہو جاتی ہے۔ دلی جانے کا ایک بار پھر موقع ملا مگر فہمیدہ ریاض سے ملاقات نہیں ہونے پائی۔ جاسوسی کے خوف سے بڑھ کر ایک اور چیز مانع آ گئی۔ ہوا یہ کہ فہمیدہ ریاض نے پاکستانی ادب کے بارے میں انگریزی میں مختصر سی کتاب لکھی جو دلی سے شائع ہوئی۔ میں مورننگ نیوز سے آگے بڑھ کر ہیرلڈ کے صفحات میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ رضیہ بھٹی نے وہ کتاب مجھے تھمائی اور کہا، اس کے بارے میں لکھ دو۔ اس وقت لکھنے کا جوش بھی نیا تھا اور ولولہ بھی۔ میں نے خاصے تیز فقروں کے ساتھ تبصرہ لکھ دیا جو رضیہ بھٹی نے معمولی سی ادارتی ترمیم

کے بعد شائع کر دیا۔ یہ تحریر فہمیدہ ریاض تک پہنچ گئی اور ان کی برہمی کی خبر بھی مل گئی۔ مگر درمیان میں ایک سرحد کا فاصلہ تھا۔ میں عافیت میں رہا۔

جلاوطنی کا طویل دورانیہ کاٹ کر فہمیدہ ریاض واپس آئی ہیں تو اس عرصے میں لکھی جانے والی نظموں کا مجموعہ ہم رکاب کے نام سے شائع ہوا۔ کتاب کی تعارفی تقریب آرٹس کاؤنسل میں منعقد ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، جلسے کے مضمون نگاروں میں میرے چچا انور احسن صدیقی شامل تھے اور کشور ناہید جو لاہور سے آئی تھیں۔ میں نے وہ کتاب حاصل کی اور پوری عقیدت کے ساتھ شاعرہ سے دستخط کروا لیے۔ اس کے فوراً ہی بعد فہمیدہ ریاض سے باقاعدہ تعارف ہوا۔ ان کو نام یاد تھا اور ان کے چہرے پر غصے، ناگواری کی لہر دوڑ گئی۔ ''ایسے جملے نہیں لکھنے چاہیے تھے .....'' انہوں نے چھوٹتے ہی اس تبصرے کا حوالہ دیا۔

غم و غصے کے اظہار کے ساتھ انہوں نے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات کہی۔ ''تم سے میں لڑنا نہیں چاہتی .....'' انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا، انہوں نے زندگی بھر کے لیے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ یہ نہیں کہ اختلاف کے موقع نہیں آئے، کبھی بار تیز م تیزی ہوئی۔ کرشن چندر پر ان کے زیر اہتمام ایک کانفرنس میں میرے مضمون پر وہ سر محفل خفا ہوئیں اور انتظار حسین سے میری شکایت کی، جو اس تقریب کی صدارت کر رہے تھے۔ مگر انہوں نے اپنی وضع نہیں بدلی اور میں بھی اپنی عادت سے باز نہیں آیا۔ ترقی پسند ادب کی پرستش کی حد تک بڑی ہوئی ستائش اور وطن کی سیاستِ دوراں پر ہمارا اختلاف آخر تک قائم رہا۔ اس سب کے باوجود، یا شاید اسی کے سبب، ان سے تعلق گہرا ہوتا گیا۔ میری طرف سے کمی بیشی ہوتی رہتی تھی اور ان کو شکایت کا موقع ملتا رہتا تھا مگر انہوں نے مرتے دم تک اس تعلق کو بڑے سلیقے سے نبھایا۔

روزمرہ کے ملنے جلنے میں جیسی گرم جوشی اور خلوص ان میں تھا، اس کی کوئی اور مثال ملنا مشکل ہے۔ مگر میں ان کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کروں گا جس کا ہر بار نئے سرے سے احساس ہوتا تھا۔ وہ سراسر تخلیقی شخصیت تھیں، پوری شاعر۔ وہ زندگی کا کوئی بھی کام کرتی تھیں، کسی بھی مرحلے سے گزرتی تھیں، ان کا رویہ شاعرانہ ہوتا تھا۔ کام وہ بے تحاشہ کرتی تھیں مگر کام کے نظم و ضبط سے بڑھ کر تخلیقی اظہار کا جذبہ ان کے احساسات میں یکتا رہتا۔ کوئی کتاب پڑھنا ہو یا علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانا، ان کا رویہ تخلیقی رہتا۔ اس لیے وہ سیدھی بات کا بھی شاعرانہ جواب دیا کرتیں۔ شاعری نے ان کے اندر ایک سرخوشی اور سرشاری سی بھر دی تھی۔ بے اندازہ تکلیفیں اٹھانے کے باوجود یہ سرخوشی، زندگی سے ان کی محبت سے پھوٹی پڑتی تھی۔ ان کی نظم میں آدمی کا یہ دلکش روپ ان کا اپنا ہی تو تھا۔

اس ڈھلی شام کا حاصل کیا ہے / دانش دل کیا ہے! / کیسے انسان کو دلدار کیا انساں نے
عجب اقرار کہ ہر بار کیا انساں نے / زندگی! تجھ سے بہت پیار کیا انساں نے!

زندگی سے آدمی کے اس بے پایاں عشق کا اظہار ان کی تحریروں کی بنیاد ہے۔ ان کا ادبی سرمایہ۔
حسن اتفاق سے ان کی تخلیقی شخصیت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ نیویارک میں مقیم ہندوستانی شاعرہ مینا الیگزینڈر سے میرا تعارف ان کی بدولت ہوا۔ مجھے وہ نظمیں اچھی لگیں، پھر فہمیدہ ریاض نے ان میں سے ایک نظم کا ترجمہ میرے حوالے کیا اور میری الٹی سیدھی باتوں کو ایک باقاعدہ شکل دے کر تجویز پیش کی کہ ایک ادبی مجلہ شائع کیا جائے۔ یہ ترجمے اس میں چھپیں۔ وہ اس طرح اپنے دوستوں کے لیے فیصلے کر لیتی تھیں اور ظاہر ہے کہ دوسروں کا فرض تھا کہ وہ ان فیصلوں پر پورا اتریں۔ مجلّے کی بات پروف ریڈنگ میں فہمیدہ ریاض کی فراغ دلانہ مدد کی پیش کش کے باوجود اتنی سیدھی نہ تھی۔ مگر ان کو اپنی بات منوانا بھی آتا تھا۔ "دنیازاد" نام کا ایک سلسلہ شروع ہوا اور اس میں شروع دن سے انہوں نے دل چسپی لی۔ وہ اس کو باقاعدہ کرنے کے لئے کڑھتی رہتی تھیں اور مندرجات پر تبصرے بھی کرتی جاتی تھیں۔ ان کا پڑھنا لکھنا ایک عجیب سرشاری سے عبارت تھا۔ جو کتابیں پڑھتی تھیں، ان کی ادبی لذت میں دوسروں کو شریک کرنے کے لیے تُل جاتی تھیں۔ نجیب محفوظ سے لے کر اسماعیل کادارے تک، کئی لکھنے والوں کا تعارف انہوں نے "دنیازاد" کے صفحات پر اپنے مخصوص انداز میں کرایا۔ ٹولسٹوئے کو بھی یاد کیا اور دوستوفیسکی کو آخری دنوں تک پڑھتی رہیں۔ زندگی کے تجربات جیسے ان کے اندر ایک گنگناہٹ سی بھر دیتے اور وہ اپنے آپ سے باتیں کرتی ہوئی، ہوا میں اڑتی ہوئی چلی جاتیں۔ انہوں نے "جھنو کو چٹھی ملی" اور "ڈھولی تارو ڈھول باجے" جیسی اسی کیفیت میں لکھیں اور اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر سنائیں۔ اس پورے عرصے میں انہوں نے شاعری کم کی (کہیں ان کی نثر اس سے آگے تو نہیں نکل گئی تھی؟) مگر مجھے وہ شام کیسے بھول سکتی ہے، جب انہوں نے آنسوؤں میں ڈوبے چہرے کے ساتھ "تم کبیر" کا پہلا ڈرافٹ میری طرف پڑھنے کے لیے بڑھایا تھا۔ وہ اسے خود نہیں پڑھتی تھیں، پہلے پہل چھپوانا بھی نہیں چاہتی تھیں۔ اس کو کہیں ادھر ادھر پھینک دینا چاہتی تھیں۔ مگر غم کا تیر تو کلیجے کے پار ہو چکا تھا۔
ان کا تخلیقی انہماک بڑھتی ہوئی بیماری کے باوجود آخری زمانے تک جاری رہا۔ وہ ایک اشاعتی ادارے کے لئے بچوں کی کتابیں تیار کر رہی تھیں اور ان کے لیے کام کرتی رہتی تھیں۔ پھر دوستوئیفسکی کے ناول پڑھنے لگتیں اور ان کے بارے میں خود کلامی کے سے انداز میں نوٹ بک، رجسٹر کے صفحات، پرانی ڈائریوں کے سادہ صفحات پر لکھتی جاتیں۔ بیماری کی وجہ سے فیس بک پر متواتر خامہ

فرسائی کا سلسلہ بھی بند ہوگیا مگر "بیماری کی تحریریں" جاری رہیں۔ اور اس وقت تک جاری رہیں جب تک انجام رسیدہ ہونے کی خواہش زندگی سے محبت پر حاوی نہ ہوگئی۔ وہ بار بار موت کا ذکر کرتیں، جیسے وہ اس کے لئے تیار ہوں۔ زندگی کی بے پایانی کا محور بدل گیا تھا۔ موت کی دستک دروازے پر سنائی دے رہی تھی۔ فہمیدہ ریاض نے طے کرلیا تھا کہ موت کے لیے دروازہ کھول دیں گی اور اسی پیار سے اس کا استقبال کریں گی جس والہانہ پن سے وہ زندگی سے بات کیا کرتی تھیں۔

میت سے نہ معافی منگوانا:

ایک مرتبہ مجھے فہمیدہ ریاض کے بارے میں تعزیتی مضمون لکھنے کے لیے کہا گیا۔ قباحت اس میں صرف اتنی تھی کہ وہ اس وقت زندہ تھیں۔ بڑے لکھنے والے اس قسم کی ضمنی تفصیلات سے حوصلہ نہیں ہارتے۔ مگر میں اتنا بڑا بننے سے رہ گیا۔

ہوا اس طرح کہ کراچی کے ایک انگریزی روزنامے کے لیے میں مضامین، تبصرے وغیرہ لکھتا رہا ہوں۔ اس کے ادارتی عملے میں نووارد ایک خاتون نے مجھے ٹیلی فون کیا اور یہ اسائمنٹ میرے سپرد کردیا۔ یہ فرمائش سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ "خیر تو ہے، کیا ہوگیا فہمیدہ ریاض کو؟" میں نے گھبرا کر پوچھا اور الفاظ جیسے میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔

کچھ نہیں ہوا، مجھے بتایا گیا کہ بڑے اخبارات کا معمول ہے کہ ہر شعبے میں اہم شخصیات کے تعزیت نامے لکھوا کر رکھ لیتے ہیں۔ نہ جانے کس وقت جلدی میں ضرورت پڑ جائے۔ دو چار اور بھی نام لیے گئے کہ ان کے تعزیت نامے تیار کیے جارہے ہیں اور میں چاہوں تو فہمیدہ ریاض کے بجائے ان میں سے کسی ایک کے بارے میں لکھ سکتا ہوں۔

ان میں ایک کرتب باز ٹائپ کے سیاسی شاعر کا نام بھی تھا۔ میں نے جل کر کہا، ان کے بارے میں لکھنے کے لیے تیار ہوں اور یہ بھی دعا مانگوں گا کہ اس تعزیتی مضمون کے جلد چھپنے کی نوبت آجائے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اسائمنٹ مجھے نہیں دیا گیا۔ میرا پورا دن جیسے غم و غصے کی حالت میں کٹا۔ شام کو یہ ماجرا فہمیدہ ریاض کو ٹیلی فون پر سنایا۔ غصے میں شریک ہونے کے بجائے انہوں نے الٹا ہنسنا شروع کردیا۔

"تمہیں اس مضمون کے لکھنے سے ہرگز انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم نے ادب کا نقصان کردیا۔ فوراً یہاں آؤ، اس کو سیلی بریٹ کریں۔" انہوں نے اپنے گھر بلالیا اور ہنستے ہوئے میرا استقبال کیا۔

"آؤ اس مضمون کا خاکہ بنائیں۔ تم اس طرح خیال کرو کہ یہ مضمون لکھ رہے ہو۔ اب بتاؤ میری موت

کی وجہ کیا ہوئی اور اس کی تفصیلات کیا ہیں...."

انہوں نے فوراً ہی افسانہ گھڑنا شروع کر دیا اور ہوائی قلعہ بنانے لگیں۔ ایک اچھے شاعر کو کس طرح مرنا چاہیے۔ اور آخری رسومات کی تفصیلات کیا ہونا چاہئیں۔ اپنی موت کی المناک تفصیلات پر وہ بے تحاشہ ہنسے جا رہی تھیں اور لوگوں کے ممکنہ ردعمل طے کرتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک قرین قیاس موت تھی۔ قدرے مضحکہ خیز مگر عین ممکن۔

اپنی موت پر اس طرح ہنسنے کا حوصلہ میں نے فہمیدہ ریاض میں دیکھا۔ مختلف سیاسی اور سماجی معاملات پر جوش و جذبے کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں حس مزاح بھی خوب کارفرما تھی۔ وہ چیزوں کے مزاحیہ پہلو دیکھ کر ان سے لطف لینے کی اہل تھیں۔ دوسروں کی طرح اپنے اوپر بھی دل کھول کر ہنس سکتی تھیں۔ بہت مزے لے لے کر قصے سنایا کرتی تھیں۔ سفر، مطالعہ، گوناگوں لوگوں سے ملاقاتیں ان کی قصہ گوئی کے لیے مہمیز کا کام دیتے۔

ایک بار وہ اکادمی ادبیات کی طرف سے کسی وفد کے ساتھ چین کے سرکاری دورے پر بھیجی گئیں۔ وہاں چینی ادیبوں سے مڈھ بھیڑ اور نظریاتی بحث کا احوال تو انہوں نے اپنے ترقی پسند دوستوں کو سنایا اور مجھے جو قصہ سننے کو ملا وہ ایک بزرگ ادیب کی تکلیف کا بیان تھا جو دیر تک پیشاب روک نہیں سکتے تھے اور ایک کارخانے کے دورے میں ضرورت محسوس کرنے کے باوجود حکام کی اجازت حاصل نہ کر سکے اور اگلے کارخانے تک روانہ ہونے کے لیے بس میں بٹھا دیے گئے جہاں ضرورت کی شدت سے ان کی حالت غیر ہونے لگی۔ بس کے اوقات کار اور دوسری تفصیلات پہلے سے متعین تھیں اور ڈرائیور کو اچانک بس روکنے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ اس بحران کو وہ ہر بار نئے انداز سے بیان کرتیں جس میں تکلیف کی شدت بتدریج بڑھتی جاتی۔

اس سفر میں خالدہ حسین ان کے ساتھ تھیں... ان دونوں سے بڑھ کر مجموعہ اضداد تلاش کرنا فی زمانہ مشکل ہے۔ پورے سفر میں وہ سخت احتیاط برتیں کہ صرف حلال اشیا ہی کھائیں اور فہمیدہ ریاض سے بھی یہی اصرار کرتیں۔ دونوں کو اکثر اوقات ڈبل روٹی اور سبزی پر گزارا کرنا پڑتا۔ ایک موقع پر جب ان کو تقریباً یقین ہو گیا کہ فہمیدہ ریاض سانپ یا کینچوا نگل جانے کے قریب ہیں تو ان کو تسلی دینے کے لیے ترجمان سے پوچھا گیا کہ یہ کیا چیز ہے۔ ترجمان ایک خاص طرح کی کتابی اردو بولتا تھا، جس کے انداز میں فہمیدہ ریاض باتیں کر کے خوب ہنستی ہنساتی تھیں... "یہ ایک آبی مخلوق ہے۔ یہ مملکت چین کے گہرے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔" اس نے اطمینان دلایا چاہا مگر فہمیدہ ریاض کا ہنس ہنس کر برا حال نہ صرف اس وقت ہو گیا بلکہ مجھے سناتے ہوئے بھی وہ قہقہے لگا رہی تھیں۔

اس کے بعد انہوں نے مذاق بنا لیا۔ کسی ناپسندیدہ آدمی کے بارے میں رائے کا برملا اظہار کرنا ہوتا تو وہ خالدہ حسین کی پریشانی اور ترجمان کا جواب دہرانے لگتیں.... "یہ ایک آبی مخلوق ہے....."

وہ خود آبی مخلوق نہ بن سکیں۔ ان کے مزاج میں ایک نوع کی معصومیت سی تھی جو بعض مرتبہ سادہ لوحی (naivitee) کے قریب پہنچ جاتی اور اس کی بدولت وہ تکلیف دہ حد تک غیر ضروری بحث میں الجھ جاتیں یا مشکلات میں پھنس جاتیں۔ مشکلات میں پھنس جانے کا ان کو خاص سلیقہ تھا، اور وہ بڑی تن دہی سے یہ فریضہ سرانجام دیا کرتی تھیں۔ وہ کراچی اور اسلام آباد میں اعلا اختیار والے عہدوں پر فائز رہیں اور صاحبان اقتدار سے سلام دعا بھی رہی لیکن اس مزاج کی وجہ سے وہ اس قسم کے خاطر خواہ فائدے نہ حاصل کرسکیں جس طرح پاکستان کے بعض دوسرے ادیبوں نے بڑے دھڑلے سے حاصل کیے اور پھر بھی نیک نام بنے رہے۔ آسودگی اور فراغت کی خواہش کے باوجود وہ بہت محنت کوش تھیں۔ چناں چہ آخری دم تک گھر چلانے کی ذمہ داری اٹھائے رہیں۔

انہوں نے اپنی مجبوری کو Cash نہیں کیا۔ آخری بیماری کے طویل دورانیے میں ان کے سیاسی رفقاء میں سے کسی ایک کو، جو بڑے بڑے عہدوں پر براجمان تھے، خیال آیا کہ فہمیدہ ریاض کی تیمار داری کی جائے۔ چند لوگ اس کے پاس بھیجے گئے یہ پوچھنے کے لیے کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔ فہمیدہ ریاض نے اپنے مخصوص انداز میں سوچتے ہوئے جواب دیا، رات کو کسی وقت میری آنکھ کھل جاتی ہے تو چائے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس لیے آپ مجھے وہ سیٹی بجانے والی کیتلی منگا دیجیے تاکہ میں رات کو چائے بنا سکوں...."

چناں چہ حسب فرمائش ان کے لیے کیتلی کا بندوبست کر دیا گیا۔ ان کے شوہر ظفر اجن نے تاسف بھرے لہجے میں مجھے یہ واقعہ سنایا اور کہا، کیتلی منگوا لی۔ کم از کم ایئر کنڈیشنر تو منگوایا ہوتا!

مگر فہمیدہ ریاض کو کیتلی کی ضرورت محسوس ہوئی، اس لیے انہوں نے یہی کہہ دیا۔

وہ خود اس کا بیان نہیں کرتی تھیں لیکن فہمیدہ ریاض کے دوستوں کو اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان کی زندگی کا یہ دور بہت سخت رہا۔ زندگی میں بے ترتیبی اور صحت کے معاملات میں لاابالی پن کا نتیجہ اچھا نہیں رہا۔ اب سے کئی برس پہلے میں ان کو ذیابیطس کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لے کر گیا جن کے علاج سے مجھے فائدہ ہو رہا تھا۔ میری طرح ڈاکٹر صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پرانی رپورٹیں موجود ہیں، نہ علاج کی تفصیلات کہ کون سے ٹیسٹ کب کروائے گئے اور کب نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس آنے والے اکثر مریض ترتیب وار نسخے رکھ کر پورا فائل بنا لیا کرتے تھے مگر فہمیدہ ریاض نے ایسا کوئی تکلف نہیں کیا۔ مریض سامنے موجود ہے، معالج خود نتیجے تک پہنچ جائیں، ورنہ ایسے مسیحا سے کچھ اچھا ہو نہیں سکتا۔

میں نے فہمیدہ ریاض کی مترنم ہنسی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے آنسوؤں کا ذکر بھی لازمی ہے۔ میں ان کو بری طرح بلک بلک کر روتے، سسکتے بھی دیکھا ہے جو از حد تکلیف دہ منظر تھا۔ پردیس میں جوان جہاں بیٹے کی حادثاتی موت اور لاش کے حصول کی تکلیف دہ تفصیلات کے بعد کتنی بار یہ ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے اچانک رونے لگتی تھیں اور اس درد سے روتی تھیں کہ دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا۔ کبیر کے نام سے منسوب نظم لکھنے کے بعد ان کو قرار تو نہیں آیا مگر رونا کم ہوگیا۔ آہستہ آہستہ زندگی کے معمولات واپس آنے لگے۔ وقت مرہم تو نہیں بنا مگر جیسے انہوں نے ساری تلخی کو اپنے دل میں اتار لیا، اور دل ٹوٹ کر رہ گیا۔ طرح طرح کی بیماریوں نے سر اٹھالیا اور جینے کی اُمنگ جیسے بجھ کر رہ گئی۔

مگر شمع بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے۔ اس دور میں بھی فہمیدہ ریاض نے اپنے اظہار کے خاص پیرایے کچھ تلاش اور کچھ وضع کر لیے۔ اپنے کئی دوسرے منصوبوں کے برخلاف، قدیم دور میں مزدک کے ایران پر مبنی ناول ''قلعۂ فراموشی'' مکمل کر لیا۔ افسانے لکھتی رہتی تھیں... وہ جس چیز کو چھو لیتی تھیں، اس کو افسانہ بنادیتی تھیں۔ ان میں سے بعض کو مکمل کرنے یا اپنے سے الگ کر کے کاغذ پر منتقل کرنے کی ضرورت بھی نہ محسوس کرتیں۔ اس کے علاوہ ان کے اظہار کا نیا ذریعہ فیس بک تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی اسکرین کے اوپر اپنے آپ سے اور دوستوں سے باتیں کرتی رہتیں۔ جون ۲۰۱۷ء تک کی پوسٹیں میں نے پڑھ لی تھیں۔ خود وارفتگی کی کیفیت کے ساتھ خود کلامی کا جو انداز ڈائری کی سی بکھری ہوئی تحریروں میں کرتی تھیں، وہ فیس بک پر کرنے لگیں۔ جو جی میں آتا، لکھ دیتی تھیں بلکہ بعض دفعہ تو دعوتِ مبارزت دیتی تھیں کہ آ بیل، مجھے مار، دل چسپ تبصرے اور چبھتے ہوئے فقرے۔ ظاہر ہے کہ مخالفت کا طوفان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ بعض لوگ دوبدو جواب دینے لگے۔ فیس بک کے اوپر فہمیدہ ریاض نے ایک بزم سجالی تھی جس میں وہ اپنے آپ سے اور اپنے دوستوں سے باتیں کررہی تھیں۔ یہ سلسلہ تادیر جاری رہا۔ پھر کمپیوٹر خراب ہوگیا اور موبائل ٹیلی وژن میسر نہیں رہا تو فیس بک کا یہ باب بھی بند ہوگیا۔ اگر کسی طرح سے فیس بک ان کی پوسٹوں کو جمع کر کے ترتیب دے لیا جائے تو بڑی دل چسپ تحریر سامنے آئے گی۔ فہمیدہ ریاض تو اپنی بات کہہ سُن، کچھ پی کر اور کچھ چھلکا کر محفل کیف و مستی سے رخصت ہوگئیں مگر ان کے یہ الفاظ بھی باقی رہ جائیں گے۔

میں نے ان کو طویل افسانے اور ناول کے کئی منصوبے بناتے دیکھا۔ چند ایک شروع بھی ہو جاتے، ابتدائی حصے، ادھورے خاکے۔ پھر کسی پرانی دھرانی ڈائری میں رہ گئے۔ ''قلعۂ فراموشی'' اس لیے مکمل ہوگیا کہ عین ان دنوں فہمیدہ ریاض کی پرانی خواہش... ایک تخلیق کار کی ازلی ضرورت... ان کو فراہم ہوگئی۔ وہ جس ادارے سے وابستہ ہوگئی تھیں، وہاں ان کو لکھنے پڑھنے کے لیے ایک میز، لیمپ

ٹاپ اور کتابیں حاصل کرنے کا اختیار تھا۔ ایران کی تاریخ پر بہت سی کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ دن بھر ان میں غرق رہتیں۔ کئی بار یہ بھی ہوا کہ میں ان کے دفتر آیا، ان کے سامنے کھڑا ہو گیا، انھوں نے نظر اٹھا کر ابھی نہ دیکھا۔ آواز دی تو ''ہوں'' کہا، پھر چونک اٹھیں۔ وہ مخصوص ہنسی اور فوراً شروع ہو جاتیں... دیکھو اس کتاب میں کیا لکھا ہے۔ وہ اپنی دریافت میں سب کو شریک کرنا ضروری سمجھتی تھیں۔ اس بار دفتر بھی ٹھیک تھا اور تخلیقی جذبہ بھی وقت کی شرط کو سہار اگیا۔

دفتر، دفتر۔ فہمیدہ ریاض کے مختلف دفتروں کا حال بیان کرنے کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔

یہ لاش ہے ایسی عورت کی:

کئی بار دیکھا مگر تعجب کم نہ ہوا۔

ہر نئے دفتر میں فہمیدہ ریاض نئی صورت حال میں نظر آتی تھیں۔ یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ازسرنو ایجاد کر لیتی (re-invent) تھیں مگر وہ جان و دل سے نئے حالات میں جُٹ جاتیں اور بڑے انہماک سے کام کرنے لگتیں۔ حکام بالا کی تائید انھیں اردو لغت بورڈ میں لے آئی۔ تعجب اور دل چسپی کے ساتھ انھوں نے اس دفتر کو دیکھا اور اس کے معاملات سے اپنے آپ کو آشنا کیا۔ یہ صرف دفتری معاملہ فہمی یا کارِ دنیا نہیں تھی بلکہ ان کے لیے انوکھی دریافت بن گئی۔ اس واردات پر انھوں نے پے در پے افسانے لکھے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر کتنی دور رس تھی۔ دفتر کے معاملات اور مشاہدات تخلیقی تجربے کا حصہ بن گئے۔

علاوہ اور جگہوں کے، فہمیدہ ریاض نے ایک غیر سرکاری تنظیم وعدہ کے نام سے بنائی اور اس کے معاملات کو بالکل اپنے گھریلو معاملات کی طرح چلانا شروع کیا جس پر ان کے بعض دوستوں نے فقرہ کسا کہ وعدہ ہی کیا جو پورا ہو گیا۔ مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹی رہیں۔ اس تنظیم کا لائحہ عمل مرتب کیا، اس کے تحت کانفرنسیں کرائیں اور کتابیں شائع کیں۔ اس سلسلے میں مجھے بھی کچھ ہاتھ بٹانے کا موقع ملا۔ مجھے سب سے زیادہ ان کی میٹنگز کا رہتا تھا۔ ہر میٹنگ سے پہلے فہمیدہ، اپنی بہن نجمہ منظور کو ہدایات جاری کرنا شروع کر دیتیں کہ دہی بڑے منگوائے جائیں یا چاٹ چھولے۔ ظاہر ہے کہ یہ منصوبہ بندی بہت ضروری تھی، اور ایکشن پوائنٹ میں سب سے زیادہ قابل عمل۔ وعدہ جتنے دن چلتا رہا، اپنا کام کرتا رہا اور اپنی یادگار کے طور پر چند کتابیں چھوڑ گیا۔

ایک ادارے سے نکل کر فہمیدہ ریاض خالی ہاتھ نہیں بیٹھتی تھیں۔ اس دور میں سب سے زیادہ عرصہ انھوں نے اس اشاعتی ادارے میں گزارا جہاں امینہ سید نے انھیں بلالیا تھا۔ وہاں اور باتوں کے

علاوہ سب سے بڑی سہولت تھی کہ دفتری وقت کی پابندی کے بجائے اپنی مرضی سے آتی تھیں اور جو دل چاہتا تھا وہ کام کرتی تھیں۔ انھوں نے بچّوں کے لیے ترجمے اور کتابوں پر کام کیا اور بڑی مفید تالیفات تیار کیں۔ ان میں سے کئی کتابوں کو ایک بینک کے قائم کردہ فنڈ کے تحت انعام سے نوازا گیا۔ میں بھی اس میں بطور مُنصف کئی مرتبہ مقرر ہوا اور مجھے اندازہ ہے کہ فہمیدہ ریاض کا کام دوسروں سے بدرجہا آگے تھا، چاہے انعام ان کو ملا ہو نہ ملا ہو۔ ان انعامات سے اشاعتی ادارے کی نیک نامی میں زیادہ اضافہ ہوا۔ امینہ سید نے ایک تعزیتی جلسے میں بیان کیا کہ ان کا اور فہمیدہ ریاض کا ساتھ بہت خوشگوار رہا اور برسوں ان کا معمول رہا کہ کیفے ٹیریا میں دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا کرتی تھیں اور کھانے کے دوران دنیا جہاں کی باتیں کرتی جاتی تھیں۔ باتیں کرنا بھی تو فہمیدہ ریاض کا فن تھا۔

یہ دور جتنا اچھا گزرا، اس کا خاتمہ افسوس ناک طور پر ہوا۔ بعض تفصیلات منہا کر دینے کے بعد اس کا ذکر اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ درس عبرت حاصل ہو۔ اندازہ لگایا جا سکے کہ فہمیدہ ریاض جیسی نابغۂ روزگار ہستی کے ساتھ کیا سلوک ہوا اور ہم سب بیٹھے دیکھا کیے۔ میں ان کے سامنے شرمندہ ہوں۔ معاملہ جب بگڑا جب فہمیدہ ریاض کی صحت بگڑنے لگی۔ اس سے پہلے کام کیے جا رہی تھیں۔ کچھ کام گھر لے جاتیں اور وہاں لکھنے کا عمل جاری رکھتیں کہ باقاعدگی قائم رہے۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ اس عرصے میں جو کتابیں تیار کریں گی ان کا کوئی معاوضہ یا رائلٹی وصول نہیں کریں گی، اس لیے کہ لکھنے کا کام زیادہ تر دفتری اوقات میں ہوتا تھا۔ صحت بگڑتی چلی گئی، دفتر جانا بھی گنڈے دار ہو گیا۔ مگر دفتر کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ چوں کہ ان کو مستقل بنیادوں پر ملازمت دی گئی تھی، اس لیے دوا علاج کا خرچہ دفتر کی طرف سے ہوتا۔ یہ فہمیدہ ریاض کے لیے بہت بڑا سہارا تھا۔ علاج دیر تک کے حسب ہدایت ہوتا جو لاہور سے ٹیلی فون کرتی رہتی اور وقفے وقفے سے چکّر لگاتی رہتی تھی۔ مگر وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ اشاعتی ادارے میں بڑی انتظامی تبدیلیاں آنے لگیں اور امینہ سید کے گرد گھیرا تنگ ہو گیا۔

اس دوران، ایک شام میرے پاس نجمہ منظور کا فون آیا کہ باجی بہت پریشان ہیں، تم فوراً آؤ۔ معلوم ہوا کہ نئی انتظامیہ کے سربراہ جو بہت سے افراد کو مدفاصل سمجھنے پر مُصر تھے، ان کے دستخط سے فہمیدہ ریاض کے نام ایک خط جاری کیا گیا ہے جس میں ان کو اطلاع دی گئی ہے کہ وہ ملازمت سے فارغ کر دی گئی ہیں، اس لیے تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔

امینہ سید کو میں نے جب یہ بتایا تو ان کو اس خط کی ہوا تک نہ لگنے دی گئی تھی۔ فہمیدہ ریاض کی پریشانی فطری تھی۔ انھوں نے دفتر جا کر نئے سربراہ سے ملنے اور اپنی میز پر سے ذاتی استعمال کی چیزیں، کتابیں اٹھانے کی کوشش کی گئی تو چوکیدار نے انھیں روک دیا اور کہا، آپ اندر نہیں جا سکتی

میں ۔روتی دھوتی وہ واپس گھر چلی آئیں۔
انھوں نے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تو ان کو بتایا گیا کہ آپ کا تقرر جاری نہیں رہ سکتا تھا، مگر آپ فکر نہ کریں آپ کو گھر بیٹھے اتنا کام ملتا رہے گا۔ بگڑتی ہوئی صحت اور پست ہوتے حوصلے کے باوجود فہمیدہ ریاض لکھنے کے لیے تیار تھیں۔ ان کو اندازہ تھا کہ اگر وہ لکھتی رہیں گی تو ان کے لیے اچھا رہے گا۔ لیکن لکھنے کے کام کا وعدہ، فہمیدہ ریاض کا وعدہ نہ تھا۔ اس کے پورا ہونے کا انتظار ہی رہا۔
اشاعتی ادارے کے سنگ دلانہ سلوک کی گواہ، فہمیدہ ریاض کی چھوٹی بہن نجمہ تھیں جو خود بہت بڑے حادثے سے گزر چکی تھیں مگر حیدرآباد میں اپنا گھربار چھوڑ کر یہاں رہ رہی تھیں اور آخر وقت تک معاملات سنبھالنے کی کوشش کرتی رہیں۔ ادارے نے فہمیدہ ریاض کے ساتھ جیسا سلوک کیا، اس سے ان کو تکلیف بہت ہوئی مگر شاید حیرت کم ہوئی، اس لیے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام اور کارپوریٹ کلچر کی سنگ دلی سے خوب واقف تھیں۔ پھر انھوں نے اپنے لیے کوئی رعایت طلب نہیں کی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ بین الاقوامی ادارے نے پہلے تو بزم ناز سے غیر کی طرح اٹھا دیا، کہ یوں... پھر فہمیدہ ریاض کے انتقال کی خبر عام ہوئی تو یہ افراد آنسو بہانے بھی پہنچ گئے۔ اس خبر کی تشہیر کی گئی کہ فہمیدہ ریاض اس ادارے سے اتنے عرصے وابستہ رہی ہیں اور ہمیں ان کی رفاقت پر فخر ہے۔ پھر ایک پوسٹر لگا دیا گیا اور ان کی یاد میں تعزیت تقریب کا اعلان کیا گیا۔ قتل کرنے کے بعد الٹا ثواب بھی تو کمانا تھا۔ نجمہ اور ویرتا نے اس تقریب کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا بلکہ ویرتا نے فیس بک پر مذمتی پوسٹ بھی لگا دی۔ مگر لوگوں کے سوالات کی بوچھار سے تنگ آ کر ہٹا دی۔ فہمیدہ ریاض کے دوستوں میں سے انیس ہارون، عطیہ داؤد اور خالد احمد نے بھی تقریب سے دور رہنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے تو جان بوجھ کر نہ بلانے کا فیصلہ کیا گیا تھا ورنہ مجھے اپنے فرخ آبادی اسلاف کو یاد کرنا پڑتا۔ میں گھر میں بیٹھا بے کل ہوتا رہا۔ مجھے ان دو تین دوستوں پر تعجب یا افسوس نہیں ہے جو حالات سے پوری طرح باخبر نہ ہونے کے باوجود وہاں پہنچ گئے اور الٹی سیدھی باتیں بھی کر گئے... جن میں وہ خاتون قابل توجہ ہیں جنھوں نے کہا اگر ان کو معلوم ہوتا کہ فہمیدہ اتنی بیمار ہیں تو وہ ضرور ان کو دیکھنے جاتیں مگر کئی برس کے تعطل کے بعد ان کو اندازہ تھا کہ ڈپریشن سے بڑھ کر کوئی بیماری بھی ہے۔ اس اشاعتی ادارے نے بھی اندازہ نہیں لگایا کہ اپنے جاری کردہ خط سے وہ فہمیدہ ریاض کو کھائی میں دھکیل رہے ہیں۔ شرمندگی اور افسوس کے بجائے وہ نہایت ڈھنائی کے ساتھ اپنا ڈھول بجاتے پہنچ گئے۔ افسوس کے عالم میں ہاتھ ملتے رہنے سے اب کوئی فائدہ نہیں لیکن بار بار خیال آتا ہے کہ فہمیدہ ریاض کی بیماری کی خبر عام ہو گئی تھی۔ یہ تھوڑے دنوں کی یا اچانک صدمے کی بات نہیں تھی، یہ ایک پورے عرصے پر محیط تھی۔ کسی سرکاری ادارے نے اتنی بڑی

لکھنے والی کا نام بھی نہ لیا۔ ایک سے ایک ادارے موجود تھے، جن میں سے بعض کے ساتھ فہمیدہ ریاض کا تعلق بھی رہا تھا۔ حکومت میں اور حکومت سے باہر بہت سے افراد ان کو جانتے تھے۔ اہم شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سیاست کے حوالے سے بھی قابل احترام شخصیت رہی ہیں۔ انھوں نے جابر اور آمر حکم رانوں سے ٹکر لی۔ عوامی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ پھر اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کی۔ اپنی زندگی اور دن رات کے سکون کو داؤ پر لگا دیا۔ انھوں نے جو کردار ادا کیا، اس کو قومی سطح پر خراج تحسین پیش کیا جانا چاہیے تھا۔ مگر فہمیدہ ریاض کو جیتے جی فراموش کر دیا گیا۔ مِنّت سے معافی تو نہیں منگوائی گئی مگر بولی لگانے والے آن پہنچے۔

مگر میں شہر والوں کے ہاتھوں پر ان کا لہو کیوں تلاش کروں؟ شرمندگی اور ندامت تو مجھے اپنے آپ سے ہے کہ میری آنکھوں کے سامنے سب کچھ ہو رہا تھا اور میں سمجھتے ہوئے بھی نہ سمجھ سکا۔ وہ کتنی بار محبت سے بلاتی تھیں، میں آنا کانی کر جاتا۔ وہ کہتی تھیں کہ اب زندہ نہیں رہنا چاہتی ہیں۔ کیا میں اس کو شاعرانہ ادا سمجھتا رہا؟ فون نہیں رہا تھا تو وہ نجمہ کے فون سے رابطے میں رہتی تھیں۔ آخری بار لاہور جانے سے پہلے فون پر بات ہوئی تو انھوں نے کہا، کراچی واپس آنے کے بعد یونیورسٹی میں میرے طالب علموں سے ملاقات بھی کریں گی جس کا بہت دنوں سے انتظار ہو رہا تھا۔ انھوں نے لاہور ہی سے کہا، کسی طرح مجھے واپس بلوا لو، میں کراچی آنا چاہتی ہوں۔

انہی دنوں کراچی میں ہونے والی ایک عالمی کانفرنس میں ان کا نام دیکھا تو میں نے پوچھا، کب آ رہی ہیں۔ ان کو اس کانفرنس کی خبر تک نہ تھی۔ ان کا نام دے دیا گیا مگر بُلاوا بھیجنے یا سفر کا انتظام کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی۔ اس دوران خبر آ گئی اور خود شریک ہونے کے بجائے فہمیدہ ریاض اس کانفرنس میں نہیں تو اگلے ادبی اجتماعات میں تعزیتی قرارداد بن کر شامل ہو گئیں۔

پچھتاوے وہ ہمارے لیے چھوڑ گئیں اور خود جرأت اندانہ کی مثال قائم کر گئیں۔ جنگل کے درندے ان کا لعلِ درخشاں دل چبا گئے مگر فہمیدہ ریاض کی لازوال تحریر دیر تک گونجتی رہے گی...

وہ سیر شکم / ہونٹوں پہ زبانیں پھیریں گے / اور ان کی بے عصیاں آنکھوں میں چمکے گی

تم شاید جس کو کہہ نہ سکو، وہ سچائی / یہ لاش ہے ایسی عورت کی / جو اپنی کہنی کہہ گزری

تا عمر ہرگز نہ پچھتائی۔

فہمیدہ ریاض کو خراجِ تحسین ان ہی کے الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔

یہ کیسی امر بیل لپٹی دل سے:

ایک طویل عرصے سے فہمیدہ ریاض بیماریوں کا چلتا پھرتا مجموعہ بنی ہوئی تھیں۔ مگر وہ نامساعد حالات اور ازلی جدوجہد میں اس طرح جُتی ہوئی تھیں کہ کسی کو یاد نہ رہتا وہ کس قدر بیمار ہیں۔ یہاں تک کہ خود ان کو بھی نہیں۔

ذیابیٹس بہت بڑھ گیا تھا۔ ہائپر ٹینشن کے بعد دل کے والو کے مسائل، تھائرائڈ کی خرابی۔ پھر وہ آخری مرض جو پکڑ میں نہیں آتا تھا۔ سگریٹ بے تحاشہ پیتی تھیں، ایک ڈاکٹر نے کہا پھیپھڑے کا سرطان ہے۔ فہمیدہ ریاض نے بائیوپسی کرانے سے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ ایک ڈاکٹر نے ٹی بی کا علاج شروع کروا دیا۔ پھر یہ اندازہ لگایا گیا کہ Auto-Immune Disease ہے۔ اب فہمیدہ ریاض کو جستجو ہوئی کہ یہ کس چڑیا کا نام ہے۔ آدھا جسم باقی آدھے جسم کے خلاف لڑ رہا ہے، انھوں نے مجھے اطلاع دی۔

اس دوران "دی نیویورکر" میں آٹو امیون بیماریوں کے بارے میں ایک خاتون کا لکھا ہوا دل چسپ مضمون پڑھنے کو ملا تو میں اس کا پرنٹ آوٹ فہمیدہ ریاض کے لیے لے کر گیا۔ مضمون میں یہ شکوہ بھی تھا کہ جو بیماری آج کل کے ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آتی، اسے آٹو امیون قرار دینے لگتے ہیں، جیسے پہلے اس نوع کی ہر ناقابل تشخیص بیماری کو الرجی کا نام دے دیا جاتا تھا۔ مضمون میں یہ شکایت بھی تھی کہ ڈاکٹر حضرات، خواتین کے جسمانی درد کی تفصیلات سننے سے گریز کرتے ہیں اور درد کی شکایت کو ذہنی خلل کا نام بہت جلدی دے دیتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض کا بھی معاملہ یہ تھا کہ تکالیف کی شدت، بیماری کی Clinical condition سے زیادہ ان کے لیے درد کا احساس تھی، درد جو جابجا سارے جسم میں اٹھتا، اور ان کو نڈھال کر ڈالتا، وہ درد کے مارے کراہنے لگتیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتیں، پھر اپنے ارد گرد دوستوں کو دیکھ کر جیسے سوتے سے چونک پڑتیں اور پوچھتیں، ارے تم کب آئے؟

وہ پھر سے وہی ہنستی، کھلکھلاتی فہمیدہ بن جاتیں۔ مگر یہ وقفے، بہت دیر کے بعد ہونے لگے تھے۔

انھوں نے بائیوپسی کروانے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید اس کی اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان کی تمام رپورٹس ڈاکٹر شہلا نقوی دیکھ چکی تھیں۔ جو ان کی بہت عقیدت مند اور دوست تھیں۔ یہ رپورٹس میری نظر سے بھی گزریں اور ڈاکٹر شہلا سے ان کے بارے میں گفتگو بھی ہوئی۔

فہمیدہ کی بیٹی ویرتا تمام تفصیلات سے آگاہ تھی۔ وہ لاہور میں رہتی ہے مگر برابر رابطے میں تھی۔ وہ خود ڈاکٹر ہے، اس لیے علاج اس کے مشورے اور ہدایات پر چل رہا۔ "یہ ہے" اس نے مجھے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا تھا۔ فہمیدہ اس کی نظر بچا کر سگریٹ پھونکنے لگتیں۔ وہ بچوں کی طرح ضد پر اتر آتی تھیں۔ ان کی تمام تر ناز برداریاں ان کی بہن نجمہ نے اٹھائیں۔ کچھ عرصہ پہلے نجمہ بڑے اندوہ ناک حادثے

سے گزری تھیں جب سپرہائی وے پر گاڑی کی ٹکر سے ان کے شوہر منظور کا انتقال ہو گیا اور وہ خود بازو کی ہڈی تڑوا بیٹھیں۔ فہمیدہ فوراً ان کی دل جوئی کے لیے حیدرآباد گئیں، کچھ دن آنا جانا لگا رہا مگر پھر یہ ہوا کہ نجمہ نے اپنا گھر بار چھوڑ کر فہمیدہ اور ان کے گھر کو سنبھال لیا۔ ظفر آجن بھی فالج کے حملے کے بعد بستر پر پڑے ہوئے تھے۔ دل شکستہ نجمہ بڑی تندہی سے فہمیدہ کی دیکھ بھال میں جُٹ گئیں۔ مگر فہمیدہ اس طرح جینے سے بیزار آچکی تھیں۔ دوائیں کھانے کے بجائے وہ چپکے سے ان کو کوڑے کی ٹوکری میں پھینک دیتی تھیں۔ پہلے گھر تک پھر کمرے میں بستر تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ دواؤں کی وجہ سے بے وقت غنودگی طاری ہو جاتی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے ذہن دوبارہ ہشاش بشاش ہو جاتا اور وہ بتانے لگتیں کہ کیا پڑھ رہی ہیں۔

ان کو احساس ہو رہا تھا کہ زندگی کی مہلت ختم ہو رہی ہے، اس لیے انھوں نے دوستوئیفسکی کو دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا۔ "جرم وسزا" پہلے کے سے جوش و جذبے کے ساتھ دوبارہ پڑھ کر ختم کی اور پڑھنے کے دوران سرہانے رکھے ہوئے رجسٹر میں اس پر نوٹس لکھتی جاتی تھیں، جو "دنیازاد" میں "بیماری کی تحریریں" کے نام سے میں نے شائع کیے۔ مگر کتاب کے اس انتخاب سے میرا جھگڑ پڑنے کو جی چاہتا تھا۔ "طبیعت اتنی خراب ہے اور اس قدر اداس کر دینے والی، دہلا کر رکھ دینے والی کتاب پڑھ رہی ہیں۔" میں بات بے بات اعتراض کرتا اور اصرار کرتا کہ چیخوف پڑھیے۔ ان کے انتقال کے بعد امر سندھو نے مجھے بتایا کہ وہ فہمیدہ ریاض سے ملنے گئیں تو چیخوف کے افسانوں کا مجموعہ ان کے سرہانے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی شاعری کی کلیات بھی دوبارہ پڑھ رہی تھیں۔ "میں تو ان نظموں کے لکھنے میں مصروف رہی۔ لاؤ پڑھ کر دیکھوں میں نے کیسا لکھا ہے۔۔۔" انھوں نے نجمہ کو بتایا۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ لیکن بیماری اور اپنی زندگی کے بارے میں وہ ایک فیصلے تک پہنچ چکی تھیں۔ اس زندگی کے جنجال سے آزاد ہونے کے لیے ان کے طریقے بھی بعض مرتبہ ایسے ہوتے کہ ان پر غصے کے بجائے پیار آتا۔ چناں چہ ایک شام انھوں نے مجھے بتایا کہ زندگی سے نجات پانے کا آسان ترین نسخہ انھوں نے دریافت کر لیا ہے اور اس لیے پانی پینا چھوڑ دیا ہے۔ میں نے ان سے کچھ کہنے کی کوشش کر دیکھی مگر وہ الٹا مجھے سمجھانے لگیں کہ پانی زندگی کے لیے ضروری ہے اور پانی پینا چھوڑ دیا جائے تو اس طرح مرنے میں تکلیف کم سے کم ہوگی۔ لیکن اپنے اس نسخے کو آزمانے کا موقع نہیں ملا کہ نجمہ کے سمجھانے بجھانے پر انھوں نے پانی کا گلاس مُنھ سے لگا لیا۔ پانی حلق سے اُترا اور اپنی آزمائشوں کے ساتھ جاری ہو گئی، ایک بار پھر تیزی سے انجام کی طرف بڑھنے کے لیے۔

بیماری کے علاج سے بھی پہلے فہمیدہ بیماری کی تشخیص کے مرحلے سے بھی گزریں جو طویل تھا اور

اپنی جگہ تکلیف دہ بھی۔ پھیپھڑوں کی تکلیف اور کھانسی بخار حد سے بڑھ گیا آغا خان یونیورسٹی کے ڈاکٹروں نے دق (ٹی بی) کا علاج شروع کیا۔ فہمیدہ نے مسلسل کئی مہینے یہ دوائیں کھائیں اور اس کے سائڈ افیکٹ کے طور پر ان کو بے حد قے اور دست لاحق ہو جاتے تھے۔ بہت تکلیف اٹھانے کے باوجود انہوں نے علاج کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ ان کو خوف تھا کہ ان کے ذریعے سے یہ بیماری ویرتا کے بچوں کو منتقل نہ ہو جائے۔ اس لیے وہ پوری طرح ٹھیک ہونا چاہتی تھیں۔ لیکن انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس بیماری کا شائبہ بھی ہے تب تک وہ بچوں سے دور رہیں گی۔ وہ خود لاہور گئیں اور نہ ویرتا کو اس پورے عرصے کراچی آنے دیا۔ اس پر دو ایک لوگوں نے باتیں بنائیں کہ شاید ان بن ہو گئی ہے مگر فہمیدہ نے سینے پر پتھر رکھ کر بچوں کی دوری سہی۔ محبت کی خاطر وہ قربانی بھی دے سکتی تھیں۔

ویرتا کی وساطت سے پھیپھڑے کے امراض کے ماہر ڈاکٹر منصور انصاری اور دماغی، اعصابی امراض کے لیے ڈاکٹر نادر علی سید ان کا علاج کرتے رہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کو polymyositis اور اس کے ساتھ mterst tial luny fbrosis لاحق ہو گیا تھا جس کی وجہ سے پھیپھڑے سکڑ کر رہ گئے تھے۔ pontine myelosis کا معاملہ الگ تھا۔ بیٹھے بٹھائے ایک کے بجائے دو چیزیں نظر آنے لگتی تھیں اور فالج کی سی کیفیت لاحق ہو جاتی تھی جو پھر کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جاتی تھی۔ اس کی وجہ دماغ کے حصے pons میں vasculitis تھا۔ آخری دنوں میں polymyositis سنبھل گیا تھا مگر سانس بہت پھولنے لگی تھی۔ وہ لاہور گئی ہیں تو آکسیجن کی ضرورت پڑتی تھی۔ مگر ویرتا نے بتایا کہ آکسیجن لگا لینے سے وہ سنبھل جاتی ہیں۔ ہنسنے بولنے لگتی ہیں۔ ہنستے مسکراتے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ آخری وقت قریب آن پہنچا اور ویرتا کو ہدایات جاری کرنے لگیں کہ اپنے والد کا خیال رکھے، مسودے اور کتابوں کا کیا کرے۔ موت کے سامنے انہوں نے ہائے توبہ اور واویلا نہیں کیا بلکہ پوری ثابت قدمی سے گئیں۔

بعض دنوں میں یہ کیفیت اتنی شدید ہو جاتی کہ گھر سے نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ انجمن ترقی اردو میں فاطمہ حسن نے ان کے لیے ایک تقریب تہنیت کا اہتمام کیا۔ لندن سے عامر حسین آئے ہوئے تھے جس کی تحریروں کو فہمیدہ بہت پسند کرتی تھیں۔ عامر حسین کے ساتھ مجھے بھی اس تقریب میں گفتگو کرنا تھی۔ فہمیدہ نہ آسکیں اور ان کی غیر حاضری میں ان کے لیے بات کرنا تعزیت کی پیش بندی معلوم ہوا۔

یادوں کا سلسلہ نکلا:

نام آیا تو پھر باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اتنی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں جو شاید ایک بڑی روغنی تصویر

کی تفصیلات ہیں، اپنی جگہ غیر اہم مگر شام پڑے پرندوں کی طرح شور مچاتی ہیں، اپنے درخت پر واپس آنا چاہتی ہیں۔ ان کے شور سے خاموشی ٹوٹ جاتی ہے اور منظر کی یکسانیت بھی۔

یوں ہی بیٹھے بٹھائے یاد آیا۔ سات آٹھ سال پہلے کی بات ہوگی، یا اس سے بھی زیادہ پرانی۔ کسی نجی ٹی وی چینل، غالباً اے آر وائی نے فہمیدہ ریاض کے لیے خراجِ تحسین یعنی ٹی وی والوں کی اس وقت کی زبان میں ٹری بیوٹ ٹو اے لیجنڈ کا اہتمام کیا۔ گفتگو کے شرکا کو شہر کے دور دراز علاقے میں قائم اسٹوڈیو میں لے جایا گیا اور اسٹیج کے پیچھے بٹھا دیا گیا، جہاں فہمیدہ ریاض کو آنا تھا۔ ان کو نہیں بتایا گیا کہ ان کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے کون سے دوست اور واقف کار اس وقت سامنے آئیں گے۔ یوں اس کو ''سرپرائز'' قرار دیا گیا۔ ان میں فاطمہ حسن بھی شامل تھیں اور دو ایک نام بالکل توقع کے عین مطابق تھے مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فہمیدہ ریاض کو خراج عقیدت دینے کے لیے معروف ہدایت کارہ اور اداکارہ سنگیتا بھی بیٹھی ہوئی ہیں۔ ان کی اداکاری سے زیادہ میں ان کی ہدایت میں بننے والی فلم ''مٹھی بھر چاول'' کا مداح ہوں۔ راجندر سنگھ بیدی کے عمدہ ناول پر مبنی یہ فلم نہ صرف اسی ناول پر بننے والی ہندوستانی فلم سے زیادہ اپنے ماحول میں رچی بسی معلوم ہوتی ہے بلکہ اسے پاکستان کی بہترین فلموں میں سے ایک قرار دینا غلط نہ ہوگا۔ ''آپ یہاں کیسے؟'' میں نے اس فلم کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کے بعد ان سے پوچھا۔ باتیں ہوتی رہیں تو سنگیتا نے اردو ادب سے اپنی دل چسپی اور کراچی کے محلّے ناظم آباد میں گزرے ہوئے بچپن کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا۔ اسٹیج پر جانے کے بعد انھوں نے تفصیل سے بتایا کہ ان کے کیریئر کا آغاز تھا۔ فلموں میں کام کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور اشتہار اس وقت ایک نیا ذریعہ بن کر اہمیت حاصل کر رہے تھے۔ فہمیدہ ریاض لندن سے فلم بنانے کی تربیت لے کر کراچی آئی تھیں اور ایک اشتہار ساز ادارے میں کام کرنے لگی تھیں۔ نوعمر سنگیتا پر فلمایا جانے والا اشتہار فہمیدہ کے ذہن کی اختراع تھا جس میں سنگیتا بال کھولے، گھوڑے کی پیٹھ پر سوار، سمندر کنارے موجوں کے ساتھ ساتھ اُڑتی ہوئی چلی آتی ہیں۔ مجھے یہ اشتہار آج بھی یاد ہے۔ فلم بندی کی تکنیک بہت نفیس اور پیچیدہ ہو چکی ہے مگر اس اشتہار میں ایک عجیب دل کشی تھی... موسیقی کی لے تیز ہوتی ہے، لہریں اٹھتی ہیں اور ان کے سامنے سے سنگیتا گھوڑا دوڑاتی ہوئی آتی ہیں کہ کھلے بال ہوا میں لہرا رہے ہیں، وہ آگے بڑھتی جاتی ہیں یہاں تک کہ کیمرے کے پیچھے سے فہمیدہ ریاض پکار اٹھتی ہیں، ''کٹ!'' پھر پورا منظر ڈزالو ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ فہمیدہ بھی۔

اسٹیج پر ایک بار پھر تاریکی چھا گئی ہے اور ناظرین کی تالیاں ختم ہو چکی ہیں۔

پھر مجھے فہمیدہ ریاض کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ایسی آواز جسے ہزاروں دوسری آوازوں سے الگ پہچانا جا سکتا تھا۔

پہلے پہل ان سے بات کرنے والوں کو لگتا تھا کہ وہ شاید دانت بھینچ کر بول رہی ہیں۔ مگر ان کے لہجے میں ایک ہلکا سا لہریہ تھا جو ایک نسل پہلے تک دور دراز سے کراچی آنے والے زبیری گھرانوں میں الگ سے سنائی دے جاتا تھا۔ ان کے لہجے میں ہلکا سا lilt تھا۔ اس کو پہچانتے ہوئے میرا ایک دوست، جو مجھ سے بڑھ کر فہمیدہ ریاض کا چاہنے اور ماننے والا تھا، ان کی بڑی کامیاب نقل کرتے ہوئے ان کے سامنے ہی مجھ سے اس لہجے میں بات کرتا... "بھئی دیکھو، بات دراصل یہ ہے..." فہمیدہ ریاض ہنسنے لگتی تھیں۔ وہ اس دوست کو "خرگوش" کہا کرتی تھیں کیوں کہ وہ ٹک کر نہیں بیٹھتا تھا، ایک جگہ سے پھدک کر دوسری جگہ پہنچ جاتا اور پھر آ گئے... "ارے خرگوش!..." فہمیدہ اس کو ہنس ہنس کر پکارا کرتی تھیں۔

گھبراہٹ اور بے چینی تو فہمیدہ کے اپنے مزاج میں بھی بہت تھی۔ صرف یہ بات نہیں کہ مزاج سیمابی تھا بلکہ ایک خوف ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا تھا۔ جیسے کوئی دبے پاؤں پیچھے پیچھے آ رہا ہے، پرچھائیوں میں دبک کر چلتا ہوا۔ وہ کہیں بھی اکیلے جانے سے گھبراتی تھیں اور کسی نہ کسی کو ان کے ساتھ جانا پڑتا کیونکہ وہ بہت اصرار کرتی تھیں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید یہ حکومتِ وقت کی طرف سے نگرانی کا شاخسانہ ہو جو ان کے اندر persecntion کا مستقل احساس پیدا کر گیا جو کسی طرح مندمل نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت ہم ایسے مداحوں کو آزمائش میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی تھا۔ "تم مجھے لے کر میرے ساتھ چلو..." ان کو کسی بھی محفل میں مدعو کرتا تو جانے سے پہلے مجھ سے شرط رکھ دیتی تھیں اور اس عذر کو ماننے کے لیے بھی تیار نہ ہوتی تھیں کہ ان کے گھر تک آنا out of the way پڑ سکتا ہے۔ کراچی میں فاصلوں کو کسی طرح سنبھالنا ممکن ہو سکتا ہے مگر جرمنی کے ایک سفر میں بھی ان کا مطالبہ یہی تھا کہ جہاں جا رہے ہو، مجھے ساتھ لے کر جاؤ۔ برلن میں انتظار صاحب کا آزادی سے گھومنے کا ارادہ تھا اس لیے بڑی ترکیب لڑانے کے بعد ہم نے فہمیدہ ریاض کو چکمہ دیا اور ان کی آنکھ بچا کر نکل کھڑے ہوئے۔ شام کو واپس آئے تو دیکھا ہوٹل کی لابی میں بیٹھی ہوئی فہمیدہ ریاض کافی پی رہی ہیں۔ "کہاں رہے تم لوگ؟" انھوں نے چھوٹتے ہی سوال کیا، جیسے مجھے چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا ہو۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے انتظار صاحب سے فہمیدہ ریاض کی عقیدت بڑھنے لگی۔ انھوں نے اس دوران انتظار صاحب کو پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ ایک دن انھوں نے انکشاف کر کے سب کو حیران کر دیا کہ اس سے پہلے انتظار صاحب کی کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی۔ طالب علمی کے دور میں بھی نہیں کیونکہ

ان کے نظریاتی دوست ایسی کتابیں پڑھنے سے روک دیتے تھے۔ اس وقت کی بات دل میں گرہ سی باندھ گئی۔ پھر جب اپنے طور پر پڑھ کر دیکھا تو مزہ آیا۔ انتظار صاحب کی شخصیت ان کو موہنی سی معلوم ہوتی تھی اور انتظار صاحب بھی ان کو دیکھ کر جیسے کھل اُٹھتے تھے۔ ان کی باتوں سے بہت لطف اندوز ہوتے تھے۔ انتظار صاحب کی بیماری کی خبر سُن کر فہمیدہ ریاض نے جو فقرے فیس بک پر لکھے وہ بھلائے نہیں بھولتے۔ فہمیدہ کا صدمہ بہت گہرا تھا۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی وہ ان کو برابر یاد کیے جاتی تھیں۔ انتظار صاحب کے بغیر دنیا میں ایسی کمی ہوگئی تھی جو کسی اور طرح سے بھر کے نہ دیتی تھی۔

خوش گوار باتیں کس مقام پر پہنچ کر تکلیف دہ ہونے لگتی ہیں، فہمیدہ کے ساتھ اس حد فاصل کا امتیاز رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ہنسی مذاق اپنی جگہ، میں نے ان کو گفتگو میں کج بحثی پر اترتے ہوئے اور غصے میں آگ بگولا ہوتے بھی دیکھا ہے۔ پتہ نہیں میں کیسے بچ گیا، ورنہ وہ اکثر دوستوں سے لڑ پڑتی تھیں۔ پھر روٹھ کر من بھی جاتی تھیں۔ ادبی معاملات میں وہ اپنی رائے پر اڑ جاتی تھیں اور ٹس سے مس ہونے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔ لاہور میں فیض گھر کے حوالے سے جشن فیض کی تقریب بہت سے لوگوں کو یاد ہوگی جس میں صدارتی خطبہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے دیا جو بطور خاص ہندوستان سے تشریف لائے تھے۔ فاروقی صاحب کا یہ خطبہ شائع بھی ہو چکا ہے اور فیض کے بارے میں ان کا نقطہ نظر واضح تھا۔ فاروقی صاحب کے خطبے کے بعد فہمیدہ ریاض سوال کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور جوابی تقریر شروع کر دی جو اتنی جارحانہ ہوتی گئی کہ ان کو چُپ کروانا مشکل ہوگیا۔ فاروقی صاحب خود ہی چُپ ہو گئے۔ نیویارک کی ایک ادبی محفل میں، مَیں نے ان کو فرانسس پریچٹ سے الجھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ محمد حسین آزاد سے بات شروع ہوئی اور فہمیدہ ریاض نے ان کے لتے لے ڈالے۔ ہائیڈل برگ میں منعقد ہونے والی کانفرنس میں ایک مقالہ نگار نے پروین شاکر پر مضمون پڑھا اور ان کی ابتدائی شاعری پر فہمیدہ ریاض کے اثرات کا ذکر کیا۔ فہمیدہ ریاض وہیں بھڑک اٹھیں اور مقالہ نگار سے گزر کر مقالے کے موضوع تک کو لتاڑ ڈالا۔ ادبی بحث میں چپ ہوتے فہمیدہ ریاض کو میں نے ایک ہی موقع پر دیکھا ہے۔ تقریب انھوں نے خود کروائی تھی اور عصمت چغتائی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ہاجرہ مسرور کی صدارت رکھی تھی۔ مگر قاسمی صاحب کے بارے میں شکوک او تحفظات کا اظہار بھی کر دیا۔ صدارتی تقریر میں احمد ندیم قاسمی کا نام یہی کا کانٹا بن گیا۔ اس حوالے سے انھوں نے خوب سنائیں اور فہمیدہ ریاض کان دبا کر سنتی رہیں۔ مگر تیر نشانے پر لگ چکا تھا۔
کم سے کم دو مرتبہ فہمیدہ ریاض کو بڑی تندہی سے لڑتے بھی دیکھا ہے۔ وہ اپنے موقف پر ڈٹ گئیں

اور مخالف پر وار کرنے شروع کر دیے، اس بات کی پروا کیے بغیر کہ صاحب خانہ کی محفل کا پورا تاثر برباد ہوا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ تو قریب تھا کہ وہ گتھم گتھا ہو جائیں اور مدمقابل خاتون بھی منھ در منھ سنانے سے باز نہ آرہی تھیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد ان خاتون کو اسلام آباد کی ایک محفل میں فہمیدہ ریاض کے ساتھ ریک ہوتے بھی دیکھا۔ یعنی وہ بھی دیکھا اور یہ بھی دیکھ لیا۔ دونوں رنگ جدا جدا لیکن مرکز ایک۔

اسی طرح فہمیدہ ریاض خوش بھی بہت جلدی ہو جاتی تھیں۔ کئی مرتبہ ایسے شعری مجموعوں پر توصیفی کلمات لکھ دیتی تھیں جن میں شاعری معمولی درجے کی ہوتی تھی۔ ''ارے بھئی، اتنی اچھی تو ہے...'' میں اعتراض کرتا تو وہ کے دفاع پر اتر آتی تھیں۔ لیکن ظاہر ہے، ان سے بحث کرنا بے کار تھا۔ مجموعہ چھپ گیا بمع فہمیدہ ریاض کی توصیفی رائے کے۔ اور یہ حادثہ نہیں تھا، تواتر کے ساتھ ایسا ہوتا رہتا تھا۔

اپنے عزیز دوست حارث خلیق کی طرح میں ان کو کبھی فہمیدہ آپا نہ کہہ سکا۔ وہ فہمیدہ ہی رہیں۔ اب سوچتا ہوں وہ میرے لیے کیا تھیں... دوست، رفیق، قابل احترام شاعر، بڑی بہن، مہربان، مخالف، غم گسار اور غم آشنا ''مادرِ خداوندی، آدمی کی محبوبہ''... زندگی کے غم اور محبت میں شریک... پہلے بہت ہنسی، اس کے بعد بے اندازہ آنسوؤں کا منبع... اب یادوں کا ایک سلسلہ جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتا...

کھڑکی میں چاند: فہمیدہ ریاض کی آخری نظم

اپنی آخری بیماری کے دوران فہمیدہ ریاض نے لکھنا پڑھنا بالکل چھوڑ دیا ہوا، ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ وہ اس طرح لکھتی رہیں جیسے کوئی اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا ہو۔ لکھنے ان کے لیے خود کلامی کی ایک باضابطہ شکل تھا۔ اس دور میں انہوں نے نثر زیادہ لکھی اور شاعری برائے نام، اس کے باوجود یہ ایک نظم سامنے آگئی، جیسے انسان کے اس کائنات سے وابستہ و پیوستہ ہونے کا آخری عہد نامہ ہو۔

ان دنوں بیماری کی بڑھتی ہوئی کیفیت کے سبب فہمیدہ کا گھر سے نکلنا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ گھر میں بھی وہ اپنے کمرے میں رہتی تھیں اور اس میں بھی زیادہ تر اس بستر پر جو کھڑکی کے ساتھ تھا۔ یہ کھڑکی باہر سڑک کی طرف کھلتی تھی رواں دواں شہر کا شور سنائی دیتا۔ فہمیدہ اپنے بستر پر سوتی جاگتی، سوچتی کچھ پڑھتی اور پھر کاغذوں پر کچھ نہ کچھ درج کرتی رہتی تھیں۔ یہ سب چیزیں ان کے سرہانے موجود رہتیں۔ زندگی گزارنے کے لیے باقی ماندہ اسباب!

''آپ یہاں اکیلی لیٹی رہتی ہیں.....'' ان کے کئی دوستوں نے ان سے کہا اور کچھ اس قسم کی بات میں نے بھی کہی جب دیکھا کہ بعض دنوں میں ان کی طبیعت بہتر ہوتی ہے۔ دفتر جانا زبردستی چھوٹ گیا

تھا اور فہمیدہ کا خیال تھا کہ اگر وہ باقاعدہ تیار ہو کر گھر سے نکلیں اور اپنے پرانے معمول کے مطابق لکھنے پڑھنے کا کام کریں تو وہ اپنے آپ کو صحت یاب ہوتے محسوس کر سکیں گی۔ لیکن اندر ہی اندر ان کو اصل حقیقت کا احساس بھی تھا۔ ایسے ہی تقاضوں کا جواب انہوں نے اس نظم میں دے دیا اور دوستوں کو بتا دیا کہ کوئی انہیں اکیلا نہ سمجھے۔ چاند کے ہوتے ہوئے اور دنیا کی آوازیں سنتے ہوئے وہ بھلا اکیلی کیسے ہو سکتی ہیں؟

سبز رنگ کے ایک رجسٹر میں دوستوئیفسکی کے بارے میں اپنے نوٹس لکھتی جا رہی تھیں جس کی کتاب انہوں نے بڑے جوش سے پڑھنا شروع کر دی تھی۔ اس کتاب کو دوبارہ پورا کر کے دم لیا، اس رجسٹر کے دوسرے صفحے پر انہوں نے "بیماری کی تحریر" کا عنوان قائم کر کے لکھنا شروع کیا۔ اس صفحے پر

اگست

فہمیدہ ریاض کو

اس تحریر کا بڑا حصہ مکمل ہو چکا تھا اور ان کے زیر ہدایت "دنیا زاد" میں شائع ہوا۔ یہ رجسٹر ان کے ساتھ چلتا رہا۔ آگ کا دریا، کیشور رما کی کتاب اور ایک جاپانی ناول کے بارے میں نوٹس اس کے آگے لکھے گئے۔ ان پر تاریخ درج نہیں ہے۔ اس کے بعد متفرق تحریریں ہیں... جن میں روزنامچہ کے انداز کے اندراج بھی ہیں اور ایک کہانی بھی۔ ان ہی کے درمیان، یہ افسانہ لکھنے کے فوراً بعد اسی صفحے کے وسط میں نظم درج ہے "کھڑکی میں چاند" اور اس کے آگے لکھا ہے۔

اس کے بعد یہ نظم اسی طرح درج ہے۔ مگر اس میں ترمیم بھی ہوئی ہے۔ چوتھا مصرعہ تب مجھے دکھائی دیتا ہے کے بجائے تب مجھے دکھائی پڑتا ہے اور پانچویں مصرعے کو کھڑکی میں چاند جھلکتا ہے کہ بجائے کھڑکی میں چاند چاند چمکتا ہے کہ دیا گیا ہے۔ ایک مصرعہ کاٹ دیا گیا ہے۔ آخر میں "میں نہیں اکیلی دنیا میں" کے بعد یہ سطریں ہیں جو لکھ کر کاٹ دی گئی ہیں:

اور اب تو ایسے عالم میں\
عیسیٰ مجھ کو یاد آتا ہے\
ننھا جو نواسا ہے میرا\
دل خوشی سے جھوم کے گاتا ہے

یہ آخری سطریں نظم کی آخری شکل میں موجود نہیں ہیں جو انہوں نے اپنی بہن نجمہ کے کہنے پر لکھ لی تھیں اور پھر اسی طرح اپنی دوست نائلہ محمود کو سنائی جنہوں نے اسے ٹیلی فون پر ریکارڈ کر لیا۔ یہ ان کے لاہور جانے سے چند دن پہلے کی بات ہے۔ یہ ریکارڈنگ نائلہ محمود نے کئی دوستوں کو ارسال کی اور

آغا خان یونیورسٹی میں منعقدہ تعزیتی اجلاس کے خاتمے پر میں نے وہاں سنوائی۔

اس رکارڈنگ کا ذکر اس لیے تفصیل سے کر رہا ہوں کہ یہ فہمیدہ کی اپنی آواز میں ہے۔ نظم کے بعد اس مخصوص ہنسی کا تھوڑا سا حصہ بھی رکارڈنگ میں آگیا ہے جس نے مرتے دم تک فہمیدہ کا ساتھ نہ چھوڑا۔ فہمیدہ ریاض کی ایک قابل احترام دوست نے کسی ایسی ہی تعزیتی محفل میں شد و مد سے کہا کہ یہ فہمیدہ کی آخری نظم نہیں ہے بلکہ بہت پہلے چھپ چکی ہے۔ فہمیدہ کے ایسے سب خیر خواہ دوستوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اور کچھ نہیں تو فہمیدہ کی شائع شدہ تحریریں، کتابیں پڑھ کے تو دیکھیں۔ یہ نظم فہمیدہ کی تحریر اور آواز دونوں طرح سے محفوظ ہے، اور دنیا سے ان کے گہرے تعلق کو بیان کر رہی ہے۔

فہمیدہ ریاض نے آخری بیاض کے پہلے صفحے پر اسی قلم سے، جس سے یہ نظم لکھی گئی تھی۔ بیماری کی تحریر میں کاٹ کر کھڑکی میں چاند لکھ دیا۔ اس کے اگلے صفحے پر بیماری کی تحریریں ذیلی عنوان بن گیا ہے اور اس کے اوپر دو سطروں میں درج ہے: فہمیدہ ریاض کی کھڑکی میں چاند۔

بہت عرصہ پہلے انہوں نے ایک نظم کے عنوان میں سوال کیا تھا: کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے؟ اپنے سوال کا جواب انہوں نے خود دے دیا۔

■■

نجمہ رحمانی

زندہ بہاریں

۲۰۱۸ میں عالمی اردو کانفرنس، کراچی، کا دعوت نامہ موصول ہوا تو اسے قبول کرتے ہوئے ذہن میں ایک روشن خیال یہ ضرور تھا کہ سرحد پار کے جن ادیبوں سے ملنے کا اشتیاق ہمیشہ رہتا ہے اور موقع کم کم ہی ملتا ہے، ان سے تفصیلی ملاقات کا یہ بہترین موقع ہوگا۔ دورانِ سفر ایک بعد ایک نام اپنے چہروں اور تحریروں کے ساتھ ذہن کے پردے پر ابھرتے رہے۔ کشور ناہید- جن سے ہندوستان بس یوں ہی سی دو تین ملاقاتیں تھیں۔ یاسمین حمید- جن سے ایک دو بار ای میل کا رابطہ ہوا اور فوراً جواب بھی ملا۔ تنویر انجم- جن سے بس ان کی شاعری کے حوالے ہی تعارف تھا۔ زاہدہ حنا- کہ جب ہندوستان آتی ہیں اپنی مخصوص کاٹ دار شفقت کے ساتھ ملتی ہیں۔ آ۔ف فرخی- جو ایک آدھی ادھوری سی ملاقات اور خان مارکیٹ کے پنیر پکوڑوں کے ساتھ اکثر یاد رہتے ہیں۔ افضال سید- ہندوستان تو کئی بار آئے مگر ان کی آمد کی اطلاع رخصت کے بعد ہی ملی۔ سعید الدین- جن کی نثری نظموں نے ان سے ملنے کا اشتیاق پیدا کیا تھا۔ اور فہمیدہ ریاض- بہت بار ہندوستان آئیں بلکہ ایک بار شعبہ ہندی نے انھیں دلی یونیورسٹی میں مدعو بھی کیا تھا۔ شعبہ اردو کو یہ توفیق کبھی نہیں ہوئی۔ اپنے معصوم طلبا کو اس قسم کے معتوب ادیبوں اور شاعروں سے دور رکھنا ان کے فرائض منصبی میں سے ایک ہے کہ کہیں یہ وائرس ان کو بھی متاثر نہ کردے۔ جہاں عصمت کے انتقال پر تعزیتی جلسہ صرف اس لئے نہ کیا گیا ہو کہ انھیں دفنانے کے بجائے جلایا گیا تھا وہاں ایک بولڈ خاتون ادیب کی پذیرائی نہ ہونا کچھ ایسا حیران کن بھی نہیں ہے۔ نتیجتاً شعبے سے پروگرام میں شریک ہونے والوں میں شعبہ اردو سے،

میرے سوا شاید ایک آدھ فرد اور ہوگا۔ سامعین سے بھرے ہوئے ہال میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ فہمیدہ ریاض اردو والوں سے کہیں زیادہ غیر اردو داں طبقے میں مقبول ہیں۔ اس مقبولیت کے اسباب میں ان کی احتجاجی شاعری اور اور اس ایکٹوزم کا بھی بڑا رول ہے جس نے یہاں ان کے مداحوں کے ساتھ ٹرولز کا بھی ایک بڑا حلقہ پیدا کیا اور اس کی نشان دہی یوں ہوئی کہ جے این یو، جو کسی زمانے میں اپنی علمی و جمہوری اور لبرل اقدار کے لئے عالمی مقبولیت رکھتا تھا اور اب بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر 'ٹکڑے ٹکڑے گینگ' کے طور پر سرخیوں رہتا ہے، چند برس قبل فہمیدہ ریاض کی ہندوستان آمد پر وہاں کے طلبا نے انھیں اپنے یہاں مدعو کیا ان سے اس مشہور نظم کی فرمائش کی گئی جو ان کی آمد سے قبل ہی یہاں کے ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی تھی۔ نظم کا عنوان تھا "نیا بھارت"۔ جیسے انھوں نے نظم سنانی شروع کی سامعین میں سے ایک 'محب وطن' نے کھڑے ہو کر ہنگامہ کر دیا۔ موصوف کا اعتراض تھا کہ ہم پاکستان جیسے کیسے ہو سکتے۔ غالباً یہ خیال ان کے ذہن پر کسی تازیانے سے کم نہ لگا ہوگا کہ انھیں ایک 'دہشت گرد ملک کی دہشت گرد قوم' سے مماثل قرار دیا جائے اور وہ بھی اسی قوم کی ایک فرد ذریعے، ان کے گھر میں گھس کر۔ سو ان کا ہنگامہ خیز ردعمل جائز و ناجائز کی بحث سے قطع نظر فوری تھا۔ (ہو تو یہ بھی سکتا ہے کہ طے شدہ ہو) وہ تو شکر ہے کہ ان دنوں سوشل میڈیا کا وجود نہیں تھا، ورنہ اس قسم کی ادبی جسارت کی سزا کے طور پر ان کی تکا بوٹی سوشل میڈیا پر ہی کر دی جاتی۔ اور کچھ ہوا ہو یا نہ ہوا اس واقعے نے نظم کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ بہرحال بات دہلی یونیورسٹی میں ان کی آمد کی تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ بجائے سوال و جواب کے سیشن کے یہ پورا وقت فہمیدہ کے خطاب کے لئے وقف کر دیا گیا۔ ایک بے لاگ اور سرحدوں سے ماورا فنکار جب بولتا ہے تو کائنات ٹھہر کے سنتی ہے۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے ہال کی خاموشی میں ایک نرم آواز فضا میں تیر رہی تھی۔ سب ہمہ تن گوش تھے۔ پاکستان میں مارشل لاء کا نفاذ اور عوام پر اور فنکاروں پر فوجی حکومت کا عتاب، خود فہمیدہ ریاض کی جلا وطنی اور ہندوستان میں ان کے قیام کے سات برس۔ بڑی سبھتا سے کہانی چلتی رہی، ہم سنتے رہے اور وقت گزر گیا۔ یوں یہ ملاقات کچھ ملاقات سی نہ تھی۔ سو اب جو یہ موقع ملا تو ناموں کی فہرست میں جلی حرفوں میں یہ نام بھی شامل کر لیا۔

فیس بک سے دور رہنے کا ایک نقصان یہ ہے کہ اب وہ خبریں جو جنگل کی آگ کی طرح منٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل جاتی ہیں ہم جیسے فیس بک بیزار لوگوں تک پہنچنے میں انھیں بعض اوقات کئی دن لگ جاتے ہیں اور اکثر اوقات تو پہنچ ہی نہیں پاتیں۔ سو پاکستان پہنچنے پر جو پہلی اطلاع ملی وہ ان کی طویل بیماری اور ہسپتال میں داخل ہونے کی تھی۔ پھر بھی یہ اندازہ نہ تھا کہ

اگلے ہی دن ان کے آخری سفر کی روانگی کی خبر مل جائے گی۔ دہلی میں وہ نا ملاقات سی ملاقات پھر کبھی مکمل نہ ہو سکی۔ کانفرنس کا افتتاحی اجلاس رقص و موسیقی کے بجائے فہمیدہ ریاض کی تعزیتی مجلس میں بدل گیا۔ ان کے نکتہ چیں چاہے جو کہیں مگر ان کی مقبولیت میں وہاں بھی کوئی کمی نہیں پائی۔ فاطمہ حسن تو اسی دن آخری رسومات میں شمولیت کے لئے لاہور چلی گئیں مگر دیگر لوگ بھی اس خبر ایسے افسردہ تھے کہ کانفرنس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بہرحال جوں توں کر کے کانفرنس اپنے اختتام کو پہنچیا ور دل میں ان سے نہ مل پانے کی خلش ہمیشہ کے لئے رہ گئی۔

شائقین ادب فہمیدہ ریاض کی شاعری کی گرویدہ تو ہمیشہ سے تھے۔ مگر گذشتہ چند برسوں میں انھوں نے شاعری کے ساتھ بلکہ شاید شاعری سے زیادہ توجہ نثر پر، اور نثر میں بھی افسانے پر کی، تو یہاں بھی ان کی تخلیقات کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ "دھنو کو چٹھی ملی" اور سفید گلابی کبوتر ہندوستان کے اردو رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ اس کے سوا خطِ مرموز کے عنوان سے انکا افسانوی مجموعہ بھی ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکا تھا۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا شاعری سے ان کا دل بھر گیا تھا۔ شاعری کی اپنی حدیں ہوتی ہیں۔ غزل کی تنگ دامانی سے گھبرا کر نظم کا دامن تھامنے والوں کو بالاخر یہ صحرا بھی کم پڑ گیا۔ سو دشتِ امکان کا اگلا قدم افسانہ ہی ٹھہرا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فکشن میں واقعات کی بُنت تفصیل کی گنجائش پیدا کر دیتی ہے۔ فہمیدہ کی انسان دوستی، حاشیے پر کھڑے انسانوں اور خصوصاً اپنی ہم جنسوں کے تئیں ان کے جذبات و خیالات افسانے میں بھی اسی شدت کے ساتھ بیان کیے گئے۔ اپنے ادبی سفر میں انھوں نے اچانک رخ بدل کر اس نئے راستے کا انتخاب کیوں کیا، اس کا جواب تو شاید ان کے احباب اور ادبی سفر کے رفیق ہی دے پائیں مگر اس نئی صنف میں طبع آزمائی نے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہی کیا۔

اس ضمن میں ان کے طویل طویل سفر نامے 'زندہ بہار لین' کا ذکر دوستوں سے سن چکی تھی۔ آپ چاہیں تو اسے ناولٹ، مختصر ناول یا سفر نامہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کانفرنس ہال کے باہر بک اسٹالوں پر کتابوں کی تلاش کرتے ہوئے۔ ایک عنوان پر نظر ٹھہر گئی۔ 'ہم لوگ' مصنف فہمیدہ ریاض۔ میں نے لپک کر کتاب اٹھالی۔ اس کتاب میں، 'زندہ بہار لین' کے ساتھ 'گوداوری' اور 'کراچی' کے عنوان سے مزید دو تخلیقات بھی شامل تھیں جن کا تعلق جن کا تعلق پاکستان اور ہندوستان سے ہے۔ اس طرح برصغیر کی یہ تثلیث، جو کبھی ہندوستان تھا، مکمل ہوتی ہے۔ بہت پہلے ابراہیم جلیس نے 'دو ملک ایک کہانی' کے عنوان سے رپورتاژ لکھا تھا۔ یہ تین ملکوں کی تین کہانیاں ہیں۔ کیا واقعی تین کہانیاں ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں یہاں بھی کہانی ایک ہی ہو، بس تین ہونے کا وہم ہو۔

یہ سطور لکھ ہی رہی تھی کہ ملک ایک نئی صورتِ حال سے دو چار ہوا۔ سنا کہ حاکمانِ وقت کے دلوں میں مخصوص ہمسایہ ملکوں کی مخصوص اقلیتوں کے لئے دردمندی کے جذبات اس طور ابھرے کہ انھوں اپنی ٹائم مشین ایجاد کر ۱۹۴۷ کی غلطیوں کی تصیح کا عزم کرلیا۔ اندرونِ ملک اقلیتوں نے خوف اور حیرت سے سنا اور قلم گنگ سا رہ گیا۔ تو کیا ۱۹۴۷ دوہرایا جائے گا؟ سوال سرگوشیوں میں ہے اور جواب احتجاجی نعروں میں۔ کیا یہ نعرے کوئی تاریخ رقم کر پائیں گے؟ آنچلوں کے پرچم، بازاروں میں لہرا رہے ہیں۔ پاؤں دہلیزوں کو پار کر کے آزاد ہندوستان کے سب سے بڑے احتجاج کی رہنمائی کر رہے ہیں۔

دست افشاں چلو مست و رقصاں چلو   راہ تکتا ہے سب شہر یاراں چلو

میں ایک خوشگوار حیرت اور امید سے یہ لہراتے پرچم دیکھ رہی ہوں اور اس عورت کو یاد کر رہی ہوں جس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ حقوقِ انسانی کیلئے جدو جہد کرتے گزارا حاکمِ وقت کی اطاعت قبول کرنے کے بجائے جلاوطنی کو ترجیح دی۔ تمام عمر سرحدوں کے درمیان روشنی کی تلاش میں جگنوؤں کا تعاقب کیا۔ کچھ اٹ پٹا سا لگتا ہے ناں! پاکستان کی فہمیدہ ریاض پر بات کرتے کرتے ہندوستان کے احتجاجی مظاہروں پر کاذکر چھیڑ دینا۔ بھلا کیا تعلق ہے دونوں کے درمیان؟ مگر تعلق بہت گہرا ہے۔

دراصل "ہم لوگ" روشنی کی اسی تلاش کی کہانی ہے۔ تین ملک (جو کبھی ایک تھے) اور ایک انسان۔ اس کی تلاش عجیب ہے۔ وہ نفرتوں میں محبتیں ڈھونڈتی ہے۔ تاریخ پیدا کیے سوال مسلسل اس کے تعاقب میں ہیں۔ بزرگوں کے فیصلے، اقتدار کی سفاکی، اور ان کے درمیان کچلتی مخلوق۔ وہ انسانوں کے درمیان ان سوالوں کے جواب کے لئے سرگرداں ہے اور انھیں کا حصہ ہے۔ اسی لئے روداد کا عنوان "ہم لوگ" ہے۔

"ہم لوگ" کا پہلا باب 'زندہ بہار لین' جس پر اس مضمون میں بات کی جائے گی، فہمیدہ ریاض کے بنگلہ دیش کے سفرنامے پر مشتمل ہے۔ جس کا آغاز کے شوق، خوف اور رومان کی ملی جلی کیفیت سے ہوتا ہے۔ لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کے قیام کے تناظر میں اس کیفیت کا طاری ہونا ناگزیر بھی ہے۔

"کسی سیاہ آنکھ کا خواب تھا، دراز گیسوؤں کی خوشبو، بھٹیالی کی پرسوز تان، جو ازل سے ابد تک بہتے پانی پر لہرا رہی تھی، بنگال کے زین العابدین کے موقلم کے سرسراتے خطوط، اور نذرالاسلام، اور ٹیگور کی شاعری آپ بنگال سے کیوں کر نہ پیار کریں گی" ص ۴

پاکستان اور بنگلہ دیش کا خون آلود ماضی بھی اس رومانی تصور پر اثر انداز نہیں ہوسکا۔ یہ رومان ہی تو

ہے جو انسانوں کو ان کی خون اگلتے زمینوں میں بھی امن کے خواب دکھاتا ہے۔ یہ انھیں خوابوں کا سہارا ہے جو انسان کو بدترین صورتِ حال میں بھی بہتر صورتِ حال کے لئے کوشش کرنے کا حوصلہ اور جذبہ دیتا ہے۔ رومان سے عاری دنیا کا تصور ہی ہیبت ناک ہے۔

ایک شوق ہے جو کشاں کشاں کھینچے لئے جاتا ہے۔ اپنوں کا پرایا ہونا اور پھر اس پرائے کے گھر مہمان کی طرح جانا۔ سو اندیشے، ہزار ڈر، تقسیم شدہ گھر کی دیوار کے اس طرف کیسے پذیرائی ہوگی۔ فیض تو 'اتنی مداراتوں کے بعد' بھی اجنبی کی لوٹ آئے تھے۔ اجنبیت کی یہ دیوار کیا اب بھی یونہی کھڑی ہے؟ مگر جذبۂ شوق کی بے اختیاری ہے کہ برسوں سے رکے ہوئے اس سفر کو کرنے کا جو موقع ملا تو جانے کتنی یادیں لہراتی ہوئی دل سے لپٹ گئیں۔

''میں اپنے دل میں ایک پیار بسائے جا رہی تھی۔ ۱۹۶۵ کا پیار۔ کس طرح میں نے اپنے سفر کی تیاری کی تھی۔ برسوں پہلے کس طرح کالج کے زمانے میں بھی بنگالی کے دو جملے سیکھے تھے۔ 'آپ نار شونگے ملاقات کورے بود حسنیتو ہولم' اور دوسرا جملہ تھا 'می تمار بھالو باشی' جو تب بھی ایک اچھا سب کو ہنسا دینے والا جملہ تھا۔ کسی بھی بے تکلف محفل میں میرا پروانۂ راہداری۔ یہ دونوں جملے مجھے آج بھی جوں کے توں یاد تھے۔ ایک لفظ بھی تو نہ بھولا تھا'' ص ۴

سو، مسافر کے اندیشوں، جذبوں اور شوق کے ہم راہ اس کے دو ہم زاد بھی تھے۔ بار سوال کرتے ڈراتے بہلاتے۔ فرد کی نفسیات، خود احتسابی اور اندرون کی لحجہ بدلتی کیفیات کو فہمیدہ ریاض نے ایک خوبصورت تخلیقی روپ دے دیا ہے۔ غالب نے خود کو اپنا غیر تصور کیا تھا تو اس کی وجہ کوئی اور تھی۔ فہمیدہ نے اپنے آپ کو خود سے الگ کھڑا کر کے اپنی حیرانیوں کا تماشا کیا ہے۔ وہ حیرانیاں جو اپنوں کے درمیان غیروں کی طرح کھڑے کسی بھی انسان کو پریشان کر سکتی ہیں۔ جس کا بیان اپنے آپ میں دلچسپ بھی اور خوفناک بھی۔

''ایر پورٹ کی عمارت کے شیشوں سے ناک چپکائے ہزاروں لوگ جھانک رہے تھے۔ یہ مجمع دم کے دم میں اس کی آنکھوں کے سامنے خطرناک مجرموں کے انبوہ میں تبدیل ہو رہا تھا۔ گھبرا کر اس نے تقریباً تمام اشخاص سے اپنا مسئلہ بیان کرنا شروع کیا۔ ہر شخص نے تسلی دیا اور بحفاظت صحیح جگہ پہنچانے کی پیش کش کی اور ایسا کرتے ہی کسی جادو سے میزبان مددگار کے بجائے مشکوک ممکنہ قاتل میں بدلتا گیا سامان لے کر باہر کے دروازے کی جانب وہ اس طرح جا رہی تھی جیسے قربانی کا جانور مذبح کی سمت جاتا ہوگا۔ اس نے بہر حال یہ طے کر لیا کہ وہ فوری مدد کے لئے پی آئی اے کے عملے سے رابطہ کرے گی۔ وہی لوگ اس کی حفاظت

کریں گے کیونکہ وہ پاکستانی ہیں اور اردو بولتے ہیں لہٰذا وہ اسے قتل نہیں کر سکتے۔" ص ۶
اجنبیوں کے درمیان کھڑے کسی بھی شخص کے لئے اس صورتِ حال سے دو چار ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔غیر معمولی ہے اس اعتبار کا ختم ہو جانا اور اس بنیاد کا ہل جانا جس نے پہلی تقسیم کے دوران ایک دوسرے کے درمیان ایک ربط قائم کیا تھا۔یا شاید وہ ربط بھی ایک واہمہ تھا اور وہ اعتبار کبھی قائم ہی نہ ہوا تھا۔یا شاید وہ ایک سازش تھی انسانوں کی قسمت لکھنے والے اس چھوٹے سے گروہ کی جو جس کے سامنے اپنے مفادات کے سوا کچھ نہ تھا۔یا شاید وہ ایک خوش فہمی تھی جو مذہب کو قومیت پر مقدم جاننے سے پیدا ہوئی تھی۔وہ واہمے،وہ سازشیں،وہ خوش فہمیاں، جن کے نتائج برصغیر کے انسان آج تک بھگت رہے ہیں۔ماضی کے وہ جن بار بار بوتل سے نکل کر کبھی سی فرد اور کبھی کسی قوم کے سامنے آکھڑے ہوتے ہیں۔ہم نے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا۔لسانی اور تہذیبی بنیادوں پر تقسیم ہوئے ملک میں پہلا قدم رکھتے ہوئے اس خوف کے حصار میں گھر جانا اس لئے بھی غیر معمولی نہیں ہے،کہ سرحدوں کے کھینچے جانے کے پُرتشدد عمل نے اجتماعی لاشعور میں گھس کر خوف کا ایک ایسا ہیولا تیار کیا ہے۔جو مختلف شکلوں میں آکر بار بار ڈراتا ہے۔مجھے یاد ہے اٹاری بارڈر سے باہر نکل کر جب میں نے لاہور میں قدم رکھا تو وہ بارہ ربیع الاول کا دن تھا۔باہر تحریک لبیک کے رضا کاروں اور عوام کا بہت بڑا جلوس تھا۔کھانے پیکٹ اچھالے جا رہے تھے اور ٹرکوں پر بہت سے نوجوان اور بچے جو سماج کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جن کی رسائی تعلیم اور بہتر روزگار تک نہیں ہے،فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔لیکن ان نعروں میں عقیدت کا وہ عنصر مفقود تھا جس کا تعلق روحانیت سے ہے بلکہ ایک قسم کی جارحیت تھی۔ویسی ہی جارحیت جیسی ہندوستان میں گذشتہ چند برسوں سے سننے کو مل رہی ہے،یہاں کے مذہبی نعروں میں سن رہی ہوں۔دل میں ایک خوف ابھرا،ویسا ہی خوف جیسا اپنے یہاں ان بھرے ہوئے ٹرکوں کو دیکھ کر ہوتا ہے جو سرسوتی پوجا کے موقعے جلوس کی شکل میں نکلتے ہیں اور جن میں سیکڑوں بے روزگار نوجوان، بچے چہروں پر اور کپڑوں پر رنگ ملے،ہاتھوں میں جھنڈے لئے جارحانہ آواز میں نعرے لگاتے گزرتے ہیں۔کتنی مماثلت ہے ان دونوں میں۔یہ خوف جو میرے دل میں پیدا ہوا،ایک اقلیت کا خوف تھا جو سرحد کے اس طرف کی اکثریت ہے مگر غیر ملکی ہے۔کہیں دو اقلیتیں ایک دوسرے کے خوف کی شریک تھیں۔تاریخ نے بار بار ثابت کیا ہے کہ اقلیت ،ہمیشہ اقلیت ہی ہوتی ہے خواہ اس کی بنیاد مذہبی ہو لسانی ہو یا نسلی ہو۔'زندہ بہار' کے اس اقتباس کو پڑھتے ہوئے ایک مذہبی اقلیت نے لسانی اقلیت کے اس خوف کی نفسیات کو سمجھا اور محسوس کیا۔شاید مجھے یہ تفریق بھی نہیں کرنی چاہیے۔بات دور نکل گئی مگر شاید جو کہنا وہ کہہ نہیں پائی۔بہر حال خوف کے اس ماحول میں

فہمیدہ کو اگر کہیں تھوڑا سہارا دکھائی دیا تو ان کی ہم جنس، یعنی عورت کا عورت پر اعتبار...

''پاکستانیوں کے سوا ایک اور سہارا ہو سکتا تھا، جس سے پوری مدد کا یقین رکھ سکتی تھی، کوئی دوسری عورت۔ وہ ہرگز اسے قتل نہ کرے گی، نہ ہی ممکنہ زیادتی والی کوئی بات ہو سکتی ہے۔ جو بعد میں اسے قتل بھی کر دے۔ وہی اسے یقیناً سہی راستہ بتائے گی۔ سو اس نے ایسا ہی کیا'' ص ۶

حقوق انسانی کے ساتھ برصغیر کی تانیثی تحریکوں کی نمائندہ آواز کا اپنی ہم صنف پر اعتبار خوش کن تو ہو سکتا ہے مگر مستحکم نہیں ہے۔ ہم نے تو اپنے ملک اور ارد گرد کی دنیا میں اس اعتبار کو جانے کتنی بار لٹتے دیکھا ہے۔ ہر بار یہی ثابت ہوتا ہے کہ تعصب اور نفرت رشتے نہیں گروہ بناتے ہیں، ہم صرف ایک گروہ ہیں۔ بھیڑیوں کا ایک ایسا گروہ جو موقع ملتے ہی ایک دوسرے کو پھاڑ کھاتے ہیں۔ ورنہ ایک ملک کی سربراہ، اپنے ملک کی مظلوم اقلیت کو بچانے کے بجائے، عالمی برادری کے سامنے اپنی فوج کا دفاع کرتی نظر نہ آتی۔ طاقت اور اکثریت کے سامنے صنفی شناخت ثانوی درجے کی چیز ہے۔ بات صنفی بحث میں نہ الجھ جائے اس لئے اس قصے کو یہیں روک کر آگے بڑھتے ہیں۔

''زندہ بہار'' دراصل انسان اور سیاست کے پیچیدہ رشتوں کو سمجھنے کے بجائے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو اپنے قیام کے دوران انھوں نے اسی پیچیدگی کو بار بار بیان کیا ہے۔ بنگالیوں کی مہمان نوازی، ڈھاکہ کلب سے میزبان کے گھر تک ہر قدم اور ہر مقام پر سقوط ڈھاکہ کی متشدد یادیں۔ واقعات کو سننا اور بات ہے لیکن ان مقامات پر جا کر انھیں اپنے ذہن میں دوہرانے کا عمل مہمان کو ایک ذہنی کشمکش میں مبتلا رکھتا ہے۔ یہ کشمکش بار بار ماضی کی غلطیوں اور تلخیوں کو معاف کرنے کی تحریک بھی دیتی ہے اور سوال بھی کھڑے کرتی ہے۔

مگر کیا یہ غلطیاں یک طرفہ تھیں؟ معاف کر دینے کی خواہش میں نہاں یہ نکتہ بھی ہے کہ غلطی/غلطیاں یکطرفہ تھیں۔ تو کیا معاف کر دینے کی خواہش، خواہ کتنی بھی معصوم کیوں نہ ہو، اپنی پاک دامنی کی دلیل نہیں بن جاتی۔ اپنے ہی سوالوں سے گھری فہمیدہ اپنے آپ سے یہ سوال کرنے کی جرات کھل کر نہیں کر پائیں۔ بس اشارہ سا کر کے رہ گئیں۔ نیت پر شک کا معاملہ نہیں ہے۔ اپنی تمام تر انسان دوستی کے باوجود ہم سب کہیں نہ کہیں تھوڑے جانبدار تو ضرور ہوتے ہیں۔ جان بوجھ کر نہ سہی انجانے میں ہی سہی۔ جانب داری سے ناانصافی پیدا ہوتی ہے۔ انسان دوست لاشعوری طور پر جانبدار ہونے کے باوجود شعوری ناانصافی نہیں کر پاتے اور دونوں کے درمیان کہیں الجھے رہ جاتے ہیں۔ اس تحریر میں ایک محبت بھری شکایت ہے جو معاف کر دینے پر آمادہ ہے، ان غلطیوں کے لئے، جو یک طرفہ نہیں تھیں۔

”گزری رات اس کے بستر میں ایک ہیولا سویا تھا، یا شاید دو ہیولے تھے۔ایک تو بالکل چپ تھا۔میں نے اس سے کئی بار بار بولتے کیوں نہیں؟ مگر وہ آنکھیں سکیڑے، دور کہیں دیکھتا رہا... کیا آپ ان لوگوں سے بہت نفرت کرتے ہیں؟ انہیں... معاف نہیں کر سکتے؟ وہ خاموش رہا۔

ایک زخمی نظر بھی مجھ پر ڈالی۔مجھے ڈر تھا کہ اگر اس کی چادر اُٹھا کر دیکھا تو آدمی کے بدن کی جگہ مبادا مجھے سلگتے ہوئے انگاروں کا ڈھیر نظر آئے۔

دوسرا ہیولا ٹھاٹھ سے مسکرا رہا تھا، اندھیرے میں آنکھیں چمکاتا ہوا، جوئے بنگلہ، میں نے اس کے ہونٹ چوم کر کہا، اور دونوں کے گلے میں بانہیں ڈالے ساری رات جاگتی رہی“

بنگلہ دیش کی سیاسی شطرنج پر چلنے والے مہرے اور ان مہروں کو چلانے والے شاطروں کا ذکر اس روداد میں بار بار آتا ہے۔ نئے ملک میں سلسلہ وار سیاسی قتل کے پس پشت کون سے عوامل کارفرما تھے، ان کا جواب تلاش کرنا بھیمنفو چکر کو توڑنے کی کوشش ہے۔مگر سیاست اور سماج کی اس تصویر کا غالب رنگ تہذیب ہی ہے۔فنکار اپنے خوابوں میں جیتا ہے اور ان خوابوں کو کھلی آنکھ سے تلاش کرتا ہے۔لسانی بنیاد پر ہونے والی اس تقسیم کے جواز اور خون آلود تاریخ کو غلط ثابت کرنے کی لاشعوری خواہش بنگلہ دیش میں 'زندہ بہار لین' کی تلاش ہے۔سو بنگلہ دیش میں اردو بولنے والوں سے ملاقات اور زندہ بہار لین کا پتا ملنے پر مسرت کا احساس، صرف بیگانے ملک میں اپنے ہم زبانوں سے ملاقات کی خوشی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں یہ خوشی بھی شامل ہے کہ اس خونیں سیلاب میں انسانیت پوری طرح نہیں بکھری۔جو بچا رہ گیا اس نے نئے سرے سے زندگی کی تشکیل کی۔بنگلہ دیش میں اردو زبان اور اس بولنے والوں کا باقی رہ جانا اس خواب کا سچ ہے جو انسان پر انسان کے یقین کو مستحکم کرتا ہے۔سیاہ زمانوں میں اس یقین کی ضرورت انسانوں کو ہمیشہ پڑی ہے۔اور ہمیشہ پڑتی رہے گی۔یہ الگ بات ہے کہ یہ خواب کی یہ تعبیر، خواب دیکھنے والے کی آرزو کے عین مطابق نہ ہو۔

بنگلہ دیش میں بہاری مسلمانوں کا باقی رہ جانا ایک خوش کن بات تو ضرور ہے مگر اس کے بعد....؟

تاریخی ناانصافیاں، تاریخی غلطیاں، تاریخی فیصلے اور تاریخی سانحے اور ان کے درمیان کچلے جانے والے عوام۔جہاں ہیں وہاں کو قبول کرنے میں پس و پیش۔جہاں ہونا تھا وہاں قبول کیے جانے میں حیلے بہانے۔یہ ہے بنگلہ دیشی بہاریوں کی مختصر سی کہانی۔ بہت سے جواز بہت سی مجبوریاں اور ان کے درمیان رواں دواں زندگی۔ایک ہی خطۂ زمین، پہلے ریلے میں انسان اس لئے مارے گئے کہ

ہندو تھے۔ دوسرے جھٹکے میں اس لئے مارے گئے کہ مسلمان تھے مگر ان کی طرح کے مسلمان نہیں تھے۔

وہ عورت جو اپنے ملک میں مذہبی شدت پسندی کی مخالفت کے سبب معتوب ہے۔ اس بدلی ہوئی صورت حال میں خود کو بار بار مسلمان کہلوانے پر مصر ہے۔ کیوں؟...

''اب آپ کے یہاں ہندو پروفیسر ہیں مگر ایک بھی بہاری پروفیسر نہیں... مذہب ایک کافی مضبوط سمبندھن ہوتا ہے پروفیسر خلیق!

یہ جملہ اس نے واقعی ٹوٹے ہوئے دل سے کہا تھا، بنگالیوں کے لئے بہاریوں کو قابل قبول بنانے کی خاطر کوئی بھی جواز جائز ہو سکتا ہے ایسی صورت میں تو مذہب جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ تنکے کا سہارا بن کر مذہب اسے بالکل ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔ وہ اپنے مسلم تشخص پہ خوش تھی اور مُصر بھی'' ص ۲۹

تو ثابت ہوا کبھی کبھی مذہب ضرورت بن جاتا ہے۔ وقت، مقام اور صورتِ حال کے ساتھ ضرورتیں بدلتی ہیں۔ ایک ستائی ہوئی لسانی اقلیت کو اکثریت کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے کسی تیسرے کو مماثلتوں کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ بنگالی اور بہاری آبادی کو اگر کوئی کڑی جوڑ سکتی ہے تو وہ مذہب ہے۔ ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑنے کی سعی کوئی سلسلہ تو قائم کرے گی۔ لیکن کبھی وہ دن بھی آئے گا کہ یہ سلسلہ مذہبی، لسانی، علاقائی، نسلی شناخت کے بجائے انسانی بنیادوں پر قائم ہو؟

پھر سوال یہ بھی ہے کہ کیا یہ کوشش ایک ہی جانب سے ہونی چاہیے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اکثریت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اقلیت کو قبول کرلے۔ تو کیا اپنی بقا اور خود کو اکثریت کے درمیان قابل قبول بنانے کی کوئی کوشش اقلیت کی جانب سے نہ ہو۔ یہ ایک سوال ہے جو دنیا کی تمام اقلیتوں کو اپنے آپ سے پوچھنا ہوگا۔ آگے کچھ کہنے کے بجائے فہمیدہ ریاض کا یہ بیان پڑھ لیجیے جو بنگلہ دیش میں واقع بہاری کیمپ کا منظر ہے۔ دن ہے ۱۶ دسمبر۔ بنگلہ دیش کا یوم آزادی۔ باہر جشن ہے، اور بہاری کیمپ میں...

''کچی دیوار پر قائد اعظم کی تصویر آویزاں تھی، اس کے ساتھ ہی قد آدم سے تین گنا بڑی مرحوم ضیاالحق کی تصویر چسپاں نظر آئی۔

بہاریوں کی اس علی الاعلان وابستگی پر لعنت کی طرح، اس کی اپنی جلاوطنی کا دور گردش کر گیا تھا... آخر اس زبوں حالی میں اس کچی دیوار پر یہ تصویر کیوں لگائی؟ آپ پاکستان جانا چاہتے ہیں؟ کیوں رہتے ہیں آپ ان کیمپوں میں باہر بھی تو رہتے ہیں بہاری... کہاں جائیں

ہم پاکستانی ہیں۔ ہم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہمیں پاکستان لے جایا جائے گا...
کیوں ملیں ہم ان لوگوں سے؟ ان کا ہمارا کچھ بھی ساجھا نہیں، آج دیکھ لیجیے، دوسرے نے کہا' یہ باہر جشن منا رہے ہیں آج کے دن، اور ہم ماتم کر رہے ہیں۔ ان کا جشن کا دن ہے اور ہمارا کفن کا دن ہے" ص ۴۳

الزام در الزام کا ایک ایسا سلسلہ جو ان کڑیوں کو مذہب کے نام پر بھی نہیں جڑنے دے گا۔ دوسری جانب 'جن پہ تکیہ وہی پتے ہوا دینے لگے'،

"کوئی بھی پاکستانی حکومت اگر بہاریوں کو پاکستان لائے گی تو اسے سندھیوں کی جانب سے شدید ردعمل کا سامنا کرنے پڑے گا۔
ضیاالحق... وہ تو یوں بھی کوئی مسئلہ حل کرنے میں دلچسپی نہ رکھتا تھا... وہ بھی بہاریوں کو اسی لئے پاکستان نہ لے گیا" ص ۵۴

ایک اور جملہ بھی پڑھتے چلئے،

"دیکھ لیجیے اب مجھے دیکھیے... میرا دادا پاکستان بناتے ہوئے مارا گیا۔ میرا باپ پاکستان بچاتے ہوئے مارا گیا۔ اور میں... پاکستان کا نام رٹتے رٹتے مرجاؤں گا ص ۷۴

فریبوں کے جال، وعدوں کے خوش نما باغ، ہلاکتیں، اور ہجرتیں بالآخر تاریخ کے صفحوں پہ بکھری کہانیاں رہ جاتی ہیں۔ آئندہ نسلیں ان کہانیوں کو پڑھتی ہوئی بڑی ہوتی ہیں۔ اور دور کہیں اور کسی دوسرے ملک کے دوسرے عوام نئی تاریخوں میں اس پرانی کہانی کے کردار بن کر ابھرتے ہیں۔ ہر سو ایک ہی کہانی وقت اور چہروں کی تبدیلی کیساتھ دوہرائی جاتی ہے۔ شاید دوہرائی جاتی رہے گی۔ ہندوستان، پاکستان، میانمار، بنگلہ دیش اور جانے کتنی زمینیں اس کہانی کو بُنتے اور دوہراتے آج بھی نہیں تھکیں۔ نہ اس کے دیکھنے اور سننے والے اور نہ ان کرداروں کی ڈوریاں ہلانے والوں کے ہاتھ شل ہوئے۔

لیکن ان سب کے درمیان، شکوک وسوسوں اور اندیشوں اور محبت، انسانیت، دردمندی اور خواہشوں اور آرزوؤں کو پالتے انسان۔ ایک دوسرے سے ڈھیروں شکایتیں، بے شمار امید یں باندھے انسان۔ سب کچھ سمجھنے کا دعویٰ کرتے ناسمجھ انسان، کیا نفرتوں کا کوئی جواب ہے؟ وہ کہتی ہیں کہ "نفرتوں کا جواب، اندھی محبت ہے"۔

اندھی محبت کس سے؟ ان سے یا اپنے آپ سے؟ تو کیا اندھی محبت سارے مسائل کا حل ہے؟ تو کیا اس محبت میں سوالوں کی گنجائش ختم کر دی جائے؟ اس اندھی محبت کی کہانی بھی عجیب ہے۔ یہ سوال

اُٹھانا نہیں چاہتی۔ اسی لئے تو ہم ہندوستانیوں، پاکستانیوں، بنگلہ دیشیوں نے خود پر کبھی سوال نہیں اُٹھائے۔ پوچھا نہیں اپنے آپ سے اور ان سے۔ کیوں ہمیں نفرتوں کے سیاہ سمندر میں غرق کردیا گیا؟ آخر سیکڑوں برس ایک ساتھ گزارے تھے ہم نے... اندھی محبت (محبت ؟)۔ اندھ بھگتی۔ محبت سپردگی مانگتی ہے۔ سوال نہ اُٹھاؤ! تو سوال نہیں اُٹھے۔ نہیں! شاید اُٹھے مگر زبان تک نہیں آئے۔ اندھی محبت، استحصال کو جائز قرار دیتی ہے اسی لئے تو ہم اپنی ہر کمزوری اور ناکامی کی ذمہ داری ایک فرضی دشمن پر ڈال کر مطمئن ہوجاتے ہیں یا شاید اپنے آپ سے ڈر جاتے ہیں۔

سوالوں، محبتوں، آرزؤں اور تجسس سے پُر ایک سو اکتیس صفحات پر پھیلی ''زندہ بہار لین'' کی روداد اپنی تخلیقیت اور سجھتا کے ساتھ صرف بنگلہ دیش ہی نہیں پورے برصغیر کی سیاست، سماج، قوم اور فرد کی گتھیوں کو سلجھانے کی ایک خوبصورت کوشش ہے۔ ایک انسان دوست شاعرہ کے قلم سے نکلی ایک جذباتی تحریر، جو قاری کو آخری جملے تک اپنے آپ سے باندھ کر رکھتی ہے۔ اپنی تمامتر وابستگیوں کے باوجود انسانیت کی آفاقی قدروں میں یقین رکھنے والی یہ شاعرہ بار بار لڑکھڑائی اور سنبھلی ہے۔ بیان کے اس توازن نے فہمیدہ ریاض کو کسی ایک جانب لڑھک جانے سے بچالیا ہے۔ ملک کے موجودہ حالات کے تناظر میں بھی فہمیدہ ریاض کی اس تحریر اور بقیہ دو تحریروں کو پڑھنا اہم ہے۔ مجھے اپنے مضمون کی تشنگی کا اعتراف ہے۔ اور یہ اعتراف بھی کہ اس سے اختلاف کی گنجائشیں ہیں۔ ہمارے ارد گرد جو رونما ہو رہا ہے قلم اس سے اجنبی گزر جائے یہ ناممکن ہے۔ مگر جو گزر رہا ہے وہ سب ضابطۂ تحریر میں آجائے یہ بھی ممکن نہیں۔ الفاظ کہیں گم ہیں اور یہ احساس شدید کہ

''ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد''

■■

عمران عاکف خان

فہمیدہ ریاض: قہری چھاؤں کی باسی

اس کے وجود میں بھرے کتنے شرار تھے

پھونک سکتی ہوں دو عالم کے حجاب اے آدمی!
لا مجھے دے دے ترے کوزے میں جتنی آگ ہے!!

اس شعر کے ذکر کے بعد احتجاجی اور مزاحمتی شاعری کے زمرے میں شعبۂ نسواں کے حوالے سے جب بھی بات کی جاتی ہے تو سارا شگفتہ، پروین شاکر، کشور ناہید سے بھی بڑا نام فہمیدہ ریاض کا نکل کر آتا ہے۔ فہمید ریاض کون؟ وہی جو وقت کے آمر اور اس کے ارادوں سے ٹکرا گئیں۔ انھوں نے علم بغاوت اس وقت بلند کیا جب سرزمین پاکستان، جنرل ضیاء الحق کی آمریت اور تاناشاہی سے عبارت تھی۔ عوامی اور آئینی ادارے معطل تھے اور ڈکٹیٹر شپ کے خلاف ہلکی سی آواز بلند کرنا بھی سزائے موت سے کم جرم نہ تھا۔ اس دور میں متعدد ایسے باغی تھے مگر فہمیدہ کا قد ان میں کچھ زیادہ ہی نمایاں تھا۔ ترقی پسند ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فہمیدہ ریاض حقوق انسانی بالخصوص حقوق نسواں کے حساس سماجی شعبے سے بھی وابستہ تھیں۔ ان کا قول: ''میں عورتوں کے حقوق کی علم بردار شاعرہ ہوں'' محض قول یا فکر ہی نہیں بلکہ اسے حقیقت مآب کرنے کے لیے انھوں نے دیگر علائم و انسلاکات کو بھی اپنی شاعری کا سلگتا دہکتا موضوع بنا کر سماج دشمن عناصر اور متشدد طبقات و حکمرانوں کے شبستاں کی خاکستری پر مامور کر دیا۔ ان کے لفظوں سے بادشاہوں کے محل اور ان کے مینار دہلنے لگے۔ وہ وہی لکھتی تھیں، جو محسوس کرتی تھیں۔ اس جرأت فہمیدہ سے جہاں ان کے چہروں پر تیکھے بل

پڑے وہیں وہ چیں بہ جبیں بھی ہو گئے۔ ان کا شعری مجموعہ ''اپنا جرم ثابت ہے'' تو مکمل ضیائی دور اس دور کی ستم زاریوں کا بیان ہے۔

28 جولائی 1942 کو فہمیدہ ریاض میرٹھ میں، ایک علمی و ادبی خانوادے میں پیدا ہوئی جو اس وقت تاج برطانیہ کے زیر تسلط ممالک محروسہ متحدہ میں انگریز کمشنری اور چھاؤنی کے سبب، ہندوستان بھر میں اپنی علاحدہ شناخت رکھتا تھا۔ فہمیدہ کے والد سر ریاض الدین احمد ماہر تعلیم تھے۔ وہ شعبۂ تعلیم سے بھی وابستہ تھے اور جب ملک تقسیم کے دہانے پر پہنچ کر دولخت ہو گیا، وہ اُن دنوں وہیں مقیم تھے اس لیے پورے خاندان کو حیدرآباد، سندھ ہی بلا لیا۔ فہمیدہ کی روایتی تعلیم، گھر میں ہی ہوئی اس کے بعد اعلا تعلیم کے لیے انھیں زبیدہ گورنمنٹ کالج، حیدرآباد میں داخل کر دیا گیا۔ اس کالج کی تعریف وہ خود بی بی سی اردو کو دیے انٹرویو میں یوں کرتی ہیں: ''کالج بڑی اچھی جگہ تھا اور بڑا سا آسمان تھا اس پر۔ خاصا کھلا ہوا تھا اب تو نہ جانے کیسا ہو گیا ہو؟''

زبیدہ ڈگری کالج سے ہی انھوں نے نظمیں لکھنا شروع کر دیا۔ جب وہ پندرہ برس کی ہوئیں تو ان کے انقلابی شراروں میں تیزی آنے لگی جس کا اظہار سب سے پہلے احمد ندیم قاسمی کے شہرۂ آفاق رسالے 'فنون' میں نظر آئے جب احمد ندیم قاسمی نے مجلہ فنون کے دور جدید کے شمارے۔12 کے مئی جون 1965 میں شائع کیا۔ اس میں فہمیدہ کی چار نظمیں شامل کی گئیں ''پتھر مری وفا کا''، ''دل دشمن''، ''تمنا''، ''لوری''—— یہ نظمیں نہیں تھیں بلکہ فہمیدہ ریاض کے اگلے مزاحمتی، انقلابی اور ترقی پسند سفر کے پڑاؤ کا نشان تھیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا جو شرار در شرار تھا۔ متعدد شعری مجموعوں، تراجم، نثر پاروں، ناول ''قلعۂ فراموشی'' اور انقلابی جریدہ ''آواز'' جاری کرنے نیز ایک پر ہنگام زندگی گزارنے کے بعد 22 نومبر 2018 کو لاہور میں انتقال کر نے جانے والی فہمیدہ ریاض اب ہمارے درمیان تو نہیں، مگر کچھ سوال ضرور باقی ہیں۔ فہمیدہ میں یہ شرار کس نے بھرے، فہمیدہ کو مرد سماج، آدمی (مرد) سے کس نے بے زار کیا اور آمرانہ حکمرانی سے حساس کیوں لوہا لیتے ہیں؟ یہ سوالات بجائے خود ایک علاحدہ مضامین کے متقاضی ہیں تاہم اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ فہمیدہ ریاض کی یہ جنت یا دوزخ، خود اُن کی تعمیر کردہ تھی، بغاوت یا مزاحمت کے لیے انھیں کسی نے اُکسایا نہیں تھا، نہ ہی کسی نے تحریک دی تھی۔ بلکہ یہ شعور انھیں پاکستان نے ان سیاسی اور آمرانہ حالات بخش دیا تھا، جن سے مملکت خداداد یا دوسرے لفظوں میں، 'خدا کی بستی' سسک رہی تھی۔ اس وقت اس پھولوں کی جنت میں فیمنزم، سماجی حقوق، مقتدر طبقے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا، باغی افراد پر سرکاری عتاب، انھیں پابند سلاسل کرنا یا ملک بدر کر

دینا، ان کے رسالوں، اخباروں، کتابوں، بیانوں اور خیالوں پر سنسر شپ بٹھا دینا، جیسے کانٹے ابھر آئے تھے جو بدن کے بہ جائے نظریات، افکار، آزادی، فرد کی عزت نفس اور اس کی وجودیت میں چبھ رہے تھے۔ اس وقت ایک فہمیدہ ریاض ہی نہیں تھیں، ایسے بہت سے نام یا شخصیات تھیں جو درد بے اماں سے چیخیں اور اپنا احتجاج درج کیا۔

فہمیدہ ریاض، باغیوں کے طبقے میں اپنی عمر اور وجود کی کمی کے باوجود کچھ زیادہ ہی آگے تھیں۔ جس کا اظہار ان کی نظموں، ان کے فقروں، شعروں، خیالات اور اعمال سے ہوتا ہے۔ ان سب سے قطع نظر وہ فطرت آدمیت اس کے مجرمانہ اور خودساختہ اصولوں پر بھی نقد کیے بغیر نہیں رہتی ہیں۔ جس کے اظہار کے لیے ان کے شرارپاروں میں ''اقلیما'' جیسی نظمیں موجود ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اقلیما / جو ہابیل کی قابیل کی ماں جائی ہے / ماں جائی! / مگر مختلف
مختلف بیچ رانوں کے / اور پستانوں کے ابھار میں / اور اپنے پیٹ کے اندر
اور کوکھ میں / ان سب کی قسمت کیوں ہے / ایک فربہ بھیڑ کے بچے کی قربانی
وہ اپنے بدن کی قیدی / تپتی ہوئی دھوپ میں جلتے / ٹیلے پر کھڑی ہوئی ہے
پتھر پر نقش بنی ہے / اس نقش کو غور سے دیکھو / لمبی ران سے اوپر
ابھرے پستان سے اوپر / پیچیدہ کوکھ سے اوپر / اقلیما کا سر بھی ہے
اللہ کبھی اقلیما سے بھی کلام کرے / اور کچھ پوچھے!

(بدن دریدہ۔ ص: 75-74 لکھنؤ، مکتبہ دین وادب۔ جون 1978)

یہ نظم جہاں آدم زادوں کے کردار و عمل اور ان کی سوچ و فکر کو مہمیز کرتی ہے وہیں ذہن و خیال کی بند کھڑکیاں بھی کھولتی چلی جاتی ہے۔ ہابیل و قابیل کی ماں جائی کے لیے آپسی رنجش، جو بالآخر دنیا کے پہلے قتل پر منتج ہوتی ہے۔ اس سے قبل اس قتل و غارت گری سے بچنے کے لیے معصوم فربہ بھیڑ کے بچے کی پہلی قربانی بھی پیش کی جاتی ہے۔ آسمانوں سے ایک آگ آتی ہے اور اسے کھا جاتی ہے۔ یہ ایسا امر اور سچائی ہے، جس کا نہ انکار کرتے بنتا ہے اور نہ اقرار ہی۔

''اقلیما'' جیسی نظمیں جہاں احتجاج کا استعارہ ہیں، وہیں باوجود جوش و جذبے کے فہمیدہ ریاض نے شاعری کی فنی اور فکری روایات کو نبھایا ہے۔ یہ ان نظموں کی ایک بڑی خصوصیت ہے۔ جس کے سبب ادبی حلقوں میں فہمیدہ کے فکر و فن اور شعر و نثر کو قدر و مقام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پاکستان میں جب آمر، اُن کے پیچھے خاکی کوڑا لے کر بھاگا تو وہ ہندوستان میں پناہ گزین ہو گئیں اور یہاں دلّی / دہلی / نئی دہلی کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا۔ ان کے بعض واقف کاروں نے اسے

ان کی خود ساختہ جلاوطنی بھی کہا ہے۔ بات کوئی بھی ہو، ہندوستان کا قیام اُن کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوا اور ان کے فکر و فن پر اس سے یوں کرنکھا کر آیا کہ ان کے کلام میں ہندو دیومالائی عناصر در آئے، اسی طرح موہوم مفروضوں، متھ ازم جیسے کرشنا کی لیلائیں، سفید گھوڑوں کی بگھی میں سواری، اس پر صوفیانہ اور عارفانہ انداز میں بادلوں کا سایہ فگن ہونا، گوپیوں کی جاں نثاری جدا۔ ہندوستانی روایات اور توہمات، بھارتیہ ناٹیم اور یہاں کے روایتی رقص وکتھک نے فہمیدہ ریاض کی نظموں اور فکروں میں جگہ پائی۔ نیز وہ ان کی نظموں کا زندہ عنوان بنے۔

جب وہ پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے دَور یعنی بے نظیر بھٹو (بے بی) کے وزیر اعظم بننے کے بعد پاکستان واپس لوٹیں تو جاتے جاتے دلّی کو یوں یاد کرتی گئیں۔ دلی کے لیے تحریر کردہ اُن کی شہرۂ آفاق نظم قابل دید بھی ہے اور قابل مطالعہ بھی:

دلّی' تیری چھاؤں۔۔۔

دلّی! تری چھاؤں بڑی قہری / مری پوری کایا پگھل رہی / مجھے گلے لگا کر گلی گلی
دھیرے سے کہے "تو کون ہے ری؟" / میں کون ہوں ماں تری جائی ہوں
پر بھیس نئے سے آئی ہوں / میں رمتی پہنچی اپنوں تک / پر پریت پرائی لائی ہوں
تاریخ کی گھور گپھاؤں میں / شاید پائے پہچان مری / تھا بیچ میں دیس کا پیار گھلا
پردیس میں کیا کیا بیل چڑھی / نس نس میں لہو تو تیرا ہے / پر آنسو میرے اپنے ہیں
ہونٹوں پر رہی تری بولی / پر نین میں سندھ کے سپنے ہیں / من ماٹی جمنا گھاٹ کی تھی
پر سمجھ ذرا اس کی دھڑکن / اس میں کارونجھر کی سسکی / اس میں ہو کے ڈالتا چلتن!
ترے آنگن میٹھا کنواں ہنسے / کیا پھل پائے مرا من روگی / اک ریت نگر سے موہ مرا
بستے ہیں جہاں پیاسے جوگی / ترا مجھ سے کوکھ کا ناتہ ہے / مرے من کی پیڑا جان ذرا
وہ روپ دکھاؤں تجھے کیسے / جس پر سب تن من وار دیا / کیا گیت ہیں وہ کوہیاروں کے
کیا گھائل ان کی بانی ہے / کیا لاج رنگی وہ پھٹی چادر / جو تھر کی تپت نے تانی ہے
وہ گھاؤ گھاؤ تن ان کے / پر نس نس میں اگنی دہکی / وہ باٹ گھری سنگینوں سے
اور جھپٹ شکاری کتوں کی / ہیں جن کے ہاتھ پر انگارے / میں ان بنجاروں کی چیری
ماں ان کے آگے کوس کڑے / اور سر پہ کڑکتی دوپہری / میں بندی باندھوں کی باندی
وہ بندی خانے توڑیں گے۔ / ہے جن ہاتھوں میں ہاتھ دیا / سو ساری سلاخیں موڑیں گے
تو سدا سہاگن ہو ماں ری! / مجھے اپنی توڑ نبھانا ہے / ری دلی چھو کر چرن ترے

مجھ کو واپس مڑ جانا ہے

(سب لعل و گہر ۔کلیات فہمیدہ ریاض ۔ص:62-360، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، 2011)

یہ نظم، ان کی ہندوستان بالخصوص دلّی سے وابستگی کا خراج اور احسان و شکر یہ ادائے گی کی رسم ہے ۔وہ کراچی چلی گئیں تھیں مگر دلّی کے لیے ان کا دل دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ فہمیدہ ریاض، جن کے سینے میں ایک مخصوص معاشرے کے لیے شرار بھرے ہوئے تھے، وہ ہی دلّی کی قہری چھاؤں میں بھی سکون محسوس کرتی تھیں اور تاعمر اس کی کرم فرمائیوں کی شکر گزار رہیں ۔شخصیت کا یہ دوہرا کرب یا دوہرا انداز بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، اسی طرح ان دونوں کو سنبھالے رکھنا، دوسرا کمال ہے ۔فہمیدہ ریاض کی پوری زندگی ان کمالات سے ہی عبارت ہے۔

منابع

بدن دریدہ۔ (بدن دریدہ ۔مکتبہ دین وادب، لکھنؤ۔ جون 1978

بی بی سی اردو نیوز (فہمیدہ ریاض سے ملاقات ۔انٹرویو ۔اشاعت: 15 جنوری 2015)

سب لعل و گہر (کلیات فہمیدہ ریاض) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ 2011

فنون، سہ ماہی، لاہور۔ مدیر احمد ندیم قاسمی، شمارہ نمبر 1۔2، مئی، جون: 1965

Mob:9911657591

شوبی زہرا نقوی

ایک احتجاجی شاعرہ: فہمیدہ ریاض

ہر ذی روح انسان کی ایک خصوصیت یہ ہے کی وہ حساس ہوتا ہے اور اس کا حساس پن ہی اسے آدمی سے انسان بناتا ہے کسی شاعر یا ادیب کی طبیعت میں یہ خوبی بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے کہ وہ عام انسان کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے اور اسی لئے وہ کارخانہ قدرت کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اس کی طبیعت کی یہ خوبی ہی اس کو بڑا بناتی ہے کسی بھی شاعر یا ادیب کی تحریریں اس کی طبیعت کے حساسیت کا ہی نتیجہ ہوتی ہیں ایک شاعر یا ادیب کے لیے صرف کھلی آنکھوں سے معاشرے کا مشاہدہ کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ معاشرے میں سیاسی، سماجی، معاشی اور ثقافتی طور پر پھیلی برائیوں کو پیش کر کے اس کے خلاف احتجاج کرنا بھی ضروری ہے۔ فہمیدہ ریاض ایک ایسی ہی احتجاجی شاعرہ تھیں جنھوں نے اپنے قلم کو خونِ دل میں ڈبوئے رکھا اور ہمیشہ برائیوں سے جدو جہد کرتے ہوئے ظلم اور ناانصافی کے خلاف لکھنے کے لیے اپنا قلم وقف کر دیا۔ انہوں نے صرف قلم کے ذریعہ جدو جہد کی بلکہ ترقی پسندوں کی طرح اپنے خوابوں کی تکمیل کے لیے وہ عملی طور پر احتجاج کرتے ہوئے میدان کارزار میں اتر آئیں۔ اور ان شعراء کی صف میں شامل ہو گئیں جس میں فیض احمد فیضؔ، علی سردار جعفریؔ، کیفی اعظمیؔ اور مخدوم محی الدین کا شمار ہوتا ہے بس فرق یہ ہے کی ان لوگوں نے احتجاج کرتے ہوئے جیل کی سزائیں کاٹیں اور فہمیدہ ریاض نے جلاوطنی کا دکھ اٹھایا۔

فہمیدہ ریاض نے نہ صرف دوسروں کے لیے احتجاج کیا بلکہ وہ زندگی بھر اپنی زندگی سے بھی احتجاج کرتی رہیں، انہوں نے زندگی میں بہت دکھ سہے مصیبتیں اٹھائیں، لیکن وہ ہمت نہیں ہاریں بلکہ انہوں نے بڑے صبر و تحمل اور قناعت و حوصلے کے ساتھ ہر پریشانی کا سامنا کیا۔ فہمیدہ ریاض کی

پیدائش 28 جولائی 1945 کو مغربی یوپی کے تاریخ ساز شہر میرٹھ کے علمی وادبی گھرانے میں ہوئی تھی۔ لیکن والد ریاض احمد خاں کا ٹرانسفر ہوجانے کی وجہ سے ان کو حیدرآباد (سندھ) منتقل ہونا پڑا۔ پھر محض چار سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور ان کی پوری ذمہ داری والدہ حسنہ بیگم کے سر آن پڑی۔ لیکن حسنہ بیگم نے ان کی ایسی پرورش کی کہ ذہین فہمیدہ ریاض محض 15 سال کی عمر میں شاعری کرنے لگیں اور 22 سال کی عمر میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان'' زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انہوں نے سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ایوب خاں کے زمانے (1969-1958) میں نافذ ہونے والے یونیورسٹی آرڈیننس، پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈیننس، فیملی لا آرڈیننس اور ایبڈو کے خلاف طلباء تنظیموں کے ساتھ مل کر بھرپور احتجاج کیا، طلباء یونین پر پابندی کے خلاف قلم اٹھایا اور عملی طور پر پُرجوش تقریر کی۔ پھر 1967ء میں اپنے گھر والوں کی مرضی سے صابر علی ہاشمی سے شادی کرلی لیکن انھوں نے اپنی عرفیت نہیں بدلی اور ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ والد کا نام جوڑے رکھا۔ شوہر کے ساتھ وہ برطانیہ چلی گئیں اور طلاق کے بعد وہ پھر سے پاکستان آگئیں۔ پاکستان میں ہی انہوں نے ایک سندھی قوم پرست ظفر علی اجن سے شادی کرلی اور یہیں سے انہوں نے اپنا ذاتی ادبی مجلہ ''آواز'' نکالنا شروع کیا۔ جس میں ان کے انقلابی نظریات اور حکومت کے غلط رویوں پر صدائے احتجاج بلند کی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ''آواز'' کو ایک مقتدر حلقوں نے ناپسند کیا اور حکومتی احکامات کے تحت مجلہ کی اشاعت کا سلسلہ بند کرادیا گیا اور اس پر چودہ مقدمات درج کیے گئے۔ ان مقدمات میں سے ایک سیکشن 124A بھی تھا جس کے تحت مجلہ کی مجلس ادارت کو سزائے موت بھی ہوسکتی تھی۔ صدر ضیاالحق کی حکومت نے فہمیدہ ریاض اور ان کے شوہر کی گرفتاری کے احکامات صادر کردیے۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے باہر ہی ضمانت کرالی۔ مگر ان کے شوہر کو جیل جانا پڑا اور فہمیدہ ریاض کو کئی سال جلاوطنی جھیلنی پڑی۔

فہمیدہ ریاض نے پسماندہ طبقے کی مستورات کے لیے ایک NGO بھی قائم کی اور وہ مستورات کے حقوق کے لیے ہمیشہ لڑتی رہیں۔ لیکن اس احتجاجی خاتون کی زندگی میں 2007ء میں ایک ایسا وقت آیا جب ان کے بیٹے کبیر علی اجن کی موت نے انھیں نیم جاں کردیا۔ لیکن فہمیدہ ریاض نے وہ وقت بھی صبر کر کے گزارا۔ اس طرح ان کی پوری زندگی دھوپ چھاؤں میں کٹ گئی۔ لیکن ان کے عزم و حوصلے میں کبھی کمی نہیں آئی اور وہ زندگی کے آخری ایام تک احتجاج کرتی رہیں۔ اپنے لیے انہوں نے کہا تھا۔

یارو بس اتنا کرم کرنا / پس مرگ نہ مجھ پہ ستم کرنا / مت کہنا جوشِ خطابت میں
دراصل یہ عورت مومن تھی / مت اٹھنا ثابت کرنے کو ملک و ملت سے وفاداری

مت کوشش کرنا اپنالیں حکام کم از کم لاش ہی

فہمیدہ ریاض کی شاعری سے ان کے احتجاجی مزاج کا پتہ چلتا ہے۔انہوں نے غزل کے بجائے نظموں کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا اور ان کا پہلا شعری مجموعہ ''پتھر کی زبان 1967ء'' میں منظر عام پر آیا جس میں نرم لہجے اور لطیف احساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔لیکن بہت جلد فہمیدہ ریاض نے رومانوی انداز کو ترک کر کے پر اثر ہنگامہ خیز شاعری کو اپنا شعار بنایا اور اس کے بعد ان کے مجموعے ''بدن دریدہ 1973ء''،''دھوپ 1975ء''،''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے 1981ء''،''ہمرکاب''،''اپنا جرم ثابت ہے'' اور ''آدمی کی زندگی'' وغیرہ شعری مجموعے منظر عام پر آئے۔ان مجموعوں کی نظموں میں ایک احتجاجی عورت کی آواز گونجتی ہوئی سنائی دیتی ہے جو اپنا حق لینا جانتی ہے اور نہ ملنے پر چھیننا بھی جانتی ہے۔انہوں نے اپنی نظموں کے ذریعے معاشرے میں عورتوں کی خستہ حالت کو دیکھ کر اس کے خلاف آواز اٹھائی۔وہ عورتوں کو معاشرے میں وہی درجہ دلوانا چاہتی تھیں جو مردوں کا ہے۔ان کے مجموعے ''بدن دریدہ'' کی نظمیں اس بات کی شاہد ہیں کہ فہمیدہ ریاض نے عورتوں کو جگانے اور مرد پسند معاشرے میں عورت کو عزت دلوانے کے لیے یہ نظمیں لکھیں۔جب یہ مجموعہ شائع ہوا تو جیسے ادب کی دنیا میں بھونچال آ گیا اور فہمیدہ ریاض کو فحاشی کے الزامات دیے جانے لگے۔مجموعے میں شامل ان کی نظمیں ایک آزاد خیال شاعرہ کی آواز ہے جس نے عورت کی اہمیت اور طاقت کو پیش کیا۔اس مجموعے کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''فہمیدہ ریاض کی ''بدن دریدہ'' نے جو غدر مچایا اس کے نتیجے میں وہ بے ضرر شاعرات کے جھرمٹ میں منفرد ہو کر متنازعہ شخصیت بن گئی۔طہارت پسندوں کی مطعون، اخلاق پرستوں کی معتوب، سچے قارئین کی محبوب فہمیدہ ریاض معاصر شعراء میں ایک معتبر نام قرار پائی۔ابھی نزاعات کی گونج کم نہ ہوئی تھی کہ اپنے عصر سے اس کے کمٹ منٹ کا اظہار ایسی نظموں کی صورت میں ہوا، جن میں الفاظ کی جگہ گویا کیکٹس استعمال کیے گئے تھے۔اور یوں نزاعات کی شدت اور آراء کی تلخی میں مزید اضافہ ہو گیا۔فہمیدہ ریاض یقیناً مضبوط اعصاب کی عورت ہے جو یہ سب سہہ گئی۔'' (گردپوش کی تحریر: میں مٹی مورت ہوں (کلیات) لاہور 2013ء)

مجموعے میں شامل نظموں میں لذت پرستی نہیں بلکہ احتجاج کا عنصر غالب ہے۔''بھیگی کالی رات کی بیٹی، زبانوں کا بوسہ، کب تک بدن دریدہ، لاؤ ہاتھ اپنا لاؤ ذرا، باکرہ، پہلی بار، مقابلہ حسن'' جنسی نوعیت کی نظمیں ہیں ان کی ایک مختصر نظم ''مقابلہ حسن'' کے عنوان سے مجموعے میں شامل ہے۔

کولہوں میں بھنور جو، ہیں تو کیا ہے / سر میں بھی ہے جستجو کا جوہر / تھا پارہ دل بھی زیر

پریشاں / لیکن میرا مول ہے جوان پر / گھبرا کے نہ یوں گریز پا ہو / پیمائش میری ختم ہو جب / اپنا بھی کوئی عضو ناپو!

اس مجموعے میں بیسویں صدی کی مشرقی عورت کی جنسی نفسیات کی عکاسی کی گئی۔ جواب غلام نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی بھی کچھ اہمیت ہے وہ آزاد اور خود مختار ہے اور اپنے بل پر زندگی جینا جانتی ہے۔ فہمیدہ ریاض کا یہ مجموعہ جب منظرِ عام پر آیا تو وہ شرعی گروہوں کے لیے ایک ناپسندیدہ عورت بن گئیں اور ان پر مختلف الزامات لگائے گئے۔ لیکن انہوں نے سب الزام بڑے صبر کے ساتھ سہہ لیے اور کہا ''میں عورت ہوں میرا وجود ہے میں سوچتی ہوں۔ مجھے لکھنا پسند ہے تمھیں نہیں ہے نہ سہی''

فہمیدہ ریاض ایک باصلاحیت عورت تھیں ''بدن دریدہ'' کی نظمیں جہاں عورت کے حقوق کے لیے لکھی گئیں وہیں اس مجموعے کی نظموں کا ایک پہلو سیاسی بھی ہے وہ سیاست کے غلط رویوں پر ہمیشہ طنز کرتی رہیں، اور حکومت کے خلاف ان کا رویہ ہمیشہ احتجاجی رہا۔ سیاست پر لکھی گئیں ان کی نظمیں ''آذن کے نام'' ''شہر والو سنو'' ''23 مارچ 1973ء'' وغیرہ سیاسی مزاحمتی نوعیت کی ہیں۔ ان نظموں کا لہجہ بغاوتی ہے۔ ان کی نظم ''شہر والو سنو'' میں ایک ایسی حکومت کو پیش کیا گیا ہے جو جانوروں سے مماثل ہے اور جہاں کے اہل دانش بیمار ہیں اور جو بچے ہیں وہ بیمار ہیں۔ یہ نظم پاکستان حکومت کے خلاف لکھی گئی تھی۔ نظم ''آذن کے نام'' میں وہ طنز کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

جھوٹ جیتا ہے / نفرت امر ہے / کہ طاقت ہے برحق / کہ سچ ہارتا ہے /
کہ شیطان نیکی کے احمق خدا سے بڑا ہے

انہوں نے پاکستان کی سیاست پر دل کھول کر طنز کیا۔ ''23 مارچ 1973ء'' کے عنوان سے لکھی گئی ان کی نظم حق کے تحفظ اور دنگا فساد پھیلانے والوں کے خلاف ہے۔ اس نظم سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کس طرح عوام سے مخاطب ہوتی ہیں اور ان کو نعرۂ حق بلند کرنے اور آگے بڑھنے کی تلقین کرتی ہیں۔

پیرہن چاک کرو مصلحت اندیشی کا
یہ جھجکتے ہوئے بازو تو ہوا میں لہراؤ
شہر در شہر جو ہم رقص میں لہرائیں گے
جسم و جاں رقص کریں نطق و زباں رقص کریں

اپنے اشکوں کی برستی ہوئی بوچھار میں آؤ
جسم کو رقص کے گرداب میں چکرانے دو
حلقہ در حلقہ بھنور پڑتے چلے جائیں گے
تلملاتا ہے لہو آج مری رگ رگ میں

جب یہ مجموعہ منظرِ عام پر آیا اور اس کو مختلف گروہوں کے ذریعے ناپسند کیا گیا تو فہمیدہ ریاض نے پھر بھی اپنا احتجاج بند نہیں کیا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ بقول افلاطون ''دنیا میں سب سے زیادہ نفرتوں کا

سامنا سچ بولنے والوں کو کرنا پڑتا ہے'' اور اسی لیے وہ کہہ اٹھیں۔۔۔۔

''کارگاہِ ہستی میں کسی حساس ذی روح پر وہ مقام نہیں آیا ہوگا، جب اس نے خود کو مقتل کے دروازے پر نہ پایا ہو، جب اسے اپنے وجود کی قیمت نقدِ جاں سے نہ چکانی پڑی ہو؟ لیکن جب جان سے گزرنا ہی ٹھہرا تو سر جھکا کر کیوں جائیں۔ کیوں نہ اس مقتل کو رزم گاہ بنا دیں، آخری سانس تک جنگ کریں۔ سو میں نے بھی اپنی گردن جھکی ہوئی نہیں پائی۔ میری نظمیں جو آپ کے سامنے ہیں، ایک رجز ہیں جسے بلند آواز سے پڑھتی ہوئی میں اپنے مقتل سے گزری۔ اس لحاظ سے ''بدن دریدہ'' ایک رزمیہ ہے اسے پڑھ کر اگر لوگ چونکے تو کیا برا ہوا۔'' (پیش لفظ۔ بدن دریدہ، فہمیدہ ریاض، جون 1978ء، شاہی پریس لکھنؤ ص 13)

فہمیدہ ریاض کی نہ صرف ''بدن دریدہ'' کی نظمیں بلکہ ان کی بعد میں لکھی گئیں تقریباً تمام نظمیں رزمیہ ہیں اور یہ رزم ہے غلط رویوں سے، یہ رزم ہے سیاسی اقتدار سے، یہ رزم ہے اس معاشرے سے جس میں عورتوں کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے جب پاکستانی حکمراں جنرل ضیاالحق نے بھٹو صاحب کو گرفتار کیا اور انہیں 14 جولائی 1979ء میں پھانسی دے دی گئی تو اس وقت فہمیدہ ریاض نے ان ساری باتوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اس سیاسی اتھل پتھل پر نہایت بے باک ہو کر نظمیں لکھیں۔ جس سے سیاست پر بہت اثر پڑا اور فہمیدہ ریاض کے گھر کی تلاشی لی گئی۔ انہیں طرح طرح سے پریشان کیا گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی وہ ہمت نہیں ہاریں اور صدائے حق بلند کرتی رہیں۔ اس وقت انہوں نے ایک نظم لکھی ''کوتوال بیٹھا ہے'' جس میں انہوں نے ایک بے باک شاعرہ کی طرح حکومت سے کلام کیا۔

کوتوال بیٹھا ہے / کیا بیان دیں اس کو / جان جیسے تڑپی ہے / کچھ عیاں نہ ہو پائے وہ گزر گئی دل پر / جو بیان نہ ہو پائے

لو بیان دیتے ہیں / ہاں لکھو کہ سب سچ ہے / سب درست الزامات / اپنا جرم ثابت ہے / جو کیا بہت کم تھا / پھر وہی کریں گے ہم / ہو سکا تو کچھ بڑھ کر / پھر وہ حرف لکھیں گے بست دستِ ہر مظلوم / جھوم اٹھے جسے گا کر / چیتھڑا ہے یہ قانون / باغیوں کے قدموں کی اس سے دھول جھاڑیں گے / آمری نحوست ہے / احتساب ہم لیں گے / جب حساب ہم لیں گے۔ / پھر جواب دینے کو / تم مگر کہاں ہوگے / خاروخس سے کم تر ہو / راستے کے کنکر ہو / جس نے راہ گھیری ہے وہ تمہارا آقا ہے / ہم نے دل میں ٹھانی ہے / راہ صاف کر دیں گے / تم تو صرف نوکر ہو / تم کو معاف کر دیں گے

فہمیدہ ریاض کے انہی احتجاجی نظریات نے ان کے اوپر قہر ڈھایا اور ان کے کنبے کے اوپر کاروائیاں کی گئیں لیکن وہ سچ لکھنے سے نہیں ڈریں اور بار بار حکومت کے خلاف کھل کر لکھتی رہیں۔

1981ء میں فہمیدہ ریاض کی ایک طویل نظم جو پانچ ابواب پر مشتمل ہے ''کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے'' کے عنوان سے پہلے ہندوستان اور پھر پاکستان سے شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی سیاست پر طنز کیا گیا ہے اور انصاف کے کٹگھرے کی بے ایمانیوں، ناانصافیوں کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انہوں نے اس نظم میں یہ بتایا کہ آج انگریزی قانون، شرعی قانون اور فوجی قانون کس طرح معصوم، کمزور اور نادار لوگوں کو اپنے شکنجوں میں پھانس لیتے ہیں اور ان کو لمبے عرصے کے لیے پریشان کر دیتے ہیں۔

اسی نظم میں انہوں نے حکومت کی غلط پالیسی اور ہجرت کر رہے لوگوں کی پریشانیوں کو پیش کیا ہے بالخصوص دسمبر 1985ء میں جعلی ریفرنڈم کے خلاف لوگ جب احتجاج کرنے سڑکوں پر اتر آئے اور حکومت کی طرف سے ان کو گرفتار اور ان پر لاٹھی چارج کیا گیا عورتوں کو کوڑے مارے گیے۔ اس وقت کی صورت حال کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس وقت کے حالات میں تبدیلی کا نام لینا بھی گناہ عظیم سمجھا جاتا تھا۔ فہمیدہ ریاض اپنی نظم میں کہتی ہیں۔

سب کچھ جوں کا توں رکھنے کے لیے / تم نے ٹینک گھمادیے میری سڑکوں پر
سب کچھ جوں کا توں رکھنے کے لیے / تم نے بندوق تان لی میرے سینے پر
میرا سینہ / جو گہوارہ ہے ان حسین گلابوں کا
جو کل تمہارے بچوں کے سینوں میں خیال بن کر کھلنے والے تھے
تم نے الثالثکا دیاز مانوں کے علوم کو / تم نے انسانیت کو برہنہ کر کے کوڑے مارے
اور درد مند دلوں سے اٹھتی دعاؤں کے ہاتھ کاٹ دیئے

اس مجموعے کے آخر میں وہ اپنے ہم وطنوں کو سمجھاتے ہوئے کہتی ہیں۔

ممکن تو یہی ہے اے باغباں / ہزار گلابوں کا چمن کھلے / بارش کی بوچھاڑ میں
اور ایک شاخچہ بھی تشنہ نہ رہے / میں اسی دن کے لیے گاتی ہوں
گاتی رہوں گی / ہر آخری گیت، امید کا گیت

جب فہمیدہ ریاض جلاوطن ہو کر ہندوستان تشریف لائیں تو ان کا قلم یہاں بھی اپنے جوہر دکھاتا رہا اور ہندوستان میں انھوں نے جو نظمیں لکھیں وہ بعد میں ''ہم رکاب'' کے عنوان سے مجموعے کی شکل میں سامنے آئیں۔ اس مجموعے میں محض تیرہ نظمیں ہیں۔ مجموعے میں شامل ''نیا بھارت''، ''پوروانچل''، ''مشرقی یوپی کے کرفیوں میں'' اور ''تم بالکل ہم جیسے نکلے'' ان کی ایسی نظمیں ہیں جو ہمیں یکجہتی اور

بھائی چارے کا پیغام دیتی ہیں۔ جیسے "تم بالکل ہم جیسے نکلے" نظم ملاحظہ کیجئے۔

تم بالکل ہم جیسے نکلے / اب تک کہاں چھپے تھے بھائی / بھاڑ میں جائے شکشا وکشا

اب جاہل پن کے گن گانا / آگے گڑھا ہے یہ مت دیکھو / واپس لاؤ نیا زمانہ

کشٹ کرو تم آجائے گا / کیسا ویر مہان تھا بھارت / کتنا عالی شان تھا بھارت

پھر تم لوگ پہنچ جاؤ گے / بس پرلوک پہنچ جاؤ گے / ہم تو ہیں پہلے سے وہاں پر

تم بھی سمے نکالتے رہنا / اب جس نرک میں جاؤ وہاں سے / چٹھی وٹھی ڈالتے رہنا

فرقہ وارانہ تشدد پر ان کی ایک نظم "خاکم بدہن" ہے جس میں وہ ایک ایسی تبلیغ کا ذکر کرتی ہیں جس سے نفرت پھیلتی ہے۔ فہمیدہ ریاض کہتی ہیں۔

میں حازم مے خانہ تھی کل رات کہ دیکھا / ایک کوچہ پر شور میں اصحابِ طریقت

تھے دست وگریباں / خاکم بدہن پیچ عماموں کے کھلے تھے

فتوؤں کی وہ بوچھار کہ طبقات تھے لرزاں / دستانِ مبارک میں تھیں ریشانِ مبارک

موہائے مبارک تھے فضاؤں میں پریشاں / کہتے تھے وہ باہم کہ حریفانِ سیہ رو

کفار ہیں بدخو / زندیق ہیں، ملعون ہیں سنتے ہیں مسلماں!

ہاتف نے کہا اے ربِ سماوات! / لاریب سراسر ہے بجا دونوں کے فتوات

خلقت ہے بہت ان کے عذابوں سے ہراساں / اب ان کی ہوں اموات!

اس طرح فہمیدہ ریاض اردو کی پہلی واحد شاعرہ ہیں جنھوں نے اس طرح احتجاج کیا کہ سیاست کو ہلا کر رکھا دیا۔ انہوں نے معاشرے میں پھیلی برائیاں، حکومت کی غلط پولیسی اور شرعی فرقوں کی کٹھر پنتی کو ہمیشہ ہدفِ ملامت بنا کر ان پر لکھا۔ "چادر اور چار دیواری، انقلابی عورت، اکیلا کمرہ، اب سو جاؤ، خانہ تلاشی، بعد میں جو کچھ یاد رہا، ایک عورت کی نرم ہستی، گرہستی، لاؤ اپنا ہاتھ ذرا، غدار مور، امن کی آشا، خواب اور تعبیریں،" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جس میں فہمیدہ ریاض احتجاج کرتی نظر آتی ہیں۔ برائیوں کے خلاف احتجاج کرنا، ان کی فطرت میں شامل تھا اور اسی لیے وہ مردوں کی بالادستی اور غلبے کے ماحول میں بھی نسائی حقوق اور جمہوری قدروں کے لیے جدوجہد کرتی رہیں۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری کا ایک بڑا حصہ احتجاجی شاعری پر مبنی ہے جس میں وہ جبر کو مسترد کرتے ہوئے سچائی کو ثابت کرنے کے لیے آزادیٔ اظہار کا سہارا لے کر آگے بڑھتی ہیں اور ہر ظلم وستم کا منہ توڑ جواب دیتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی شاعری یقیناً ایک حساس طبیعت شاعرہ کی آواز ہے جو ان کو ہمیشہ زندہ رکھے گی۔ ■■

shubeenaqvi1@gmail.com

فہمیدہ ریاض بنام چودھری محمد نعیم

(1)

24 اگست 1987

نعیم صاحب

تو کیا آپ واقعی ایسے خدا ترس بزرگ ہیں جو ایسے راندہ ہائے درگاہ کو یاد رکھتے ہیں، جن کو دنیا فراموش کر چکی ہے اور جن کو تاریخ کے ڈسٹ بن میں پھینکا جا چکا ہے؟ جو خط میں نے جونیجو کو لکھا وہ 27 جون کو پوسٹ کیا گیا۔

ابھی تک یہیں ہوں۔ اور بہت اکیلی۔ ہندوستان طرح طرح کے convulsions سے گزر رہا ہے۔ آپ سے ملاقات بھلا کب ہوئی تھی؟ دو برس پہلے یا شاید تین برس پہلے، دیکھیے حافظہ کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ ویسے بھی سال مہینے سب بے معنی سے ہوگئے ہیں۔ پتہ نہیں وقت کا مطلب کیا ہے۔ سورج نکلتا ہے اور ڈوب جاتا ہے، لوگوں نے اسے وقت کہہ دیا۔ یہ بھی اچھا مذاق ہے۔

خیر تب آپ سے رام جنم بھومی کی بات ہوئی تھی۔ تب سے اب تک جمنا میں بہت خون بہہ چکا ہے۔ تو کیا آپ کا کہنا ہی درست تھا؟ وہ یہ کہ مسلمانان ہند کو یہ bait نہیں پکڑنی چاہیے، لیکن نعیم صاحب۔ اس جال میں تو ہندوؤں کو بھی نہیں آنا چاہیے لیکن ہندو ہوں یا مسلمان دونوں اس جال میں پھنس جاتے ہیں۔ مہینوں تک فسادات جاری رہتے ہیں، پھر تھک ہار کر ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

اچھا تو پھر میں آپ پر کیا کام رکھوں؟ (کیوں کہ آپ خدا ترس بزرگ ہیں) لہٰذا آپ شکاگو میں ایک مشاعرہ برپا کیجیے اور مجھے بلا لیجیے۔ ٹکٹ بھیج کر۔ خیر، شاید اہل شکاگو میری شاعری کے صنائع و بدائع نہ سمجھ پائیں اور نہ ٹکٹ کا چندہ دیں۔ اس صورت میں ایک کتاب میں نے لکھی ہے در زبان انگریزی، جس کا نام ہے PEOPLE۔ ناول ہے۔ آج کل وہاں ہندوستانیوں کی خوب کتابیں چھپتی

ہیں۔ تو کیوں نہ میں وہ مسودہ آپ کو بھیج دوں اور آپ کسی اچھے سے پبلشر سے چھپوالیں۔ اس سے پہلے آپ اس کی ٹیز کو کراس اور آئیز کو ڈاٹ کر سکتے ہیں۔ یعنی کہ محاورہ درست کر دیجیے گا۔ کیوں انگریزی میں قلم فرسائی کی؟ ارے صاحب ہندی رسم الخط آتا نہیں اور ہندوستان میں رہ کر کیا اردو لکھوں؟ اردو کا یہ حال ہے یہاں کہ چھپنے والے مواد سے ہوش وحواس کو ڈنڈے مار مار کر نکال دیا گیا ہے۔ مجال ہے کہ کوئی لفظ سمجھ کا چھپ جائے۔

نعیم (اب میں نے آپ سے دوستی کرلی) پاکستانی ادیبوں نے میرے لیے ایک قرارداد پاس کی ہے، شاید میری واپسی کی صورت نکلے! اس لیے خواب دیکھ رہی تھی، گئی تو کراچی میں نوٹنکی کرواؤں گی۔ اپنے لکھنؤ والے مدرارا کھشس کو بلالیں گے۔ نظام الدین کی درگاہ کے قوالوں کو بلالیں گے، جو گائیں: چھاپ تلک سب چھینی موسے سے نیناں ملائے کے۔ اور بہاریوں سے مل کر بلوائیں گے کجری گانے والوں کو۔ واہ کجری! ہائے کجری! جو گاتی ہیں کہ ہمری کشمیری چنریا عطر گمکے۔ کراچی والے تو بھول بھی گئے کہ عطر کا گمکنا کیا ہوتا ہے۔

اتنی دیر میں آنکھ کھل گئی۔ دراصل ہندوستان سے عشق ہے اور دل دماغ پاکستان میں لگا رہتا ہے۔ یعنی نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

فوراً جواب دیجیے۔ شکریہ کے طور پر کئی نئی نظمیں بھیجوں گی۔ بالکل نئے موضوع پر لکھی ہیں۔

فقط

فہمیدہ

(2)

26 ستمبر 1987

ڈیئر نعیم صاحب

آپ کا حیران و پریشان خط ملا۔ بہت شرمندہ ہوئی۔ جانے کس موڈ میں آپ کو خط لکھا تھا۔ شاید زیادہ ہی بے تکلفی سے لکھا تھا۔ خیر چلیے، ہونا ہی کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا!! بقول شاعر:

ایک مرگ ناگہانی اور ہے

تو آپ کو خدا ترس بزرگ ہونے سے انکار ہے، بلکہ اس پر آپ خاصے جز بز ہوئے۔ جس سے میں خاصی محظوظ ہوئی۔ اچھا صاحب، میں خدا ترس بزرگ سہی۔ ویسے آپ نماز تو پڑھتے نہیں ہوں گے۔ حج پر گئے ہوئے بھی معلوم نہیں ہوتے، اور اب تو جایئے گا بھی مت۔ وہاں بھی کم بخت بھونے

ڈال رہے ہیں سٹین گنوں سے۔ ذکوۃ وغیرہ تو اہالیان شکاگو کو آپ کیا دیں گے۔ ثابت ہوا کہ ثواب کا اب ایک ہی کام رہتا ہے، وہ یہ کہ مجھے خط لکھتے رہا کیجیے۔ یہ عین ثواب ہے۔ اس قدر تنہائی ہے۔

نعیم صاحب۔ ہندو مسلمانوں کی لڑائی کا کچھ بھروسہ نہیں۔ آج کل اس فرنٹ پر شانتی ہے۔ میرٹھ سے خبر آئی ہے کہ محرم دونوں نے مل جل کر منایا۔ سینکڑوں ہندو خواتین نے علم پر منت چڑھائی۔ لاحول ولاقوۃ۔ بہت خوشی ہوئی مگر، لعنت بھیجیے۔ سارے ملک کو Convulsion میں ڈال کراب یہ ہورہا ہے۔

آج کل آپ کے دیس میں بھینکر سوکھا پڑ رہا ہے۔ ورنہ باڑھ آئی ہوئی ہے۔ آپ کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے میں کتاب چھپوانے کی کوشش کروں گی، یعنی جب کوشش کرنے کی طاقت ہوئی تو بی فی الحال تو دیوار کے سائے میں پڑے ہیں۔ ایک دن اٹھ کر پاکستان ایمبیسی جا پہنچی کہ بھئی میرے خط کے جواب میں کیا ہدایات ہیں۔ واپسی کے لیے کاغذات دیجیے۔ ارے نعیم صاحب، وہاں تو مرگھٹ کا سا سناٹا چھا گیا۔ ایک گھنٹہ تک میں بیٹھی رہی۔ کوئی اپنے کمرے تک سے نہ نکلا۔ ناچار واپس آ گئی۔ پاکستانی ایمبیسی کے حساب سے میں (اور میرے شوہر صاحب) ہندوستانی ایجنٹ ہیں۔ ایجنٹی کے کیا فرائض انجام دیے! اس کا کچھ پتہ نہیں۔ خیر، مزید ایجنٹی کرتے ہوئے ہم دونوں نے ایک پریس کانفرنس کی اور ایک Forum بنایا ہے، ان تمام پاکستانیوں کی واپسی کے لیے جو مارشل لا میں ہراساں کر کے ملک چھوڑنے پر مجبور کیے گئے، ان کی واپسی کے لیے۔ اس کا نام ہے (MRPMovement for Repatriation of Pakistanis)۔

آصف فرخی نے سنا ہے میری کتاب (بلکہ کتابچہ) پر بہت برا ریویو لکھا۔ کمال ہے۔ مجھے لوگ اینٹی مہاجر سمجھتے ہیں اور سندھی اینٹی سندھی۔ کوئی بات نہیں فہمیدہ ریاض، تمھاری شکل ہی ایسی ہے۔

نعیم صاحب۔ آپ بہت بھلے آدمی ہیں۔ میں آپ کی اور آپ کے رسالہ کی کیا خدمت انجام دے سکتی ہوں۔ کہیں تو چندہ جمع کروں۔ آخر کچھ تو کروں۔ ہمارے ایک دوست اصغر علی انجینئر نیو یارک آنے والے ہیں۔ آپ ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ اگر مل سکیں تو نہایت صالح اور مجاہد انسان ہیں۔ اچھا، میں ان کے پمفلٹ آپ کو بھجواؤں گی۔

اس خط میں کوئی بات جواب کے قابل نہیں، مگر آپ خط ضرور لکھیں۔ اس سے میرے اندر ذرا جینے کی خواہش زندہ رہتی ہے۔

فقط

فہمیدہ

(3)

معلوم نہیں آج کیا تاریخ ہے!

نعیم صاحب۔

خط آپ کا پہنچا اور حالات سے آگاہی ہوئی۔ یہ تذکرۂ تعطیلات، ذکر حلیم، ویڈیو پر فلم وغیرہ وغیرہ۔! یقین کامل ہے کہ آپ انتہائی مبالغہ سے کام لے رہے ہیں اور آپ کی زندگی ہرگز اس قدر خوش گوار نہیں جو کہ سکون و فراغت کے اس منظر سے ظاہر ہو رہی ہے۔ بس یہی ایک امید مجھے آپ کو شدت سے resent کرنے سے باز رکھ سکتی ہے اور اسی قسم کے تلخ طعنوں سے کہ بی خوب بی ہم بھی پروفیسری کرتے!! وغیرہ وغیرہ۔

یہ خط میں آپ کو عالم انجماد سے لکھ رہی ہوں۔ جی ہاں۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ کیا ہم واپس عالم انجماد میں نہیں جا سکتے؟ حضرت رومی نے فرمایا کہ جماد سے نبات اور نبات سے وحوش بنے ہیں تو یہ پروسیس ریورس بھی ہو سکتا ہے، مگر شاید نہیں۔ ایک سردار جی نے کیا پتہ کی بات کہی (جب ان سے کہا گیا کہ بھئی ہندوؤں سے ہی تو سردار بنے) کہ جی دہی سے ایک بار مکھن بن گیا ہے۔ اب اس کا دوبارہ دہی نہیں بنایا جا سکتا۔ (یہ بات انھوں نے انگریزی میں کہی) لہٰذا ثابت ہوا کہ یہ دوسری قسم کا انجماد ہے۔

a state of suspended animation

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ دوستوں کے پرزور اصرار پر اور اس خیال کے اظہار پر کہ غالباً بے نظیر کی شادی کے موقع پر واپسی کی صورت میں گرفتاریاں نہیں ہوں گی۔ بیرون ملک اور بہت سوں کی مانند ہم نے بھی، پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی ہے۔ پاکستانی ایمبیسی سے کاغذات ملنے کی صورت میں چند دنوں میں ہم پاکستان میں بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اس پر مصرعۂ ثانی یہ ہے کہ دوسری صورت میں نہیں بھی ہو سکتے۔ لہٰذا آپ سمجھ سکتے ہیں (سردار جی نے یہ بھی کہا تھا۔ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔) کیوں نہ اس موقعہ پر ایک خیالی انٹرویو کیا جائے۔

سوال: تو فہمیدہ ریاض صاحبہ بی اس موقعہ پر آپ کے کیا خیالات اور جذبات ہیں؟

میں : میرے کوئی جذبات نہیں اور خیالات!! لگ رہا ہے کہ کسی زمانے میں اس قسم کی کسی شے سے میری آشنائی تک نہیں تھی۔

سوال: تو کیا اب آپ ہندوستان چھوڑ دیں گی۔

میں : کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا۔

سوال: تو پھر جب ہر بات اس قدر suspended ہے تو پھر آپ آخر اس احمقانہ حالت کو لکھ کر دساور کیوں بھیج رہی ہیں۔ ایک Unsuspecting شریف آدمی کے نام خط میں۔

میں : آپ کا سوال loaded ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ شک کر رہے ہیں۔ یہ ایک قسم کا Sadism ہے۔ اگر ہو بھی تو میں اس سے لاعلم ہوں۔

سوال: تو آپ اس State of suspended animation میں کیا کرتی رہی ہیں۔

میں : میں ظفر کو جانے کی تیاریاں کرتے دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ جلد جلد کتابوں کو شپ کرنے میں مصروف ہیں اور وہ سب باتیں کر رہے ہیں، جو کسی ملک میں طویل اقامت کے بعد رخصت ہوتے ہوئے کی جاتی ہیں۔ انتظامات میں مصروف ہیں۔ ایک نگاہ× غلط انداز مجھ پر ڈالتے ہیں اور پھر صبر کا ٹھنڈا سانس بھرتے ہیں۔

سوال: وہ کیوں؟

میں : اس لیے کہ میں نہ جانے کیوں آج کل تاریخ پڑھتی رہتی ہوں۔ زندگی کے اس مقام پر جب کہ شاید ہم یہاں سے چل ہی جائیں (!!) یہ بات میرے لیے کیوں کر دلچسپی کا باعث بن رہی ہے کہ ہندوستان پر کون سے یونانیوں اور باختریوں نے حملہ کیا تھا اور یہ کہ ہندی لفظ کیندر دراصل یونانی کیندرون سے نکلا ہے۔

سوال: انٹرویو ختم!!

دراصل بات یہ ہے۔ میرا اس قدر ''سُن'' ہونا دراصل اس وجہ سے ہے کہ میں انتہائی درجہ کی Passimist واقع ہوئی ہوں۔ جو کہ مایوسی کے خلاف میرا دفاع ہے۔ زندگی کے کارزار میں، اپنے Passimism کی زرہ بکتر پہن کر کود پڑی ہوں۔ اس لیے راز کی بات بتا رہی ہوں، مجھے کوئی امید نہیں کہ پاسپورٹ مل جائے گا۔ جب تک کہ کاغذات میرے ہاتھ میں نہیں آتے۔ میں کسی امید کو ہرگز پاس نہیں پھٹکنے دوں گی۔

اس لیے پھر کیوں نہ ظاہر کیا جائے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں رہا اور حالات بدستور ہیں (جو کہ بہر حال ہیں ہی) تو اب ہم آپ کے خط کی طرف آتے ہیں۔

قبلہ آپ نہایت بھولے ہیں۔ یہ آپ کیا فرماتے ہیں کہ میں نے غلط یا نیم غلط لکھا ہے کہ پاکستانیوں کی زبان اردو نہیں تھی۔ کیوں کہ گو مرد اپنی زبان پڑھتے تھے مگر عورتیں اردو پڑھتی تھیں۔ صاحب یہ آپ کیا کہتے ہیں! یہ خطہ کہ جس پر کہ پاکستان، یعنی کہ سندھ بلوچستان وغیرہ ہے، یہاں عورتیں پڑھتی ہی کہاں تھیں جو اردو پڑھنے کا سوال پیدا ہوتا؟ عورتیں ہی کیوں، ان خطہ جات میں مرد

ہی کہاں پڑھتے تھے، بلکہ اب بھی کہاں پڑھتے ہیں۔ حضور بی یہ چونچلے انھوں نے دوسروں کے لیے چھوڑ رکھے ہیں۔ واللہ آپ نے ہنسی سے لٹا دیا، بلکہ میرے آنسو جاری ہو گئے۔

مگر بات، وہی ہے نا۔ کہ بھئی اس ہندی پٹے میں جو کچھ ہوتا ہے، وہی پورے ہندوستان میں بھی ہوتا ہوگا۔ یہی نا! اس ناچیز نے اپنے مختصر کتابچہ میں یہی لکھا ہے کہ برصغیر ہندی اور اردو والوں کی Ergo sum کا شکار ہوا ہے۔ اب یہ حد ہے کہ ہم مستقل اس کتاب کے بارے میں بات کریں جو آپ نے پڑھی تک نہیں ہے۔ مبادا میں زرِ کثیر خرچ کر کے اسے آپ کے لیے روانہ نہ کر دوں! (جو کہ بہرحال میرے پاس نہیں ہے) ویسے آپ کو اس کے پڑھنے سے خاص فائدہ نہ ہوگا (اس کے پڑھنے سے جن بہتوں کا بھلا ہوگا ان میں ہندوستانی شامل نہیں)۔ دراصل یہ عمل جراحی پاکستانیوں کے لیے تھا اور وہی اسے پڑھ کر ٹھیک سے تلملا سکتے ہیں جیسا کہ موصوف آصف فرخی سلمہٗ کی تحریر سے ظاہر ہے۔ خوب! تیر نشانہ پر بیٹھا ہے۔

یہ کیا بات ہوئی کہ میری نظم آپ کو فیض کی لگی۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں اسے داد بھی سمجھ سکتی ہوں۔ بات یہ ہے کہ نعیم صاحب کہ فیض صاحب اپنا کوئی جانشین نہ پا کر پریت بن گئے ہیں۔ تو کبھی کبھی میری کسی نظم میں سما جائیں تو یہی سمجھ لیا کیجیے۔

اچھا تو نعیم صاحب۔ اب کیا خدا حافظ ہی کہوں۔ دیکھیے کس طرح سے اس عجیب وقت میں آپ کو بالاقساط خط لکھ ہی ڈالا۔ اب دیکھیں کیا ہوتا ہے۔

میں پچھلے دنوں سی پی ایم کے کچھ لوگوں کے ساتھ فتح پور اور پھر وہاں سے آگے ایک چھوٹے سے گاؤں گئی تھی (اصغر وجاہت وغیرہ کے ہمراہ) ایک قصبہ بندگی بھی گئے۔ آپ شاید وہاں گئے ہوں۔ وہاں باونی املی نام کی ایک جگہ دیکھی جہاں 1857 میں باون ہندوستانیوں کو انگریزوں نے پھانسی دی تھی۔ ایک قلعہ کے کھنڈرات، جہاں اورنگ زیب اور شاہ شجاع کی جنگ ہوئی تھی۔

فتح پور میں لگا کہ جیسے پریم چند کے کردار گھومتے پھر رہے تھے، بلکہ ایک کسان کا تو نام تک ہوری تھا۔ گاؤں میں ایک بہت پرانا مندر ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ مندر کب بنا۔ اس گاؤں میں کچھ انتہائی حسین قدیم مورتیاں دیکھیں۔ کہتے ہیں پاس کے تالاب کی کھدائی سے نکلیں۔ ایک مندر کے سادھو جی کی میٹھی بولی سنی۔ بٹیا بٹیا کر کے بول رہے تھے۔ بڑا رونا آیا۔ دراصل پاکستان ہم مہاجروں کی سسرال ہے۔ مہاجر کی مثال آپ بداکی ہوئی بیٹی سے لیجیے۔ عورت ہونے کی وجہ سے میں یہ بات نہیں لکھ رہی ہوں، نہ ہی یہ جذبہ نسوانی ہے۔

تو آپ کا اصرار ہے کہ میں ہندی سیکھوں۔ ہندی میں ہے ہی کیا؟ اس کے بجائے سنسکرت کیوں

نہ سیکھی جائے، جو واقعی فائدہ ہو۔ ہندی تو زبان نہیں بلکہ ایک ذہنیت ہے۔ زیر زبر کو "جیر جبر" کہہ دیجیے، ہندی ہو جائے گی۔ وہی جو فراق نے کہا تھا کہ "بھئی ہندی میں لے دے، کر صرف ایک تلسی تھا" اور پھر کچھ توقف کے بعد "اور وہ بھی مر گیا۔"

نعیم صاحب —

اگر میں پاکستان پہنچ جاؤں اور باہر رہوں۔ (ویسے anticipatory bail کی تو تیاری ہے) تو پھر آپ ضرور ضرور وہاں آیئے گا، بلکہ ہمارے ہی پاس ٹھہریے گا۔ ظفر سے آپ کی خوب دوستی ہو جائے گی۔ وہ ذرا دیہاتی ٹائپ ضرور ہیں، لیکن قدردان ہیں۔ آج کل وہ بے پروں کے اڑ رہے ہیں، سوئے سندھ بی! اور گربچوف کی Perestroika بیچ بیچ میں پڑھتے جاتے ہیں، یہ نعرے لگاتے ہوئے کہ "یہ سب میں نے پہلے ہی کہا تھا۔" میں سعادت مندی سے سر ہلا کر کہتی ہوں بے شک!!

اچھا اب ہمارے لیے دعا کیجیے۔

فقط

فہمیدہ

وشوناتھ ترپاٹھی

فراق صاحب کی باتیں

تلخیص و ترجمہ: شاہد ندیم

فراق صاحب کا نام سب سے پہلے میں نے تب سنا تھا۔ جب کانپور کے وکرماجیت سنگھ سناتن دھرم کالج میں طالب علم تھا، وہیں پر کرانتی کاری سماج وادی پارٹی کے نیتا تھے کامریڈ گھنشیام سنہا، انھوں نے مجھے فراق صاحب کے بارے میں بتایا۔ بڑے ڈرامائی انداز میں فراق صاحب سے متعلق بہت سی باتیں بتائیں، جیسے وہ بہت غیر معمولی آدمی ہوں، انھوں نے فراق صاحب کی شاعری اور علمیت کے بارے میں کم اور شخصیت کی اوٹ پٹانگ پن کے زیادہ بتایا۔ میں بنارس گیا تو فراق صاحب کی شاعری سے میرا تعارف ہوا۔ ایک طرح یہ تعارف کیدار ناتھ سنگھ کے ذریعے ہوا۔ کیدار ناتھ سنگھ کے پاس فراق صاحب کی کتاب اندر دھنش تھی۔ کیدار ناتھ سنگھ اس میں سے بڑے شوق وار پُر اثر انداز میں شعر اور مصرع سناتے۔ کیدار ناتھ سنگھ شاعری سے اتنا لطف اندوز ہوتے کہ ان سے شاعری سننا اچھا لگتا۔ شاعری کی سمجھ ان میں ہے۔ اس طرح فراق کی شاعری میں نے پڑھی۔ مجھے یہ سہولت تھی کہ میں تھوڑی بہت اردو جانتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ایک مولوی ذاکر ندوی ہیں، وہاں آپ ذاکر ندوی نام سے پوچھیں تو شاید کوئی بتا نہ پائے، سب انھیں مولوی صاحب کہتے ہیں، مولوی کہے جاتے ہیں۔ مگر ہیں نہیں۔ میرے ہم عمر اور دوست ہیں۔ ہم ساتھ ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتے تھے۔ مولوی خاندان سے تھے اس لیے انھیں مولوی کہا جاتا تھا، تو میں ان سے اردو پڑھتا تھا، اردو کی روایت اور تھوڑی بہت جانکاری مجھے انھیں کی وجہ سے ہے۔ ذاکر ندوی شاعری بھی کرتے تھے۔ فارسی کے عالم ہیں، عربی بھی جانتے ہیں، انھوں نے فردوسی کے شاہ نامہ کے انداز میں ایک شاہ نامہ یا فردوسی نامہ لکھا ہے۔ نام مجھے ٹھیک

طرح یاد نہیں، تو اردو میں پڑھ لیتا تھا۔ فراق صاحب کی شاعری میں نے خوب پڑھی، ہندی میں بھی پڑھی۔ جب جب ان کی شاعری پڑھتا، متاثر ہوتا۔ لوگوں سے بحث کرتا۔ پہلے مجھ میں یہ عادت بہت تھی۔ اب میں کسی نہ کسی طرح کوئی چیز اچھی لگے تو گھوم گھوم کر اس کا پرچار کرتا ہوں۔ اور جو چیز بری لگے تو اس کی برائی بھی کرتا ہوں۔

ایک عرصہ تک میں فراق صاحب کی شاعری سے متاثر رہا، اب بھی اچھی لگتی ہے لیکن ان دنوں جتنی اچھی لگتی تھی اب اتنی نہیں لگتی۔ اس طرح فراق صاحب سے میرا تعارف ہوا۔ تب تک فراق صاحب کو دیکھا نہیں تھا۔ میرے ایک دوست ستیش کاج تھے جو کانپور میں ساتھ تھے، پھر میری شادی بھی الہٰ آباد میں ہوگئی۔ وہاں کے ادیبوں شاعروں سے تعارف اور پھر دوستی ہوگئی جیسے بھیرو جی، امرکانت، شیکھر جوشی، مارکنڈے وغیرہ۔ اس وجہ سے میں الہٰ آباد جاتا رہتا تھا۔ میرے سسر شری اوپندر کرشن مشر، فراق صاحب کے شاگرد تھے، میری سسرال سے بینک روڈ، جہاں فراق صاحب رہتے تھے قریب تھا۔ ایک دن میں نے ستیش سے کہا کہ میں فراق صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہماری عمر انیس بیس کی تھی، ستیش مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے کہ جیسے ہی تم وہاں جا کر کسی سے فراق صاحب کا گھر دریافت کروگے، وہ تمھیں دیکھ کر ہنسے گا۔ فراق صاحب کی شہرت کچھ اسی طرح کی ہے، میں پہلے یونی ورسٹی میں ان سے ملواتا ہوں۔ میں ستیش کے ساتھ الہٰ آباد یونی ورسٹی گیا۔ ہم ایسے کمرے کو تلاش کرنے لگے جہاں فراق صاحب پڑھا رہے ہوں، ایک کمرے کے سامنے کھڑے ہو کر ستیش نے کہا، ''وہ دیکھو فراق صاحب پڑھا رہے ہیں۔'' بہت بڑا کمرا تھا جس میں بہت کم طلبہ تھے، فراق صاحب سگریٹ پی رہے تھے اور گھوم گھوم کر پڑھا رہے تھے۔ میرے خیال میں ملٹن کی کوئی نظم تھی۔

چند روز بعد میں اکیلے ان کے گھر گیا۔ دیکھا لان پر ایک آدمی سگریٹ پی رہا ہے اور اس طرح پی رہا ہے جیسے ایک ہی کش میں سگریٹ ختم کر دے گا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہی فراق صاحب ہوں گے، دیکھ تو پہلے بھی چکا تھا لیکن ایسا بھی نہیں تھا کہ دوبارہ دیکھ کے پہچان لوں۔ میں قریب گیا اور پوچھا، ''فراق صاحب آپ ہی ہیں؟'' انھوں نے کہا، ''ہاں جناب، رگھوپتی سہائے فراق میں ہی ہوں، آئیے بیٹھیے۔'' لان میں کرسی تھی میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے کہا، ''دھوپ ہو رہی ہے، چلیے اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔'' میں اندر گیا، اندر کوئی نہیں تھا۔ یا کم از کم کسی کے ہونے کا احساس نہیں تھا۔ سامنے بڑی سی پینٹنگ لگی تھی جس میں سدھارتھ، یشودھرا کو چھوڑ کر جا رہے ہیں۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو جیسے ان کا انداز تھا، چھوٹتے ہی کہا، ''اچھا ہندی میں ایم اے کر رہے ہو۔'' ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ جنھوں نے فراق صاحب سے گفتگو کی ہے وہ جانتے ہیں کہ فراق

صاحب کے بات کرنے کا ایک خاص انداز تھا، جو بہت ڈرامائی تھا۔ بات کرتے تو ان کا پورا جسم ڈراما کرتا تھا: آنکھیں، منہ، ہاتھ پاؤں چلتے تھے۔ اب ایسے میں لکھنے میں لا نہیں سکتا۔ تو فراق صاحب نے کہا، "صاحب، بات یہ ہے کہ کچھ ایسی نظمیں سنائیے جو سرل سوگم ہوں اور اچھی لگیں۔" اب میں اتنے بڑے آدمی کو کیا سناتا۔ خیر، میں نے جے شنکر پرساد کی کام یانی کی لائنیں سنائیں۔ جن میں آتا ہے کہ وہ انگ پیڑا انو بھوسا انگ بھنگیوں کا نرتن، سن کر کہا "صاحب، یہ سمجھ میں آیا نہیں، انگیوں بھنگیوں، کیا مطلب ہے اس کا؟" میرا چہرہ اتر گیا، بہت برُا لگا۔ اس کے بعد انھوں نے ہندی شاعری اور ہندی والوں کو اتنے مضحکہ انداز میں برا بھلا کہا کہ میری کھوپڑی جھن جھنا گئی۔ میں نے ہندی کے اہم ادیبوں کے نام گنانے شروع کیے کہ اتنے بڑے بڑے ادیب ہیں۔ جیسے میں نے راہل سنکرتاین کا نام لیا۔ میں جس کا نام لوں فراق صاحب نے ایک ایک کر کے سب کو گالیاں دیں۔ آخر میں انھوں نے دویدی جی کو کچھ کہنا چاہا۔ میں نے کہا صاحب دویدی جی کے بارے میں کچھ مت کہیے، وہ میرے استاد ہیں۔ تو انھوں نے اور زیادہ کہا، انگریزی میں کہا جس کا مطلب تھا کہ بیسویں صدی میں مونچھیں رکھنے کا کیا مطلب (دویدی جی مونچھیں رکھتے تھے) عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نے کہا فراق صاحب! میں آپ کو ڈھیلا مار کر بھاگوں گا اور آپ مجھے پکڑ نہیں پائیں گے۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ ویسا ہی غصہ جو ایک دیہاتی لڑکے کا ہوتا ہے، فراق صاحب بڑے زور سے ہنسے اور کہا کہ تم تو اصل ہندی والے ہو۔ بحث کرنا سیکھو۔ مجھے ہندی کا دشمن مت سمجھو، پہلے میری بات سمجھو۔

میں وہاں سے چلا آیا۔ سوچا فراق صاحب سے کیا ملنا، عجیب آدمی ہیں۔ لیکن فراق صاحب محض ایسی ہی باتیں نہیں کرتے تھے، دوسری باتیں بھی کرتے تھے۔ جیسے ایک دن وہ کہنے لگے، "پاڑنی کے زمانے میں نبے سنسکرتیاں چلتی تھیں، پاڑنی نے اس میں سے ایک کو اسٹینڈرائز کیا تھا۔" فراق صاحب سنسکرت کو سنسکرتیاں کہتے تھے، کہنے کا مطلب تھا سنسکرتیں۔ فراق صاحب نے جب یہ بات مجھے بتائی تو میں سُن رہا تھا، یکا یک انکا چہرہ بدل گیا، بولے تم تو بلکل ان سینسیٹو آدمی ہو۔ میں اتنی بڑی بات کہہ گیا اور تمھارے چہرے پر کوئی اموشن نہیں آیا۔ جب پہلے پہلے میں نے ڈاکٹر تارا چند سے یہ بات سنی تھی تو تین دن تک رقص کرتا رہا تھا۔ اب میں کاشی یونی ورسٹی کا طالب علم، اپ بھرنش، پراکرت پڑھتا تھا۔ میرے منھ سے نکل گیا، ہاں صاحب میں نے بھی پہلی بار یہ بات سنی تھی تو بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ سن کر فراق صاحب تھوڑے نرم ہوئے، میں نے یہ بات انھیں متاثر کرنے کے لیے کہی تھی، ویسے یہ بات میں نے پہلے نہیں سنی تھی، پھر وہ کاشی یونی ورسٹی کی برائے کرنے لگے، میں چلا آیا۔

ان سے مل کر برا لگا، لیکن یہ بھی لگتا کہ یہ آدمی جو باتیں کرتا ہے وہ ساری کیساری بے بنیاد نہیں

ہیں۔ جس طرح فراق صاحب کی باتوں سے دوری پیدا ہوتی تھی اس کے ساتھ ایک طرح کی دل کشی بھی تھی، کہ عجیب آدمی ہے، سب کو گالیاں دیتا ہے اور بڑا شاعر کہلاتا ہے، اپنی پی سی ایس یا کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آئی سی ایس کی ملازمت چھوڑ کر تحریکِ آزادی میں جیل گیا تھا۔ جواہر لعل نہرو کے ساتھ رہا ہے۔ موتی لعل نہرو کا سکریٹری تھا۔ جب فراق صاحب نے کہا کہ تم اتنے کم عقل ہو، اتنی بڑی بات کہہ گیا اور تمھارے چہرے پر کوئی اموشن ہی نہیں آیا، اس کے بعد بولے دیکھو بُدھی دو طرح کی ہوتی ہے ایک بانس بدھی دوسری کمبل بُدھی۔ کمبل بدھی وہ ہوتی ہے جسے چاہے جتنا ڈنڈے سے پیٹو، سوئی گڑاؤ، اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بانس بُدھی وہ ہوتی ہے، جس کا ایک پور توڑنے پر سارے کے سارے پور کھٹ کھٹ ٹوٹتے چلے جاتے ہیں۔ تو تم کمبل بُدھی کے ہو، تمھاری سمجھ میں میری بات نہیں آرہی۔ تب میں نے کہا کہ صاحب یہ بات میں نے پہلے سن رکھی ہے کہ پارٹی نے نبے سنکرتیوں میں سے ایک کو اسٹینڈرائز کیا تھا۔ ان سب باتوں کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فراق صاحب سے ملاقات سے پہلے اندرودھنش کے کئی اشعار مجھے یاد ہو چکے تھے۔ جیسے

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس یا ہوتا ہے قسموں سے یہ گن پیدا

یا سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

ایسے بہت سے اشعار مجھے یاد تھے اور فراق صاحب کی شاعرانہ اہمیت کا بھی قائل تھا۔ اسی وجہ سے میں ان سے ملنے گیا تھا۔ اس سے بُرا لگا لیکن ان کی شخصیت، تخلیقی صلاحیت سے میں پہلے ہی متاثر تھا اس لیے ایک خاص قسم کا لگاؤ بھی بنا رہا، ان سے ملنا کبھی نہیں چھوڑا۔ میرے سسر سنتے کہ میں فراق صاحب سے ملنے گیا تھا تو بہت ہنستے۔

ایک روز کا واقعہ ہے، نامور جی نے ڈاکٹر رام ولاس شرما کا مضمون پڑھ کر سنایا، نامور جی میرے پروفیسر تھے۔ جسے آج ایڈہاک پروفیسر کہا جاتا ہے۔ ایم اے کو پڑھاتے تھے، میں اور کیدار ناتھ ان سے اپ بھرنش پڑھتے تھے۔ ان دنوں نامور جی کا ساتھ بہت اہم ہوتا تھا۔ ادیبوں شاعروں کے بارے میں وہ بہت سی باتیں بتاتے تھے، مجھ پر ان کا گہرا اثر ہے، جب میں فراق صاحب کی تعریف کرتا تو نامور جی ہنستے اور ظاہر کرتے کہ فراق گورکھپوری اتنے بڑے شاعر نہیں ہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں چڑ جاتا۔

ان دنوں ہندی کے بارے میں ڈاکٹر رام ولاس شرما اور فراق گورکھپوری کے درمیان نوک جھونک ہوئی تھی، ڈاکٹر رام ولاس شرما نے ایک مضمون لکھا تھا، 'فراق اور ہندی'۔ یہ مضمون نامور جی نے مجھے پڑھ کر سنایا۔ رام ولاس شرما جی نے اپنے خطرناک اسلوب میں لکھا تھا، میری نظر سے یہ پہلا

مضمون گزرا تھا جس میں کسی نے فراق صاحب کی ٹل ٹلی اُڑاتا ہے اور یہ سمجھتا اور ثابت بھی کہ فراق حقیر ہیں۔ مجھے یہ بات بری لگی کیوں کہ میں فراق گورکھپوری کو اتنا حقیر ماننے کو تیار نہیں تھا، یہ ضرور ہے کہ رام ولاس جی کا مضمون پڑھنے لائق تا۔ اس کی کئی باتیں مجھے یاد ہیں۔ فراق صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا، جس میں ہندی شاعری کی کئی مثالیں دی گئیں تھی، جس میں لفظ لوچن ولوچن آتا ہے۔ فراق صاحب نے مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا تھا کہ یہ لوچن کیا ہے؟ اور لکھا تھا کہ اس لفظ کو پڑھتا ہو تو مجھے اپنے گاؤں کے رام لوچن پانڈے یاد آتے ہیں۔ بے چارے بڑے شریف آدمی تھے، مر گئے۔ جواب میں رام ولاس جی نے لکھا تھا کہ آپ کو لوچن سن کر رام لوچن پانڈے یاد آتے ہیں تو اُدت اُدیا گری منچ پر رگھوبیر بال پتنگ، سن کر آپ کو پتنگ اُڑانے کا زمانہ یاد آجائے گا۔ فراق نے ہندی ادیبوں کو 'بھسوتی پرساد' کہا تھا، تو رام ولاس جی نے لکھا تھا 'اے سُتھنا سہائے جی! سنیے، اس طرح ترکی بہ ترکی چلا تھا۔

فراق صاحب نے خاص طور پر رام چند شکل اور نرالا پر جو اعتراضات کیے تھے، رام ولاس شرما نے اس کا بہت اچھا جواب دیا تھا، پھر بھی میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ (وہ) اتنے کوڑی کے تین ہیں، جیسا کہ رام ولاس جی دکھانا چاہتے تھے۔ نامور جی اس کا مزا لیتے تھے، وہ رام ولاس جی سے متفق ہوتے اور کہتے ٹھیک لکھا ہے۔ فراق صاحب ایسے ہی ہیں۔ انگریزی کے لیکچرار ہیں، اس لیے نام ہو گیا، ویسے اتنے بڑے نہیں ہیں، فیض ان سے بڑے شاعر ہیں۔ نامور جی مخدوم کو بھی بڑا شاعر مانتے تھے۔ بڑے شاعر کا مطلب ہوتا فراق شے بڑا۔ میں فراق کے آگے کسی کو نہیں مانتا۔ فراق کا لکھا ہوا جو بھی ملتا، پڑھتا اور جب کبھی الٰہ آباد جانا ہو تو ان سے ملتا۔

فراق صاحب بحث کرتے وقت گالی گلوچ بہت کرتے تھے۔ جس حال میں میں نے فراق صاحب کو دیکھا ہے۔ ان میں سے چند کا ذکر میں ضرور کرنا چاہوں گا۔ حالاں کہ انھیں تحریر میں اتارنا آسان نہیں۔ ایک بار شام کو ان کے یہاں گیا تو بیٹھے شراب پی رہے تھے، میرے خیال سے تھوڑا پیتے تھے۔ حسابی کتابی بہت تھے اور اپنی آمدنی کے مطابق خرچ کرتے تھے، بہت دیر میں ایک پیگ ختم کرتے۔ پینے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگا دیتے۔ شام کو پیتے تو مزا لیتے اور ان کی باتیں سننے کے لیے کافی لوگ آجاتے۔ ان میں بڑے افسران بھی ہوتے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج بھی آتے۔ فراق صاحب کے یہاں بنارس کا ایک مسلم لڑکا رہتا تھا۔ نام تھا فنا، بعد میں معلوم ہوا کہ نذیر بنارسی کا جاننے والا تھا۔ فراق صاحب کی خدمت کرنے چلا آیا تھا۔ فراق صاحب نے پی کر ایک دوسرے ملازم رام کھلاون کو آواز دی، اے ے مولانا کو بھیجو، مولانا کا مطلب ہوتا فنا، اس کی عمر بیس بائیس سال رہی

ہوگی۔تو مولانا آئے۔فراق صاحب نے اس لڑکے کو اتنی گالیاں دیں کہ میں بتا نہیں سکتا۔وہ بے چارہ ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑا رہا۔فراق صاحب نے کہا تم نے کھانا اس وقت کیوں بھجوا دیا۔لڑکے نے جواب دیا۔حضور آپ نے کہا تھا کھانا بھجوا دو،فراق صاحب بولے،نا،میں نے یہ نہیں کہا تھا۔میں نے کہا تھا کھانا تیار رہے،کھانا تیار رہے اور کھانا بھجوا دو کے فرق کو آپ نہیں سمجھتے،یہ کوئی عربی نہیں کھڑی بولی ہے،میں شام چھ بجے کہوں کہ کھانا تیار ہے اور رات ساڑھے بارہ بجے کہوں گا کہ کھانا آجائے تو رات ساڑھے بارہ بجے کھانا فوراً آجائے۔اگر سوا بارہ بجے آگیا تو میں آپ کو قتل کر دوں گا۔آپ نے جلدی کھانا بھجوا دیا،آپ چاہتے ہیں کہ مجھے کھانا کھلا کر آپ رام کھلاون کے ساتھ خوش گپیاں کریں،مجھے برا لگا۔اس کے بعد فراق صاحب پیشاب کرنے گئے۔پیشاب کرنے لگے تو پاجامہ نیچے اتر گیا۔وہ اس طرح ننگ دھڑنگ آکر کرسی پر بیٹھ گئے،اس وقت وہاں سات آٹھ لوگ بیٹھے تھے۔اس دن فراق صاحب ناراض تھے اس لیے حضرت محمدؐ اور قرآن کے بارے میں جو کہنا شروع کیا،وہ سب میں نہیں کہہ سکتا۔کافی احتیاط سے اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جیسے انھوں نے قرآن کے بارے میں کہا کہ صاحب پڑھ رہا ہوں۔سارے راز کھل رہے ہیں۔اور بھی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کہیں جو کسی مہذب معاشرے میں بیان کرنے لائق نہیں ہیں۔اسی دوران ایک ہندو آگیا۔اس نے فراق صاحب کی باتوں سے مزا لینا شروع کیا تو فراق صاحب نے ہندوؤں کے بارے میں اسی طرح کی باتیں شروع کر دیں۔بولے،"معاف کیجیے گا صاحب،جیسے ہی کوئی مجھے ہندو کہتا ہے مجھے لگتا ہے کہ جیسے کوئی کھیت میں حاجت رفع کر رہا ہے سالا۔" جو کچھ دیر بعد محفل رخصت ہوئی،سب اپنے اپنے گھر چلے گئے،دوسرے دن جب میں گیا تو بولے،"کیا بتائیں کل کچھ ایسی باتیں ہوگئیں۔"

ایک بار کا واقعہ ہے،وہی شام والی بیٹھک تھی۔ڈاکٹر ایشوری پرساد آئے،ڈاکٹر ایشوری پرساد کا نام میں پانچویں جماعت سے سنتا آیا تھا۔تاریخ پر ان کی کتابیں ہیں۔بہت بڑے پروفیسر تھے،وہ کیا کرنے آئے تھے،ایک ایسا الیکشن جس میں صرف پروفیسر ہی امیدوار ہو سکتے تھے۔وہ امیدوار تھے اور فراق صاحب سے ووٹ مانگنے آئے تھے۔فراق صاحب نے کہا،"ارے پنڈت جی آپ بلکل فکر نہ کریں جب آپ کھڑے ہیں تو میں آپ کو چھوڑ کر کسے ووٹ دوں گا۔میں نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر ایشوری پرساد برہمن ہیں،جب فراق صاحب نے انھیں پنڈت جی کہا تو مجھے معلوم ہوا۔ڈاکٹر ایشوری پرساد نے یہ سوچ کر کہ فراق صاحب نشے میں ہیں ان کی باتوں میں مزا لینے لگے۔فراق صاحب کو اندازہ ہوگیا،وہ اس معاملے میں بہت ہوشیار تھے۔انھوں نے کہا،"سنیے پنڈت جی! ووٹ تو میں آپ کو دے دوں گا،وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ایک بات بتائیے کہ آپ شریف ہونا کب سیکھیں گے؟ آپ الٰہ آبادی ہونا

کب سیکھیں گے؟ سر شفاعت نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ امرناتھ جھا نے یہ کام کبھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر تارا چند نے کبھی نہیں کیا، آپ اس چرکٹ چیز کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟ اب آپ الٰہ آبادی ہونا سیکھیے، کچھ شرافت آپ میں آنی چاہیے، آپ کو ہم لوگوں کے نام پر دھبہ نہیں لگانا چاہیے۔" اس کے بعد پروفیسر ایشوری پرساد چلے گئے۔

ایک دن کوئی صاحب آئے، دور سے آواز لگائی، میں ہوں رام بابو۔ شاید ہائی کورٹ میں وکیل تھے، وکیل ہی تھے کیوں کہ میرے سسُر کے دوست تھے۔ بعد میں میری ان سے ملاقات بھی ہوئی، تو پھر اُنھوں نے کہا، میں ہوں رام بابو۔ فراق صاحب وہیں سے بیٹھے بیٹھے بولے آپ چاہے رام بابو ہوں یا دشرتھ بابو، آپ کی آواز نہایت بھونڈی اور بدصورت ہے۔ انھوں نے کہا، فراق صاحب، آپ ایسی بات کررہے ہیں، اتنے ناراض ہیں تو میں جارہا ہوں، فراق صاحب بولے جائیں گے کہاں؟ قدرت نے آپ کو آواز ہی ایسی دی ہے تو جہاں جائیں گے اسی کا سر پھوڑیں گے۔ یہیں چلے آئیے، ظاہر ہے دونوں دوست تھے۔

فراق صاحب کبھی کبھی بڑی سفاکی سے اپنے، اپنی بیوی اور اپنے اس بچے کے بارے میں جس نے خودکشی کرلی تھی، اپنے بھائی یدوپتی سہائے کے بارے میں اکثر ایسی باتیں کرتے تھے جو کوئی مہذب اور شریف آدمی نہیں کرسکتا، اگر کوئی فراق صاحب کے سامنے چھوٹے بھائی وائی صاحب (یدوپتی سہائے) کی تعریف کرتا تو چڑ جاتے، فراق صاحب جتنے غیر ذمہ دار اور بدنام تھے، یدوپتی اتنے ہی ذمہ دار اور قابل پروفیسر تسلیم کیے جاتے تھے، استاد کی حیثیت سے طلبہ ان کی تعریف کرتے۔ ایک بار فراق صاحب کے یہاں ایک لڑکا آیا بہت غیر شائستہ برتاؤ کررہا تھا، آتے ہی کوٹ اتار کر چارپائی پر پھینکا اور لیٹ گیا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ کیسا طالب علم ہے، ہوسکتا ہے رشتہ دار ہو۔ اس نے کہا آپ کو وائی صاحب یاد کررہے تھے، وہ فراق صاحب کے مکان سے ساتھ آٹھ گھر کی دوری پر رہتے تھے، دونوں سگے بھائی تھے اور دونوں الٰہ آباد یونی ورسٹی میں پڑھاتے تھے، لڑکے نے پھر کہا وائی صاحب کو ہارٹ اٹیک آیا
ہے، فراق صاحب نے کہا، نہیں، ایسی تو کوئی بت نہیں، کیسے ہوگیا ہارٹ اٹیک؟"
لڑکے نے کہا، دست آرہے تھے۔" فراق صاحب بولے، تب تو ہارٹ اٹیک ہو ہی نہیں سکتا، کیوں کہ لوز موشن میں ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا۔" یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن لڑکے نے پھر کہا، "جو بھی ہو، وائی صاحب پڑھاتے بہت اچھا ہیں۔" فراق صاحب چپ رہے۔ اس نے پھر کہا، "He is a wonderful teacher، بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔"
فراق صاحب نے کہا، "ہاں وہ اچھا پڑھاتے ہوں گے، میں نے بی اے میں جتنے نوٹس بنائے

تھے، انھیں پڑھ کر ہی اس کے اچھے نمبر آئے۔" اس لڑکے کو پتا نہیں کیا سوجھی کہ اس نے پھر کہا، "صاحب کچھ کہیے، وائی صاحب بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔" اب اس کے بعد فراق صاحب نے جو کہا، اب نہ فراق صاحب اس دنیا میں رہے نہ وائی صاحب، میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اس میں فحاشی نہیں ہے، فراق صاحب نے کہا، "دی مس فارچیون آف دی ادرس، از نیوز ٹو ہم جب کھانا کھانے ٹیبل پر بیٹھتا ہے تو اس کی بیوی ایسی اس کی بیوی ایسی (کہتا ہے) ہی ریزان ہر ٹینڈ دی میزس فرام اور مدر، شی واز اے پرفیکٹ لللائن۔" اس کے بعد پروفیسر یدوپتی سہائے کے علاوہ اپنے خاندان کے بارے میں عجیب طرح کی باتیں بیان کیں۔ اپنی بیوی کے بارے میں جو کچھ انھوں نے کہا اسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ میرے دل میں فراق صاحب کے لیے نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

ایک دو موقع پر انھوں نے اپنی بیوی کی تعریف بھی کی کہ وہ کباب بہت اچھا بناتی تھی، اور کہا جسے انگریزی میں underdone کہتے ہیں، کباب تھوڑا کچا رہ جاتا تھا اور اچھا لگتا تھا۔ ایک بار میں نے پوچھا، "فراق صاحب آپ اپنی بیوی سے اتنے نا مطمئن تھے تو آپ دوسری شادی کیوں نہیں کی؟ انھوں جو جواب دیا وہ بڑا عجیب تھا، کہا کہ I thought that my distruction was complete.

انھوں نے بتایا کہ یہ شادی ان کی مرضی سے ہوئی تھی۔ ایک تھے منشی جگد مبا پرساد، انھوں نے ہی شادی طے کرائی تھی اور فراق صاحب نے چند ذرائع سے کچھ اور باتیں بھی معلوم ہوئیں ہیں۔ ایک ہیں احمد صاحب، یہاں انڈین ایکسپریس میں کام کرتے ہیں۔ ہندی میں اچھی شاعری کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ فراق صاحب کی بیوی کا نام کشوری دیوی تھا۔ دیکھیے میں اتنی خوب صورت نہ رہی ہوں مگر بدصورت بھی نہیں تھیں۔ اچھے خاندان کی تھیں۔ انھوں نے اتر پردیش کے فراق نمبر میں لکھا ہے کہ وہ میرا خیال رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ فراق صاحب لوگوں کو دکھانے کے لیے ڈراما کرتے ہوں۔ اس میں کوئی تعجب بھی نہیں، کیوں کہ ہماری طرف مشرقی یوپی میں اکثر رئیس ایک ڈراما بھی کرتے ہیں، مثلاً ایک بیوی سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوتا، وہ بیوی کو ناپسند کرتے ہیں۔ آخری دنوں میں بھی فراق صاحب اپنی بیوی کو پیسا بھیجتے تھے اور کبھی کبھار وہ آکر فراق صاحب کے یہاں رہتی بھی تھیں۔ جب تک فراق صاحب ملازمت کرتے رہے وہ ساتھ رہتی تھیں بعد میں اپنے میکے رہنے لگیں۔

فراق صاحب کی اغلام بازی کے بارے میں بہت باتیں کی گئیں ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا آپ کا کوئی بیٹا تھا جواب نہیں رہا، اس نے خودکشی کرلی، فراق صاحب نے کہا، 'صاحب، خدا کا شکر ہے وہ اب نہیں رہا۔ اپنا نام بھی ٹھیک سے نہیں لے پاتا تھا۔ نام تھا گووند سہائے، وہ گووند بھی ٹھیک

سے نہیں بول پاتا تھا۔ بولتا تھا گوون، ریل سے اس کے دونوں پیر کٹ گئے تھے۔ گیا تھا خودکشی کرنے
لیکن کر نہیں پایا۔ اس کے پیر کٹ گئے۔ کچھ لوگ اٹھا کر گھر لے آئے، کچھ دن زندہ رہا بعد میں مر گیا۔
فراق صاحب کی دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں کی اچھی جگہ شادی ہو گئی، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے کنیادان
کے وقت فراق صاحب پی کر کہیں بے ہوش پڑے تھے، مجھے لگتا ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہوگا، کیوں کہ فراق
صاحب اپنی خاندانی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہیں کرتے تھے۔

فراق صاحب لباس کے معاملے میں بہت لاپروا تھے۔ میں نے کافی ہاؤس میں انھیں اکثر دیکھا
ہے، پاجامہ کا ازار بند لٹک رہا ہے، گندہ بھی ہوتا لیکن میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کھانے کے بعد دھوتی
کرتا پہن کر، ان کے گھر میں ایک قد آدم آئینہ تھا، اس کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی دیر تک اپنے آپ
کو دیکھتے تھے۔ ایک بار اس حالت میں مجھ سے بولے سب سے اچھا لباس دھوتی کرتا ہے۔

فراق صاحب کو کھانے کا بہت شوق تھا، کھلانے کا بھی تھا۔ ان کے ہاں دو ایک بار کھانا بھی کھایا
ہے۔ کھانے میں ان کو کئی چیزیں پسند تھیں۔ کھانے کے بارے میں بہت باتیں کرتے تھے، مسلمانوں
کے کھانے کی بہت تعریف کرتے، کہتے یہاں تو کھانا وغیرہ کچھ تھا ہی نہیں، ہندوؤں کو کھانے کو کیا تھا،
پوڑا، تلسی داس کا مصرعہ بیان کرتے، جب مانگے تب پو دکھاوے اور کھیر، بتایئے، دو سال کے بچے کا
ٹسٹ ہے کھیر۔ یہ بھی کوئی کھانے کی چیز ہے۔ یہ بھی کہتے کہ کیا سمجھتے ہیں آپ، مسلمان سولہ قسم کی تو
روٹیاں بنانا جانتا ہے۔ وہ روٹی اور دال دے دے تو آپ ہاتھ چاٹتے رہیں گے۔ لیکن فراق صاحب
جب ہندوؤں کے کھانے کی تعریف کرتے تو اپنی یہ بات بھول جاتے، ان کی تعریف کا طریقہ بڑا
عجیب تھا۔

مرچ کے اچار کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ مجھ سے مرچ کا اچار مت کہو، جیسے ہی کوئی مجھ سے
مرچ کا اچار کہے گا، تو اس مرچ میں مجھے ٹسٹ نہیں آئے گا۔ مجھ سے کہو مرچا کا اچار، گورکھپور میں مرچا کا اچار
کہا جاتا ہے۔ ساٹھی کے چاول کا بھات، ارہر کی دال اور آلو کا چوکھا کے بارے میں کہتے تھے کہ اگر یہ کم
بنے ہوں تو میں کسی کو نہیں دیتا۔ ساٹھی کا چاول وہ گورکھپوری سے منگوایا کرتے تھے۔ یہ چاول ساٹھ دن
میں تیار ہوتا ہے۔ مشرقی اتر پردیش میں پیدا ہوتا ہے جسے Transplant نہیں کیا جاتا، بو دیا جاتا
ہے۔ بھادوں میں تیار ہوتا ہے اور میٹھا ہوتا ہے۔ یہ وہی ہے جسے سنسکرت میں شالی کہتے ہیں۔ فراق
صاحب بیگن کے بھرتے کی بڑی تعریف کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ کیسے بنایا جاتا ہے۔

مجھے فراق صاحب کے بارے میں بات کرتے، سوچتے ہمیشہ یہ لگا کہ وہ اندر سے خاندانی زندگی
گزارنے کے آرزومند تھے، خاندان، ان کی زندگی کا ایسا خواب تھا جو کبھی پورا ہی نہیں ہوا۔ اس پر وہ

آزردہ ہوتے اور لوگوں سے کہتے بھی تھے، ایسا نہیں ہے کہ وہ خاندان میں صرف اپنی بیوی کی برائی کرتے تھے بلکہ اپنی ماں اور بھائی کی بھی برائی کرتے تھے۔ ویسے فراق صاحب شریف اور سنسکاری خاندان سے تھے۔ والد گورکھ پرساد عبرت اچھے شاعر تھے۔ فراق صاحب ان کا ایک شعر بڑے فخر سے سنایا کرتے تھے اور انھوں نے لکھا بھی ہے کہ اس مفہوم میں ایسے اشعار بہت کم کہے گئے ہیں، شعر یہ ہے ۔

کیا ڈھونڈتی ہے باغ میں میرے تُو اے خزاں　　　تو جانتی ہے سب کے چمن میں بہار ہے

فراق صاحب کہتے کہ سب کو ذرا لچک کے ساتھ کہیے، سب کے چمن میں بہار ہے۔ یہاں دہلی یونی ورسٹی کے جنوبی حصے کے جو ڈائرکٹر تھے، ابھی مان سنگھ، فراق صاحب ان کے سگے ماموں تھے، فراق صاحب کا خاندان اچھا تھا۔ مہذب تھا۔ اچھی قد کاٹھی کے تھے فراق صاحب شکل صورت اچھی تھی۔ سانولے تھے، فراق صاحب قریبی لوگوں کی برائیوں میں ماہر تھے۔ میں نے ان کی بیوی کو نہیں دیکھا۔ لیکن فراق صاحب اپنی نظموں اور گفتگو میں ان کی بہت برائی کرتے تھے اور اس طور سے کرتے تھے جو انھیں نہیں کرنا چاہیے تھا، یہ سب سن کر فراق صاحب کے بارے میں خراب اور ان کی بیوی کے بارے میں اچھی رائے بنتی تھی، یوں لگتا کہ فراق صاحب، مان لیجیے کہ ایک شخص ہیں جس کی بڑی آرزوئیں اور تمنائیں تھیں جو کافی حسن پرست ہے اور اس کی زندگی کی خواہش کے مطابق نہیں گزری ہو، فراق صاحب اس کا سارا الزام اپنی بیوی کو دیتے تھے، جیسے ان سب باتوں کے لیے وہی ذمہ دار ہو۔ مجھے بڑا تعجب ہوتا، اب بھی ہوتا ہے کہ اتنا حساس شاعر اپنی ساری خامیوں اور خرابیوں کے لیے اپنی بیوی کو ذمہ دار سمجھتا ہے۔ ایک بار بھی نہیں سوچتا کہ اس میں ان کی بیوی کا کیا قصور ہے، وہ شاعر جو دوسروں کے جذبات کے بارے میں نہ سوچ سکے، اس دنیا کے بارے میں نہ سوچ سکے، وہ انسان ہی نہیں، شاعر تو کیا ہوگا۔ فراق صاحب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں، جس کے لیے ان کا دفاع نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ایسی کئی لوگوں کو دیکھا ہے، جو فراق صاحب کی طرح ہی اچھے تھے بلکہ ان سے بہتر شکل وصورت کے تھے، اور ان کی بیویاں فراق صاحب کی بیوی سے، فراق صاحب کے ہی الفاظ میں زیادہ بدصورت تھیں، لیکن انھوں نے اپنی زندگی اچھی طرح نباہ دی۔ الٰہ آباد میں ہی تھے داس بابو، بہت خوبصورت تھے۔ بڑی بڑی آنکھیں، سلونے، ان کے بارے میں پھر کبھی لکھوں گا لیکن ان کی بیوی ان کے مقابلے میں کہیں نہیں تھیں۔ فراق صاحب نے ایک بار مجھ سے خود کہا، "دیکھو داس کو، اس کی زندگی جہنم نہیں بنی، میری زندگی جہنم بن گئی۔"

احمد (علی) صاحب فراق صاحب کے بہت قریب تھے، ان کی شخصیت کے اس پہلو پر نکتہ چینی بھی

کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ فراق صاحب کی بیوی اچھی تھیں، دیکھنے سننے میں۔ کبھی کبھی فراق صاحب کو کوستی بھی تھیں، فراق صاحب ان پر کبھی کبھی زیادتی بھی کرتے تھے۔ جیسے ایک بار وہ گورکھپور سے آئیں۔ جیسے ہی سامان نیچے رکھا، فراق صاحب نے پوچھا" مرچا کا اچار لائی ہو؟" وہ بولی،" بھول گئی۔" فراق صاحب نے اسی وقت اُنھیں لوٹا دیا اور کہا،" جاؤ، مرچا کا اچار لے کر آؤ، تب آنا گورکھپور سے۔ تم بھول کیسے گئیں؟" اور کبھی وہ غصے میں آتیں تو کہتیں،" تم پہلے اپنا تھوبڑا تو دیکھ لو، کیسے ہو۔" دیتی نہیں تھیں، کہنے کا مطلب ہے کہ تصور میں کوئی حسین چاہتے رہے ہوں گے، جو ان کو نہیں ملی۔

ایک بار فراق صاحب نے سب کے سامنے زور دے کر کہا تھا کہ

"I am not a born homosexual, It is my wife, who has made me homosexual."

مجھے لگتا ہے کہ اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے وہ بیوی کو بلی کا بکرا بناتے تھے۔ ان کی بیوی تو سب کے سامنے آ کر بات نہیں کر سکتی تھی، اس لیے فراق صاحب اپنے الزامات کے لیے بیوی کو ذمہ دار ٹھہراتے تھے۔ پنڈت ہری پرساد دویدی کہا کرتے تھے کہ جس میں کوئی خامی یا کمی ہوتی ہے وہ جلد مشتعل ہوتا ہے۔ فراق صاحب کی رباعیوں کا مجموعہ ہے 'روپ'۔ اس میں ایک ایسی گھریلو عورت ہے جو سگھڑ اور سلیقہ مند ہے، حسین ہے، اس کے بچے ہیں۔ شوہر کو مطمئن رکھتی ہے۔ گھر کو ٹھیک رکھتی ہے۔ شاید یہ سب فراق صاحب اپنی بیوی سے چاہتے تھے۔ ج سطرح کی بیوی کا وہ تصور کرتے تھے شاید وہ شاعری میں ہی اُبھر سکتی تھی۔ شاعر جو زندگی میں نہیں پاتا، اسے شاعری کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فراق صاحب اس تلخی اور کمی سے خودنمائی کا بھی کام لیتے تھے، کبھی کبھی مضحکہ خیز اور ناقابل یقین انداز سے اپنے غم کو اتنا بڑا بنا کر پیش کرتے تھے، جسے مکتی بودھ کے الفاظ میں دکھوں کے داغوں کو تمغے کی طرح سجانا اور جس کے لیے پرسائی نے 'کرونا چرانا' لکھا ہے۔ فراق صاحب کی اس فطرت کے بارے میں اردو ناقدین کا بھی کہنا ہے کہ وہ اپنے غموں کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے۔ ایک بار فراق صاحب نے کہا کہ صاحب، رام کا جو بن باس تھا وہ میرے دکھوں کے آگے... انھوں نے بہت خراب لفظ استعمال کیا جس کا مطلب تھا کہ بہت چھوٹا تھا۔ یہ بات بھی اسی طرح ہے جیسے فراق صاحب کہتے تھے کہ اس وقت میں ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہوں، یا اگر مجھے نوبیل پرائز مل جائے تو میں اسے چھوؤں گا بھی نہیں۔ تو ایسی تھی ان کی شخصیت۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر رام ولاس شرما نے مکتی بودھ پر لکھا تھا کہ اپنے کو سب سے بڑا اور اچھا ماننا، دراصل شخصیت پرستی کے سکے کے دو رخ ہیں۔ میرا ان کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اصل میں ان کا تعلق ایک سنسکاری،

اعلا نسب، تعلیم یافتہ خاندان سے تھا۔لیکن ان کی خواہشات غیر متوازن خواہشات نے انھیں شاعر مگر کم تر انسان بنا دیا۔

فراق صاحب ملنسار تھے، خوش گفتار تھے، حاضر جواب اور خوش مزاج بھی تھے۔ اپنے بارے میں الٹی سیدھی باتیں وہ خود پھیلاتے تھے، ان سے وہ خود نمائی کا کام لیتے تھے۔ نام ابھی یاد نہیں آرہا ہے۔ مگر کسی ناقد یا شاعر نے یہ بات کہی تو مجھے اچھی لگی، کسی نے کہا کہ فراق صاحب غالب کے معیار کے شاعر ہیں۔ تو اردو ناقد نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ''ہاں، ایک معنی میں غالب کے درجے کی شخصیت ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ غالب اور ان کی شاعری دونوں کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے، غالب کے بارے میں جو لطیفے یا باتیں ہیں وہ بھی اچھی ہیں۔ ان سے لطف اندوز ہوا جاتا ہے مگر ان کی شاعری پر زیادہ گفتگو ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ ان کی شاعری، ان کے بارے میں پھیلائی رائج باتوں سے بڑی ہے، جبکہ فراق صاحب کا معاملہ برعکس ہے۔ یعنی غالب کے یہاں شاعری اہم ہے اور لطیفے اور دیگر باتیں حاشیے پر ہیں۔ میرے خیال میں یہ افسوس ناک صورتِ حال ہے۔ فراق صاحب بھی بڑے شاعر ہیں۔

فراق صاحب سے ملنا، باتیں کرنا سبق آموز اور عالمانہ ہوتا ہے، جب تک آ ان کے ساتھ رہیں صرف انھیں سنیں۔ پتہ نہیں کب کس موقع پر کوئی اہم اور اعلا درجے کی بات کہہ دیں، ایک فلسفی کیطرح باتیں کریں گے، آپ کو لگے گا کہ یہ شخص تو سقراط، ارسطو اور بودھ کی طرح بول رہا ہے۔ اور کسی لمحہ یہ لگے گا کہ یہ آدمی تو نہایت غلیظ، کمینہ اور اوچھا ہے۔ آپ اسے برداشت نہیں کرسکیں گے۔ وہ قصے بہت سناتے تھے۔ اکثر فحش ہوتے، کبھی کبھی تو بہت بھدے ہوتے، بعض ایسے بھی ہوتے کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ جائیں۔ اس وقت آپ اس کی شاعری کو بھول جائیں، یہ بھی بھول جائیں کہ ایک شاعر یہ باتیں کر رہا ہے۔ میں ہمت کر کے جو شاید سب سے کم فحش دیہی قصہ ہے، نمونے کے طور پر آپ کو سناؤں، ایک بار ہم سب بیٹھے تھے، فراق صاحب کھانے سے فارغ ہو کر آئے، بیٹھے، ان کی ریاح خارج ہوگئی، ہم لوگوں کے چہرے پر مسکان آگئی، اس پر فراق صاحب نے ایک قصہ سنایا۔ ایسا قصہ جو خوشونت سنگھ کی کسی کتاب میں نہیں ہوگا، کہا کہ یہ قصہ ہماری طرف چلتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ایک آدمی چوری سے بہت ڈرتا تھا، اس کے پاس تھے، اس لیے چوروں سے بہت ڈرے، رات بھر نیند نہ آئے، تو اس نے گوری پاروتی، گوری پاروتی ہمارے یہاں قصوں میں آتی ہے۔ مطلب پاروتی، تو اس نے گوری پاروتی اور شنکر کی تپسیا کی، وردان مانگا۔ گوری پاروتی نے اسے وردان دیا کہ جاؤ، اب تم بے فکر ہو کر سوؤ۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس نے پوچھا کیا ہوگا۔ گوری پاروتی نے کہا کہ تم سوؤ گے تو تم تو سوتے رہو گے تم کو پتا بھی نہیں چلے گا، لیکن تم پادتے رہو گے۔ اس سے زور سے آواز نکلے گی، 'کون ہے؟ کیا ہے؟ خبردار۔'

فراق صاحب اپنا جام اٹھاتے ہوئے اور سگریٹ سلگاتے ہوئے یہ قصہ سنا رہے ہیں اور لگ بھگ اودھی میں سنا رہے ہیں، اودھی اور بھوج پوری ملی جلی، جو گورکھپور کی بولی ہے، جیسے انھوں نے کہا کہ جاؤ تو نہ چنت ہو کر سوؤ، تم پادو گے تو اس میں سے نلے گا کون ہے؟ کیا ہے، خبردار آواز زور زور سے آتی رہے گی، صاحب، یہ بڑا وہ ہو گیا کہ وہ سوئے اور پتا چلے کہ محلہ بھر کی حفاظت، اب صاحب، بڑے زور زور سے آواز آئے، چور سب ڈریں۔ ان میں جو سب سے بڑا چور تھا۔ چوروں کے دل کا مکھیا، وہ آیا۔ اس نے دیکھا۔ بولا ارے یہ سالا تو سو رہا ہے، کیا کیا جائے، بڑے چور نے کہا کہ میں اس کا طریقہ سوچتا ہوں۔ اس نے یہ کیا کہ کاغذ کی بڑی سے پونگی بنائی اور اس کے مقعد میں لگا دی، ظاہر ہے کہ فراق صاحب نے مقعد نہیں کہا تھا، جب لگا دیا تو اس کا بولنا بند ہو گیا۔ چوروں کا دل چوری کر کے جانے لگا۔ تب تک اس کے اندر اتنی ہوا بھر گئی کہ وہ پونگی زور سے نکلی اور بڑے چور وا کے سینے میں لگی، وہ وہیں مر گیا۔ فراق صاحب نے اس طرح کے قصے، بہتوں کو سنائے ہوں گے، وہ اس سے لطف لیتے اور بڑے تخلیقی انداز میں سناتے تھے۔

ہندی والوں کے بارے میں ہمیشہ گالی گلوچ سے بات کرتے۔ میں نے دیکھا نرالا جی کے لیے زیادہ تر گالی والی سے بات نہیں کرتے، کہتے بھئی وہ تو بڑا شاعر ہے، And his Juhi ki kali is success and his poems on Badal are simply wonderful. اور کہا کہ ویژن ون ورلی یہ کیا ہے، ورلی، اورلی، خیر نرالا تو وہ نبھا بھی لے گیا۔ پنت جی کی بڑی برائی کرتے تھے، راج کمار ورما جی کو بہت مضحکہ خیز طور پر یاد کرتے تھے۔ مہادیوی ورما کے بارے میں اچھی رائے نہیں تھی، ان کے یہاں رمیش چند دویدی رہتے تھے، وہی رمیش چند، جنھوں نے فراق کی سوانح لکھی ہے۔ میں ان سے کئی بار ملا ہوں۔ رمیش چند دویدی کا Viva تھا۔ جس کے لیے دویدی جی اور رام کمار ورما آئے تھے۔ دویدی جی نے توان سے کہا کہ کچھ شعر سناؤ، کسی کے ہوں۔ انھوں نے کہا صاحب اردو کے شاعر ہیں فراق صاحب۔ ان کا ایک شعر یاد ہے، شعر سنایا تو انھوں نے کہا واہ بھئی، بہت اچھا شعر ہے، یہ بات رمیش چند دویدی نے فراق صاحب کو بتادی۔ فراق صاحب، دویدی کے مداح ہو گئے۔ ان کے بارے میں کہتے تھے، He is a singular figure in Hindi Literature. بہت عمدہ نثر لکھتے ہیں۔ ایک بار میں نے کہا کہ دویدی جی کو یونی ورسٹی سے نکال دیا گیا ہے، انھوں نے وائس چانسلر کو بہت گالی دی اور کہا کہ کہیں سے زہر وہر لا کر پان میں ملا کر وائس چانسلر کو دے دو، سالا ختم ہو جائے۔

پھر جب میں نے ایک مہینے بعد ان سے کہا کہ دویدی جی کو پروفیسر شپ آفر کی گئی ہے اور وہ چنڈی

گڑھ میں پروفیسر ہو گئے ہیں تو انھوں نے کہا بڑا اقبال مند آدمی ہے۔ دو یدی جی سے فراق صاحب کی ملاقات ایک آدھ بار ہوئی ہے۔ مجھے لگتا ہے کیوں کہ جب پنڈت بی چنڈی گڑھ یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے تو فراق صاحب وہاں انگریزی شعبہ میں لیکچر دینے گئے تھے۔ اس تقریب کی صدارت شاید دو یدی جی سے کرائی گئی تھی۔ اس کے بعد پنڈت جی سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ فراق صاحب تمھارے بارے میں بات کر رہے تھے، کہہ رہے تھے کہ تم نے نظم کا کوئی مصرعہ نہیں سنایا تھا۔ میں نے پنڈت جی سے کہا وہ سب تو ٹھیک ہے، فراق صاحب نے تقریر میں ادھر اُدھر کی باتیں تو نہیں کیں۔ انھوں نے بتایا کہ ہندی والوں کی مخالفت کرتے رہے۔ میں نے کہا کہ فراق صاحب، میں کب سے ہندی والا ہو گیا۔ ہندی کی شاعری چاہے جیسی ہو، جب ہندی کے شاعر جیسی شاعری کریں گے ویسی ہی تو ہو گی۔ دو یدی جی اس طرح اکثر ٹکراتے نہیں تھے، فراق صاحب کی شہرت سے بہ خوبی واقف تھے۔ اور اس معاملے میں بہت سمجھ دار تھے۔ اس لیے فراق صاحب سے ٹکرانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

فراق صحب کی عادت تھی، جو ملتا اس سے کہتے ہندی کے کچھ عمدہ مصرعے سناؤ، فراق صاحب نے مجھ سے بھی کہا، اُن دنوں پنت جی کی چند سطریں مجھے پسند تھیں، اب بھی ہیں، بسنت پر...

چنچل پگ دیپ شکھا کے گھر
گرہ مگروں میں آیا بسنت

سلگا پھاگن کا سونا پن
سوندریہ شکھاؤں میں اننت

مجھے لگا کہ ان چھوٹے چھوٹے الفاظ کے ذریعے جیسے کھڑ کھڑ کر کے بسنت آرہا ہو، میں نے فراق صاحب سے کہا کہ اب آپ مجھے بہار پر اردو کا کوئی شعر سنائیں۔ انھوں نے غالب کا شعر سنایا۔

چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

میں نے کہا، فراق صاحب اس میں بسنت اور بہار کہاں ہیں۔ اس میں بسنت تو ہے، اس میں تو ایک بات کہی گئی ہے کہ آئینہ میں نکھار تو بنا زنگ کے نہیں آسکتا تو جو بہار ہے وہ پورا آئینہ ہے، اور چمن اس کا زنگار ہے۔ میں نے کہا اس پر غور کرنا چاہیے کہ رتو ئیں ہیں، آسمان ہے، فطرت ہے، اس کا بیان سنسکرت میں بہت ہوا ہے، چوں کہ ہندی کے پاس سنسکرت کی پوری روایت ہے اس لیے اس کے پاس بہت سے ایسے لفاظ ہیں جو اردو کے پاس نہیں ہیں۔ فراق صاحب نے وہاں تو کچھ نہیں کہا لیکن مجھے لگتا ہے کہ یہ بات اُن کو یاد رہی ہو گی اور دو یدی جی سے کہی ہو گی۔

اس میں شک نہیں کہ ابتدا میں وہ کافی متوازن تھے، خود پرست تو وہ آخر تک تھے ہی، ان کے پی سی ایس کی ملازمت چھوڑ کر جیل جانے اور نہرو جی سے ان کی جان پہچان وغیرہ کے بارے میں بتا چکا ہوں۔ ان کی کوئی بہت اونچی خواہش بھی نہیں تھی کہ مکان ہو جائے۔ یا اور کچھ ہو جائے۔ وہ مرے بھی تو ان کے پاس اپنا مکان نہیں تھا۔ آخر تک اس بینک روڈ والے، یونی ورسٹی کے مکان میں رہے۔ اس بارے میں ایک قصہ ہے، وہ ریٹائر ہوئے تو انھیں یونی ورسٹی والا مکان چھوڑ دینا چاہیے تھا، لیکن جائیں کہاں؟ جب آر کے نہرو وائس چانسلر ہوئے تو ریٹائر لوگوں سے کہا گیا کہ مکان خالی کر دیں، تا کہ یہ بنگلے دوسروں کو دیے جاسکیں۔ بتاتے ہیں کہ ایک دن فراق صاحب وائس چانسلر کے پاس گئے کہا کہ، ''دیکھیے صاحب آپ تو مجھے نکال رہے ہیں، کوئی ایسی جگہ بتا دیجیے جہاں میں اپنا سامان رکھ سکوں۔'' خیر آر کے نہرو نے جب ان کے بارے میں سنا تو کہا کہ نہیں فراق صاحب جب تک چاہیں رہیں، کوئی نہیں نکالے گا آپ کو۔ ایک قسم کی دنیاداری بھی فراق صاحب میں تھی۔ لیکن یہ بھی نہ ہوتی زندہ کیسے رہتے۔ اسی طرح پروفیسر اعجاز حسین نے اپنی خودنوشت میں فراق صاحب کے بارے می ں ایک اچھا واقعہ تحریر کیا ہے جو ان کی شخصیت کی نہایت صاف ستھری تصویر پیش کرتا ہے۔ ایک زمانے میں فراق صاحب اور امرناتھ جھا کلاس فیلو تھے۔ امرناتھ جھا اپنے وقت کے مشہور پروفیسر تھے۔ ان کی بڑی شہرت تھی۔ سرگنگا رام جھا کے صاحب زادے تھے، جو کہتے تھے کہ میری ماں نے تین چار سال کی عمر میں مجھے امرکوش یاد کرا دیا تھا۔ ان کے آگے کوئی زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ سگار منہ میں دبائے بولتے رہتے تھے، امرناتھ جھا کے یہاں دربار لگا رہتا تھا۔ اعجاز صاحب نے لکھا ہے کہ ایک بار فراق صاحب دوستوں کے درمیان بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ انھوں نے نشے میں امرناتھ جھا کو کچھ گالی وغیرہ دے دی۔ امرناتھ جھا وائس چانسلر تھے، دوسرے دن جب فراق صاحب کا نشہ اترا تو انھیں لگا کہ کل کچھ ایسے لوگ بھی بیٹھے تھے جنھوں نے امرناتھ جھا سے میری چغلی کی ہوگی۔ کہیں امرناتھ ناراض ہو گیا تو کیا ہوگا۔ بتاتے ہیں کہ دوسرے دن فراق صاحب امرناتھ جھا کے دربار میں پہنچے، ان سے ملنے بہت سے لوگ آتے تھے۔ قطار میں انتظار کرتے، جس کی باری آتی جا کر ملتا۔ فراق صاحب چوڑی دار اور اچکن پہن کر گئے تھے، جب ان کی باری آئی تو اپنے بٹن کھول لیے، بال بے ترتیب کر لیے۔ امرناتھ جھا نے کہا یار فراق! تم بڑے ٹھیک سے پہنا کرو، بٹن بند کر کے نہیں آئے۔ اب تم یونی ورسٹی میں پروفیسر ہو گئے ہو، کنگھی بھی ٹھیک سے رہا کرو۔ فراق صاحب نے کہا بھائی امرناتھ بات یہ ہے کہ تم تو سرگنگا رام جھا کے صاحب زادے ہو۔ تمھاری والدہ نے تمھیں سب سکھایا ہے، تم اتنے بڑے آدمی ہو، تم کو تو سب طور طریقے، اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ آتا ہے۔ میرے ماں باپ کو کچھ آتا جاتا نہیں تھا، دونوں ایک نمبر

کے بے وقوف تھے۔ مجھے یہ سب کون بتاتا۔ امرناتھ جھا نے کہا فراق صاحب آپ نہایت بے ہودہ اور بدتمیز آدمی ہیں۔ یہاں بیٹھ کر اپنے ماں باپ کو گالی دے رہے ہو۔ فراق صاحب بولے اب میں کسے گالی دوں، اپنے ماں باپ کو گالی دوں گا، اپنے بھائی کو گالی دوں گا، اپنی بیوی کو گالی دوں گا۔ اپنے دوستوں کو گالی دوں گا کس اور کو تھوڑی گالی دینے جاؤں گا، امرناتھ جھا نے کہا، All right firque, I know, I know you are my friend. اور فراق صاحب باہر آگئے۔ بٹن ٹھیک کیے، بال بنائے اور گھر چلے آئے۔

جواہر لعل نہرو کے بارے میں کہا کہ دیکھو وزیر اعظم ہے، میں شاعر ہوں اتنا بھی انتظام نہیں کرسکتا کہ میرے لیے روٹی پر رکھ کر لہسن کی چٹنی کھا سکوں، عزت کی زندگی بسر کرسکوں، اُسے میرا اتنا بھی خیال نہیں۔ دو ڈھائی سال بعد فراق صاحب کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا تو پوشاک وغیرہ پہن کر گئے۔ فراق صاحب کو جواہر لعل نہرو نے ایوارڈ دیا اور کہا فراق صاحب آپ اتنے بڑے شاعر ہو گئے، میں نے کہا فراق صاحب، نہرو جی نے آپ کو ایوارڈ دیا، آپ نے تو کہا تھا کہ نہرو جی بڑے ویسے آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا ارے بھائی میں نے وہ تھوڑا ڈراماٹائز کر دیا تھا۔ بے مطلب کا، جواہر لعل نہرو کی کیا بات ہے۔ جواہر لعل نہرو کی موت پر فراق صاحب نے جو مضمون لکھا تھا، وہ حیرت انگیز ہے۔ نہرو پر اتنا اچھا مضمون بہت کم لوگوں نے لکھا ہے، انھوں نے لکھا کہ نہرو خاندان کے افراد بہت باکردار ہیں اور بتایا کہ جب نہرو جی اور جے پرکاش نرائن کے درمیان کوئی تنازعہ ہوا تھا تو انھوں نے جواہر لعل نہرو کو سپورٹ کیا تھا۔ نہرو جی Ths stupidity of Hinduwalas یا ایسی ہی کوئی بات کہی تھی جس کی جے پرکاش نرائن نے مخالفت کی۔ فراق صاحب کا کہنا تھا کہ چوں کہ جے پرکاش نرائن نے انگریزی مڈل سے پڑھی ہے، اس لیے ان کو stupidityv کا مطلب ٹھیک طرح پتا نہیں۔ انگریزی میں Studpidity کا مطلب اتنا بُرا نہیں جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔

فراق صاحب گاندھی جی، مالویہ جی، جواہر لعل نہرو اور امرناتھ جھا کا اندرونی طور پر بہت احترام کرتے تھے۔ فراق صاحب ڈرامابازی بھی کرتے تھے، خودنمائی بھی تھی۔ ایک بار فراق صاحب گفتگو کر رہے تھے، بی ایچ یو کی بڑی برائی کر رہے تھے اور الٰہ آباد یونی ورسٹی کی تعریف۔ الٰہ آبادی یونی ورسٹی کے بارے میں کہا کہ دیکھیے یہاں کیسے کیسے لوگ ہوئے، گنگا ناتھ جھا، سرشفاعت، رام پرساد میگھ ناتھ ساہا، ڈاکٹر تاراچند۔ میں نے ذرا مزا لینے کے لیے کہا اور آپ فراق صاحب، تو کہا خاموش رہیے اس وقت میں اپنے سے پچاس گنا بڑے آدمیوں کی فہرست بنا رہا ہوں۔

آپ واقف ہوں گے کہ فراق صاحب اپنی کچھ حرکتوں کی وجہ سے بہت بدنام تھے۔ میں نے ان

میں ایسی کوئی کمی نہیں دیکھی۔ ایک بار میں ان کے یہاں شام سات آٹھ بجے گیا، بیٹھے پی رہے تھے۔
پینے کے بعد پتا نہیں کس موڈ میں آئے مجھ سے کہا 'بیٹا تم گھر جاؤ میں تو بہت کٹا پٹا انسان ہوں، بہت ٹوٹا
ہوں۔' اس دن میں دیر تک ان کے پاس رہنا چاہتا تھا کیوں کہ سسرال میں بیوی سے جھگڑا کر کے
گیا تھا۔ میں نے کہا فراق صاحب میں آج بیوی سے جھگڑا کر کے آیا ہوں، دیر تک یہاں رکوں گا۔
بولے ارے تب کیا ہے، لنگی پہن لو، جاؤ ہگو موتو، بلب پھوڑ دو، کسرت کرو، میں سونے جا رہا ہوں۔ اس
دن وہ تقریباً رونے لگے اور بہت مہذب انداز میں بولے، میں اس خاندان سے ہوں جہاں دوسروں
کی تکلیف، دوسروں کی ہنسی اور دوسرے کا غم سکھایا جاتا ہے کہ کیا ہوتا ہے۔ میری زندگی ایسی ہی ہوگئی
ہے۔ ٹھیک ہے بیٹا تم جاؤ اور جب تک چاہو رہو، میں سونے جا رہا ہوں۔ انھوں نے رمیش کو بلا اور کہا،
''دیکھو یہ پنڈت جی ہیں۔ انھیں کھانا کھلا دینا۔ جب میں کھانے لگا تو جھانک کر دیکھا اور بولے وہ جو کے
روا ہے ہمارے یہاں وہ بھی کھلا دینا ان کو، ہمارے یہاں کیلے کو کے روا کہتے ہیں۔ اس کے بعد کہا
اور کسی دن آنا تو ہم تمھیں اور چیزیں کھلائیں گے۔ اس طرح فراق صاحب خاندانی شرافت اور شفقت
کا جذبہ بھی تھا۔ ان کی شخصیت بہت پے چیدہ تھی۔ اچھائیوں اور برائیوں کا سنگم۔

فراق صاحب قصہ سناتے ہوئے گم ہو جاتے، بہت تخلیقی انداز میں قصہ سناتے، درمیان میں کوئی
رخنہ ڈال دے یا کوئی دوسری بات چھیڑے تو ٹھنک جاتے، کہانی سنا ہی نہیں پاتے تھے۔ ہندو مسلم
دونوں کی ہنسی اڑاتے۔ ایک بار کسی مولوی کی نقل اتار رہے تھے کہ وہ کیسے بولتا ہے۔ فراق صاحب کے
مطابق، مولوی صاحب بول رہے تھے، 'یہ جون جبرئیل ہے یہ اللہ میاں کی چٹھی لاوت ہے۔ حضرت محمدؐ
صاحب پڑھتے کیسے، کیوں کہ محمد صاحب تو اُمّی تھے، رمیش بھی بیٹھے تھے انھوں نے درمیان میں کہہ دیا
کہ ہاں صاحب وہ اُمّی تھے، اُمّی کا مطلب جاہل۔ فراق صاحب بگڑ گئے، بولے کسی مسلمان کے سامنے
مت کہہ دیجیے گا، آپ کی خیریت نہیں، قتل کر دے گا آپ کو۔ جاہل کا مطلب صرف اَن پڑھ ہی نہیں
ہوتا۔ جاہل کا مطلب کمینہ بھی ہوتا ہے۔ اس کے بعد بہت کوشش کی گئی مگر فراق صاحب نے قصہ
نہیں سنایا۔ کہا اب میں نہیں سنا سکتا، سب ختم ہو گیا۔ میں تو ایسا آدمی ہوں کہ جب شعر و شاعری کے موڈ
میں ہوتا ہوں تو بکری سے، کتے سے، گدھے سے، بے ہودہ اور بدصورت لوگوں سے جن کی آواز خراب
ہو، بہت ودر رہتا ہوں۔ کیوں کہ میں نے شعر سوچنا شروع کیا، کوئی شعر دماغ میں آیا، اُدھر سالا ایک
کتا بھوں سے بول دیا، تو میرا شعر تو گیا۔ بکری میں میں کر دے گی تو میرا شعر کھا گئی۔ میں شعر سوچ رہا
ہوں اور مان لیجیے کوئی کریہہ منظر دکھائی دے گیا تو میں تو گم ہو جاؤں گا کیونکہ Beauty is good.
beauty is deep but uglyness is deeper.

فراق صاحب کی گفتگو میں خلاقی ہوتی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ اس میں کس حد تک خطرناک پوز ہوتا تھا یا کتنا خودنمائی کا جذبہ۔

کھڑی بولی سے پہلے کی ہندی شاعری، اودھی، برج بھاشا کی بھگتی شاعری، خصوصاً تلسی داس اور کبیر کی شاعری کے فراق صاحب مداح تھے۔ فراق صاحب گورکھپور کے تھے، تلسی داس کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ میں بہت چھوٹا تھا تب گیتا پریس گورکھپور میں رامائن چھپتی تھی، قیمت دو گنی تھی، ایک دن رام چرتر مانس خرید لایا۔ پڑھا تو محسوس ہوا کہ دنیا میں جو بھی قدیم جمالیات ہیں اسے تلسی داس نے دیکھ اور تجربہ کر لیا تھا، تلسی داس اتنے بلند اور وسیع ہیں جس کے نیچے سے سر جھکا کر گزرنا چاہیے، اگر کوئی شاعری کرنا چاہے اور تلسی داس جیسا بننا چاہے تو پاگل ہو جائے گا، شاعری نہ کر سکے گا۔ اس لیے تلسی داس کو پرنام کرنے کے بعد ہی شاعری کی خواہش کرنی چاہیے۔ تلسی داس کے بارے میں فراق صاحب، نرالا کے ہم خیال تھے۔

انھوں نے ہندی شاعروں کا مذاق اُڑاتے اور نصیحت کرتے ہوئے ایک نظم کہی تھی جس کا مصرعہ تھا
ع پوری شدھی پر بائیں لکھیے، شبدوں کا کرم رکھیے ٹھیک

یہ کہتے ہوئے کہ غیر ضروری سنسکرت الفاظ کا استعمال نہیں کرنا چاہیے، انھوں نے لکھا،

آپ سنسکرت نہیں جانتے مجھ کو تو اتنا ہی دکھائے
سنا نہیں آپ نے کوی جی، ادھ جل گگری چھلکت جائے

کبیر کے بارے میں کہتے کہ جو شاعر عوامی بولی میں شاعری کرتا ہو وہ غلط لکھ ہی نہیں سکتا۔ لکھنا چاہے تو بھی نہیں لکھ سکتا۔ جیسے کوئی بچہ بولتے وقت چاہنے کے باوجود الفاظ کی ترتیب نہیں کر سکتا، زبان فطری طور پر آتی ہے، وہ ایک مثال دیتے کہ کے کرماؤں بات کو ٹھریا دوئی جن بولیں اس میں غلطی کہاں ہو سکتی ہے، غلطی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

فراق صاحب کے یہاں میری بڑے لوگوں سے ملاقات کم ہی ہوئی، ایک بار گرمیوں کی دوپہر میں ان کے یہاں گیا۔ کچھ دیر میں مجنوں گورکھپوری آگئے۔ پرانی طرز کی ڈبا نما کار میں آئے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کار انھیں الہ آباد کے کسی دوست نے دی ہوگی۔ ان دنوں مجنوں گورکھپوری ہندوستان میں ہی تھے۔ پاکستان نہیں گئے تھے۔ فراق صاحب انھیں اندر لے گئے۔ مجھ سے کہا، آئیے پنڈت جی آپ بھی آئیے۔ میں اندر گیا۔ فراق صاحب نے اپنے اور مجنوں کے لیے شراب نکالی، کوئی اچھی شراب ہوگی، رنگ سنہرا تھا، فراق صاحب نے اپنے ایک شعر میں کہا بھی ہے، جیسے اشرفیاں پگھلا دی گئیں ہوں، ہاف فرائی آملیٹ بنوایا، چھوٹی چھوٹی پوریاں گول گپے کی طرح۔ ظاہر ہے انھوں نے مجھے شراب دی

نہ آملیٹ، پوریاں اور آلو کی سبزی دی۔ فراق صاحب نے مجنوں صاحب سے میرا تعارف کرایا کہ یہ سنسکرت کا طالب علم ہے، پڑھنے لکھنے والا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔ مجنوں صاحب نے دریافت کیا کس پر پی ایچ ڈی کر رہے ہو؟ اور کس کے ساتھ کام کر رہے ہو؟ میں نے بتایا کہ دویدی جی کے ساتھ ہوں اور قدیم اودھی پر کام کر رہا ہوں۔ مجنوں گورکھپوری نے بتایا کہ شیرف نے اودھی پر کام کیا تھا۔ اسے دیکھ لینا، ہندی ادب کی تاریخ پر ان کا بڑا کام ہے۔ فراق صاحب نے تاریخ کو تعریف سنا بولے، بھئی یہاں پر ادب کی تعریف کا کیا مطلب ہے؟ مجنوں صاحب نے کہا، نہیں میں نے تعریف نہیں تاریخ کہا ہے۔ فراق صاحب بولے، ہاں ہندی کے لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ پورے ادب کو منضبط کرتے اور تاریخ لکھتے ہیں، جیسے رام چندر شکل نے لکھی، اردو والے یہ کام نہیں کر پاتے، اردو میں یہ کام نہیں ہوا۔ میں کچھ دیر بعد چلا آیا۔ وہ بیٹھے کھاتے پیتے رہے۔ اس کے بعد مجنوں صاحب سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔

ایک بار فراق صاحب کے یہاں میری ملاقات پدما کانت مالویہ سے ہوئی۔ تب تک میں نے صرف ان کا نام سنا تھا۔ کافی بزرگ تھے۔ بہت خوبصورت تھے، پان بہت کھاتے تھے، دانت نہیں تھے، پوپلے منہ سے بڑے سلیقے سے پان کھاتے جس سے خوشبو آتی۔ صاف ستھرا کرتا، دھوتی، صدری اور تلک لگائے ہوئے کچھ دیر فراق صاحب سے بڑی محبت سے بات کی اور چلے گئے۔ فراق صاحب نے مجھ سے کہا، دیکھو یہ آدمی کتنی اچھی زبان بولتا اور لکھتا ہے، اتنی اچھی زبان میں نہیں لکھ سکتا، میں اس سے حسد کرتا ہوں۔

نرالا جی سے فراق صاحب کی معرکہ آرائی کا ذکر بہت ہوتا تھا، لیکن فراق صاحب نے جو بتایا وہ یہ کہ نرالا جی ان کے یہاں آتے، بوتل ساتھ لاتے، میں اپنے یہاں پوری اور گوشت بنواتا، ہم دونوں کھاتے پیتے، بات چیت کرتے، کبھی کبھی جھگڑا بھی ہوتا۔

اب میں نے پوری اور گوشت خود کھایا اور نہ کسی کو کھاتے دیکھا اور سنا۔ مگر مجھے یاد ہے کہ فراق صاحب نے یہی کہا تھا۔ ظاہر ہے فراق صاحب نے پوری بات نہیں بتائی، ادھر اُدھر سے کچھ باتیں معلوم ہوئیں جیسے رام وولاس جی نے بتایا کہ دونوں آپس میں بات چیت، سوال جواب کرتے اس میں اتنی فحاشی ہوتی جسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بات ضرور بتائی کہ نرالا جی اور فراق میں جھگڑا ہوتا۔ ایک بار نرالا جی نے چڑ کر کہہ دیا کہ سالے بہت شاعری چھانٹو گے تو مُسرا کھڑا کر دیں گے۔ اب ہم یہ نہیں جانتے کہ مُسرا کا کیا مطلب ہے، میرا خیال ہے کہ اس میں صنعتِ شعری ہے۔ ایک تو مُسرا کا مطلب ہوتا ہے الٹا، سر کے بل کھڑا کر دینا، دوسرا کچھ اور مطلب بھی ہو سکتا ہے، جو علامتی ہے۔ ہندی اور اردو کے بارے میں نرالا اور فراق میں کافی بحث ہوتی۔ جھگڑا بھی کرتے، سنا ہے ایک

بار مار پیٹ تک ہوئی۔ عموماً نرالا جی مار پیٹ نہیں کرتے تھے، کاشی یونی ورسٹی میں میرے ہندی پروفیسر ڈاکٹر شری کرشن لال نے بتایا کہ ایک گوشٹی جس میں نرالا جی بھی تھے۔ فراق صاحب نے کہا دیکھیے چاند ستاروں کی جالی بُن کر رکھ دیتے ہیں، میں پانچ فعل ہیں تو پانچوں کے یہ جو مشترکہ افعال ہیں ایسا چند پروائی سے لے کر نرالا تک کسی بھی ہندی شاعر نے کہا ہو تو میں اس کی ٹانگ کے نیچے سے نکل جاؤں۔ فراق صاحب بولنے میں ڈراما بھی کرتے تھے۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ ٹانگ کے نیچے سے نکل جاؤں تو اٹھ کر کھڑے ہوئے اور نکلنے کے انداز میں جھک گئے۔ کہتے ہیں کہ نرالا جی نے ان کی پشت پر زور سے ایک لات ماری اور چلے گئے۔

فراق صاحب کا خیال تھا کہ مشترکہ افعال، کھڑی بولی کی بہت بڑی طاقت ہیں، کھڑی بولی میں مشترکہ افعال کی معنوی تہیں نمایاں ہوتی ہیں۔ دنیا کی کسی بھی زبان میں اتنے فعل Compound words نہیں بنا سکتے۔ وہ اکثر مثال دیتے، جیسے یہ قلم میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ چھوٹ پڑی، میں نے چھوڑی دی، چھوٹ گئی۔ میں نے اس کو مارا، میں نے اس کو مار دیا، میں نے اس کو مار کے رکھ دیا۔ ان سب کے شیڈ الگ الگ ہیں۔

وہ زبان کی معنوی تہوں کے بارے میں بہت انہماک سے باتیں کرتے، ایک بار پوچھا، آپ لوگ ہندی والے ہیں، کان کا جو نچلے سرا ہوتا ہے، بتائیے اسے کیا کہتے ہیں۔ وہ بتاتے دیکھے اسے کان کی لَو کہتے ہیں، ہونٹوں کے جو کنارے ہوتے ہیں اسے کیا کہتے ہیں، وہ کہتے اِس کو ہونٹوں کی کور کہتے ہیں۔ کمر کے اوپر جو تھوڑی سی خالی جگہ ہوتی ہے، پیٹ اور کمر کے درمیان اسے کمر کا کٹاؤ کہتے ہیں۔ ایک عورت جو اب دوشیزہ نہیں رہی اور جوانی بھی اب جانے جان کو ہے اسے آپ کیا کہیں گے، تو اسے کہیں گے یہ عورت اب اتار پر ہے۔

ہندی اردو کے بارے میں فراق صاحب کی رائے متوازن تھی، صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ وہ غیر جانبداری سے باتیں کرتے۔ فراق صاحب ہندو تھے مگر اردو والے انھیں اردو والا اور مسلمان کہتے تھے، وہ (اردو والے) کہتے فراق صاحب کو ہندو کیسے کہا جائے۔ انھیں دیکھ کر کہا ہی نہیں جا سکتا کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ آپ چاہیں تو انھیں سیکولر کہہ لیں، سچے ہندوستانی، ان میں کسی قسم کی تنگ نظری یا اوچھا پن نہیں تھا۔ میں اعلا کردار کی بات نہیں کہہ رہا۔ جہاں تک تمام مذاہب کو برابر سمجھنے کی بات ہے فراق صاحب کبیر کی روایت کے تھے۔ کبیر داس کی روایت یہ نہیں ہے کہ آپ ہندو ہو کر بھی ہندو اور مسلمان کو یکساں تسلیم کرو، یکساں سے مراد یہ ہے کہ آپ ہندو کو بھی گالی دے سکتے ہو اور مسلمان کو بھی۔ جو سچی بات ہو اسے بیان کر دیں۔

فراق صاحب بھی سنسکرت زبان اور شاعری کے بارے میں بہت عمدہ رائے تھی، انھیں یہ احساس ہمیشہ ستاتا رہا کہ وہ سنسکرت نہیں جانتے۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا بھی ہے کہ جب مجھے خیال آتا ہے کہ میں سنسکرت نہیں جانتا تو خودکشی کیوں نہ کرلوں، حالاں کہ ایک بار میں نے جب اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا، نہیں نہیں میں نے ایسا نہیں کہا۔ لیکن میں نے پڑھا ہے انھوں نے لکھا ہے۔ سنسکرت شاعری کے لفظوں کی توانائی اور نغمگی کے بارے میں بہت احترام سے باتیں کرتے۔

اردو شاعروں میں، میں نے ان کی زبانی غالب کے اشعار بہت کم سُنے۔ غالب کے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی کم پایا۔ یہ تقریباً ویسا ہی ہے جیسے مکتی بودھ، نرالا کے بارے میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ ان کو ایسا دھنش کمان سمجھتے ہیں جسے اٹھانا مشکل ہے۔ غالب کا ایک شعر فراق صاحب نے مجھے سنایا جس کا ذکر میں کرچکا ہوں۔ کبھی کبھی کہتے جیسے بولڈ میٹافور اور امیجز میں نے دیے، ویسے غالب نہیں دے سکتے تھے۔ کہیں نہ کہیں وہ غالب سے ٹکراتے تھے۔ ان کے دل میں غالب کے لیے کوئی نہ کوئی خلش تھی۔ کہتے تھے کہ شعر کہنے کا جیسا سلیقہ مومن کو تھا ویسا غالب کو نہیں تھا۔ مومن کے مداح تھے۔ مصحفی کی بھی بہت تعریف کرتے۔ یگانہ چنگیزی پر تو انھوں نے اپنی کتاب 'اردو شاعری پر بات چیت' میں مضمون بھی لکھا، عاصی غازی پوری، ریاض خیرآبادی اور ایک اور کوئی گوہر گورکھپوری کے اشعار بہت سناتے۔ میرے خیال میں یہ شمالی یوپی کے کم معروف شاعر تھے۔ ایک غزل میں مخدوم کی بھی تعریف کی، بلکہ مخدوم کی زمین میں ایک غزل بھی کہی ع کیشوؤں کو اور بھی چمکا دو کہ کچھ رات کٹے

فیض کی رقیب والی نظم کے بارے میں تو انھوں نے لکھا بھی ہے کہ یہ ایسی نظم ہے جس میں میرے دل کا چور نکلتا ہے۔ دل کا چور نکلنے سے مراد یہ ہے کہ اگر میں یہ کہتا تو مجھے اچھا لگتا۔ اقبال کے معترف نہیں تھے۔

مشکل یہ ہے کہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں۔ ان میں ایسی کئی باتیں ہیں جو انھوں نے غیر رسمی طور پر کہی ہیں۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ ان باتوں کو باقاعدہ تسلیم بھی کرتے ہیں یا نہیں، میں نے جو کچھ ان سے سنا بیان کر رہا ہوں۔

وہ دہلی کے کروڑی مل کالج کے جشنِ فراق میں تشریف لائے، جامع مسجد جگت ٹاکیز کے پاس کوئی ہوٹل تھا وہاں ٹھہرائے گئے۔ میں تھا۔ خلیق انجم بھی تھے۔ وہاں انھوں نے اقبال کے بارے میں کہا کہ جب میں اقبال کے شعر پڑھتا ہوں تو ہمیشہ یہ لگتا ہے جیسے کوئی ایوریسٹ پر بیٹھا بول رہا ہے۔ بڑے ڈرامائی انداز سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اور گھوڑے کی لگام تھامنے کی طرح انھوں نے مصرعہ پڑھا:

بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

اکبرالہٰ آبادی کے بہت مداح تھے، ایک بار نشے میں فراق صاحب، مجاز سے گفتگو کررہے تھے۔ سنسکرت ڈراموں میں جسے آکاش حاشت کہتے ہیں اسی انداز میں کیا ہوگا کہ صاحب تم کیا بڑے شاعر ہو، خود میں نے آوارہ سے بہتر نظمیں کہی ہیں، اس کا یہ مطلب ہوا کہ مجاز کے لیے بھی کوئی خلش تھی۔ مجاز بہت پُرمزاح تھے۔ کہتے ہیں کہ انھوں نے کئی بار فراق صاحب کا مذاق بھی اڑایا۔ جوش کی بے پناہ تعریف کرتے۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ فراق صاحب بھی زبانی جوش کی اتنی تعریف سنی ہے کہ میں خود جوش سے متاثر ہوں اور انھیں عظیم شاعر تسلیم کرتا ہوں۔ یہ شاید فراق صاحب کی باتوں کا اثر ہے۔ دھرتی کی کروٹ میں انھوں نے لکھا ہے کہ جوش اس وقت ہندوستان کی تمام زبانوں کے عظیم شاعروں میں سب سے بڑے شاعر ہیں۔ کہتے 'سالا لیڈر آف مین' معلوم ہوتا ہے۔ اپنی رباعی روپ کا انتساب انھوں نے جوش کو کیا ہے۔ ایک بار فراق صاحب کا جوش سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔ جوش نے اپنی خودنوشت میں اس کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ اس روز میں اپنی پٹھانی پر آجاتا تو پتا نہیں کیا ہوتا۔ فراق صاحب نے روپ کا انتساب کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا ہے اور ایک رباعی بھی کہی ہے۔

اک رات کی بک بک جھک جھک سب کچھ آٹھ دس برس کی دوستی کچھ بھی نہیں

ہمارے یہاں بلرام پور میں ایک شاعر تھے، پیام صاحب۔ فراق صاحب کے بہت قریب تھے۔ ہم لوگ پیام صاحب کے پاس بہت اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اُن دنوں میں ساتویں یا آٹھویں جماعت میں رہا ہوؤں گا۔ مجھے پیام صاحب کی نظمیں یاد ہیں۔ بہت مقبول استاد اور شاعر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ فراق صاحب اور جوش کے جھگڑے کی وجہ یہ تھی کہ فراق صاحب نے کوئی رباعی کہی، جوش نے ان سے کہا کہ دیکھو تم رباعی مت کہا کرو، تم رباعی نہیں کہہ سکتے۔ رباعی کہنا تمھارا کام نہیں، وہ جوش کا حصہ ہے۔ اس پر دونوں میں جھگڑا ہوا۔ فراق صاحب نے شاید یہ کہہ دیا کہ صاحب آپ لوگ کیا جانیں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی شاعری کیا ہوتی ہے اور فردوسی جو ہے وہ والمیکی کی.... بھی نہیں۔ اور یہ بھی کہا کہ تم سنسکرت نہیں جانتے تو شاعری نہیں کرسکتے، تم بڑے شاعر کیسے ہوسکتے ہو؟

جوش نے کہا، تم ہی کون سنسکرت جانتے ہو۔

اس پر فراق صاحب نے جواب دیا، ٹھیک ہے میں سنسکرت نہیں جانتا، سنسکرت کو تو میں نے اپنی ماں کے دودھ میں پیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جوش، فراق سے کم سیکولر نہیں تھے، اسلام اور ملاؤں کے خلاف قاضیوں کے خلاف جتنی نظمیں جوش نے لکھی ہیں، اتنی کسی ہندو شاعر نے اپنے دھرم کے خلاف نہیں لکھی ہوں گی۔ لوگ اس

بات کو نہیں جانتے۔ مگر رہ رہ کر ہوتا یہ ہے کہ ہمارے اندر، ہمارے ہی خلاف ایک شخص بیٹھا ہوتا ہے، جو پتا نہیں کب ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ ایسے کمزور لمحوں کو ہمارا اصل لمحہ نہیں ماننا چاہیے، رشی مُنی، اولیاء کے قدم بھی کبھی کبھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ اس موقع پر یگانہ کا ایک شعر یاد آرہا ہے، مجھے بہت پسند ہے۔

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ راز پستی کے　　　بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

ہم کسی پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں تو ہمارے اندر ایک saddist چھپا ہوتا ہے۔ ایک سنا ک آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں شاید دنیاوی دکھاوا اور حقارت کا جذبہ ہوتا ہے کہ صرف ہم کمینے نہیں ہیں، جن کو دنیا بڑا سمجھتی ہے۔ وہ بھی کمینے ہیں، ہم بڑوں کے بڑکپن پر توجہ نہیں دیتے۔ ان کی زندگی کے جو اچھے اور بے عیب لمحے ہیں وہ حاشیہ کی چیزیں۔ یہ فطرت سب میں ہوتی ہے۔ فراق صاحب میں بھی تھی۔ جوش کی خودنوشت پڑھیے۔ کتنے لوگوں کے بارے میں لکھا ہے، اس سوانح کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بخشا کسی کو نہیں، مگر اپنی شرارتوں کا ذکر زیادہ کیا ہے۔ اس میں یہ جذبہ ہے کہ میں کتنا ازبک، کتنا لاپرواتھا، مجھ میں کتنے عیب تھے۔ اپنی ذات کا احساس میں نے جوش میں نہیں پایا۔ جوش جس طرح لوگوں کا مذاق اڑا سکتے تھے، جس طرح لوگوں کی تعریف کرسکتے تھے، جس طرح سامنے والے کی ایک فقرے میں چٹکی بھرتے، ڈھول چٹا سکتے تھے۔ ایسی لیاقت اردو میں شاید ہی کسی کی ہو، جوش کا رعب داب بھی بہت تھا۔ کوئی ان کے سامنے سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا۔ جوش کی بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات تھی، آخر وقت میں وہ پاکستان چلے گئے، کیوں چلے گئے اس پر اچھا یا بُرا نہیں کہا جاسکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ جوش نے کوئی غلطی کی۔ ہم لوگ وہ ماحول ہی نہیں بنا سکے کہ جوش جیسا بڑا شاعر ہمارے درمیان رہ سکے۔

فراق صاحب کی شاعری کے کئی پہلو ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شاعری میں کافی مشق و ریاضت کی تھی۔ اگرچہ ان کی شاعری ایک خوبی غور و فکر ہے، جسے آپ ان کی علمیت کہیے، ان میں زندگی اور دنیا کا سائنسی اور تاریخی شعور کا اثر زیادہ ہے۔ لیکن وہ زبان اور جذبے کے اظہار میں سہل ممتنع پر بہت زور دیتے تھے، شاعری ایسی ہونی چاہیے کہ وہ شاعری نہیں بلکہ گفتگو معلوم ہو، ایک بار انھوں نے کہا تھا شاعری کیا ہے؟

Poetry is nothing, but illitracy اس بنیاد پر وہ اردو اور انگریزی شاعری کی تعریف کرتے تھے اور کھڑی بولی، ہندی شاعری کی تنقید۔ عہد وسطیٰ کے صوفی شاعروں تلسی، سورداس، میرا کی شاعری کو وہ عالمی شاعری کی مثال تسلیم کرتے تھے۔ ان کے لیے عمدہ شاعری کا نمونہ وہ تھا جس میں عام بول کے لہجے میں کوئی غیر معمولی بات بیان ہو اور جس میں لوک ساہتیہ جیسی تازگی اور نیا پن ہو،

ایسے اشعار جو وہ بہت شوق سے سنایا کرتے تھے ان میں علمیت نہیں ہوتی یا بہت کم ہوتی تھی۔ جہاں جو لفظ ہے وہ اپنے آپ ہی۔ اپنے اندر کے جذبے یا کیفیت کو بیان کر دے اور یوں لگے کہ شاعر نے اپنے طور پر کوئی زور زبردستی نہیں کی ہے۔ اس کی دلیل میں وہ کہتے کہ مومن کو شعر کہنے کا سلیقہ غالب سے بہتر آتا ہے۔ غالب کی شاعری میں جذبے کی پیچیدگی زیادہ ہے، سہل نہیں ہے۔ ایک بار بڑے اشتیاق سے فراق صاحب نے شعر سنایا!

جو اٹھے تو ٹھوکریں مار کر، جو چلے تو سینہ نکال کر

اک آپ ہی جگ میں جوان ہیں کوئی دوسرا تو جواں نہیں

وہ کہتے ایک تو اس میں پوربیا بول ہے کہ تو ہی ایک ٹھو جگ میں جواں سانول گوریا، تو جگ میں جوان ہوتا اور دوسرے یہ کہ یہ شعر اردو شاعری کو لوک ساہتیہ کے زیب لے جاتا ہے جو اُن کا آدرش تھا۔ اُن کے مطابق شاعری ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کی زبان پر چڑھ جائے اور لوگوں کی زبان سے جس کا اوتار ہوا ہو شیکسپیئر پر بولتے ہوئے وہ اکثر شاید پروفیسر ڈن کا نام لیتے تھے، جنھوں نے الہٰ آباد یونی ورسٹی میں بی اے میں انھیں انگریزی پڑھائی ہوگی۔ ان کے بارے میں بتاتے کہ شیکسپیئر کو پڑھاتے وقت پہلے ہی دن انھوں نے کہا تھا کہ:

Shakespeare had no style of his own, all the styles of English language were his style.

فراق صاحب کا شعری سفر بھی اس سمت تھا۔ مگر فراق صاحب کی شاعری کو صرف اسی سے طے نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری میں تاریخی شعور اور علمیت زیادہ ہے، کیسے ہے؟ یہ میں یہاں عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان کے ابتدائی دنوں کا ایک شعر ہے۔

ترکِ محبت کرنے والوں کون ایسا جگ جیت لیا   عشق کے پہلے کے دن سوچو، کون بڑا سکھ ہوتا تھا

اس شعر کا لہجہ لوک ساہتیہ کے قریب ہے۔ جگ میں جوان ہونا کی طرح اس میں بھی جگ جیت لیا ہے۔ اس میں دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس چھند کی زندگی سویا ہے۔ ویسے تو یہ بحر میر کی ہے۔ میر کے دین و مذہب کا کیا پوچھو ہو..... اس میں 'ش' تو ہے۔ ز، غ، ق، ف جیسی آوازیں، جن کی وجہ سے کسی حد تک اردو، ہندی سے الگ ہوتی ہے بلکل نہیں ہیں۔ اسی سے پہلے جو شعر میں نے سنایا، جو اٹھے تو ٹھوکریں مار کر، میں بھی ایسی کوئی آواز نہیں ہے، جو فارسی کی آواز ہو۔ یہ فراق صاحب کا خاص انداز اور آہنگ تھا۔ مجھے یہ خالص ہندوستانی معلوم ہوتا ہے۔

فراق صاحب نے جب ترقی پسند شاعری شروع کی تو ایک طرح انھیں عوامی زبان اور عام فہم شعر

کہنے کا پورا موقع ملا۔ فراق صاحب کی ترقی پسند شاعری میں ہندی، خاص طور پر پوربی اتر پردیش کی لے اور بحروں کا استعمال بہت ملتا ہے، مثلاً:

بندوقوں سے، سنگینوں سے تم نے کیے ہزاروں وار

باری ہے اب مزدوروں کی اک کچ لوہیا اڑ وہمار

یہ آلہا چھند ہے۔ یا پھر.. آگ بھبھوکا گورا مکھڑا اچاپانی کچی آگا

اس چھند میں انھوں نے بہت لکھا ہے، جو دھرتی کی کروٹ کے علاوہ اور بھی کئی جگہ پر ہے۔ دوسری طرف فراق صاحب کی علمیت اور فکر کی بات لیں، ان کی ایک رباعی ہے۔

صحرا میں زماں و مکاں کے کھو جاتی ہیں
صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق
تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

یہ ٹائم اور اسپیس کا خالص اور اپنا خیال ہے، جو تہذیبیں تاریخ میں ایک عرصہ تک پھلتی پھولتی رہتی ہیں اور پھر ختم ہو جاتی ہیں۔ روشن تہذیب، یونانی تہذیب، عرب تہذیب یہ ساری تہذیبیں مٹ جاتی ہیں۔ فراق کہتے ہیں زماں و مکاں کے، ملک اور وقت کے صحرا میں گم ہو جاتی ہیں۔ صحرا کا مطلب وہ لامحدود اور اجنبی دنیا ہے جسے کوئی نہیں پا سکتا۔ وہیں چلی جاتی ہیں۔ ہم سے بہت دور چلی جاتی ہیں۔ کیا کرنے آتی ہیں اور کیوں چلی جاتی ہیں۔ آپ دیکھیں کہ اس میں وقت اور تاریخ کا شعور ملتا ہے۔ اور کبھی کبھی فلسفیانہ انداز میں ملتا ہے۔ یہ لامحدود ماضی، جسے آپ کہیں کہ ماری عقل اور شعور سے پرے ہے۔ جو وقت ہے اس میں ہم سکھ، خوشی اور اپنی زندگی کا مقصد تلاش کرتے ہیں۔ ہمارے وجود کو کتنی کم مہلت حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ لامحدود عرصہ اپنی لامحدودیت میں ایک طرف انسانی جمالیات اور انسانی مقصد کو تکلیف دہ اور فضول بناتا ہے دوسری جانب اسی کو بامعنی بناتا ہے۔ ایک رباعی ہے:

ایک لمحہ بقا سے بھی یہاں لمبا ہے
کونین کی زندگی بھی اک لمحہ ہے
کل فراق میں نے وقت کے چہرے کو
آئینہ حسن دوست میں دیکھا ہے

مطلب یہ کہ سب کچھ عقل اور وقت سے پرے ہے، آپ وقت کو پکڑ نہیں سکتے لیکن جمالیات کا جو بھی تجربہ ہے، چاہے جتنا بھی مختصر ہے۔ تکمیلیت کا اشارہ دیتا ہے۔ فراق صاحب اکثر کہا کرتے تھے، شاید وہائیٹ ہائیٹ کا جملہ ہے۔

Every part of infinite is infinite

آپ واقف ہیں، فراق صاحب نے رباعیاں یوں ہی لکھنی شروع کیں۔ جوش ملیح آبادی سے ان کے جھگڑے کا ذکر کر چکا ہوں۔ بلاشبہ جہاں تک زبان کی روح اور اس پر قابو کا سال ہے، جوش ملیح

آبادی اور فراق گورکھپوری میں کوئی مقابلہ نہیں۔ اس لحاظ سے جوش بڑے عالم اور شاعر تھے۔ فراق صاحب کی رباعیاں بہت صاف ستھری اور سانچے میں ڈھلی رباعیاں نہیں ہیں۔ اثر لکھنوی نے اس پر بہت تنقید بھی کی ہے۔ فراق صاحب کا بڑبولا پن ہی ان کی خوبی ہے۔ ان کی رباعیوں میں ہندوستانی گھریلو عورت مختلف روپ میں نظر آتی ہے۔ اس کا حسن اور کئی اور روپ اور بھی بہت کچھ ہندوستانی متحکوں میں بیان ہوا ہے۔ ایک زمانے میں مجھے یہ رباعیاں بہت یاد تھیں ایک جگہ لکھا ہے۔

زہر آب غم کو حسن کرتا ہے قبول　　　شنکر نے جیسے وش کا پیالا ہو لیا

کنبھ کے میلے کی تصویر کئی بار کی ہے۔ اس میں سورداس کا اثر نظر آتا ہے، جیسے

جل سے بھرے بھرے نین رس کے　　　سکھی ساجن تھے کب اپنے بس میں

یہ چاندنی رات، یہ برہ کی پیڑا　　　الٹ گئی ہو ناگن جیسے ڈس کے

یہ سورداس کی مشہور تشبیہ ہے۔

دیوالی کے موقع پر اس کا گھریلو روپ، برسات میں روپ۔ ہندوستانی عورت کا یہ حسن اور اردو شاعری میں تقریباً ناپید ہے۔ اردو شاعری کا معشوق اس سے مختلف ہے۔ اگر مرد ہے تو وہ دوسرے انداز کا ہے اور اگر عورت ہے تو زیادہ تر کوٹھے والی ہے۔ ایک قسم کی خود سپردگی اور بے لوث محبوبہ کا تصور اردو شاعری میں نہیں کے برابر ہے۔ اسی لیے فراق صاحب کے یہاں اس روپ کا جو خاکہ ملتا ہے وہ اردو شاعری کے لیے بلکل نیا ہے۔

ہے بیاہتا پر روپ ابھی کنوارا ہے　　　ماں ہے پر جو بھی ادا ہے دوشیزہ ہے

وہ مانگ بھری، مدھ بھری، گود بھری　　　کنیا ہے، سہاگن ہے جگت ماتا ہے

یہ ایسی عورت کی تصویر ہے جس کی شادی ہو چکی ہے، نئی نئی ماں بنی ہے، بچہ گود میں ہے جو کنیا ہے، سہاگن ہے، جگت ماتا ہے، ایسی پاکیزہ تصویر اردو شاعری میں نہیں ہے۔ جاگیردارانہ مزاج کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ مرد اولاد کے لیے بیوی رکھتا ہے اور محبت کے لیے محبوبائیں الگ رکھتا ہے۔ جہاں اولاد، بیوی اور محبوبہ یکجا ہو جائے تو خاندانی تہذیب کا آغاز ہوتا ہے۔ خاندان کی ایک خوش گوار تصویر بنتی ہے، جیسے ہماری طرف آلہا میں گایا جاتا ہے:

پان پران، سہاگن سندر، گود کھلاوت سندر بالا

پتا نہیں پان پران کس لیے ہے، شاید نیک شگون اور مبارک کے لیے ہو تو پورا چھند بہت اچھا ہے، ایک آدھ مصرعہ اور سن لیجیے۔ اس کے بعد ہے۔

کھانے کو بھنگ، نہانے کو گنگ اور چڑھنے کو ترنگ

اور آخر میں ہے:

دو منھ، ایک تو دے ہو، دیاندھی دو، مرگ نینی کی دو مرگ چھالا

مجھے فراق صاحب کی رباعی میں اس کی بازگشت کہیں نہ کہیں سنائی دیتی ہے۔

فراق صاحب کے یہاں حسن کے جو مختلف روپ ملتے ہیں ان میں فراق صاحب کے تجربے اور ذاتی پسند کی وجہ سے اپنے آپ انفرادیت اور اصلیت آجاتی ہے، جیسے میں آپ کو ان کی غزل کا شعر سناتا ہوں، جو مجھے بہت پسند ہے، میرا خیال ہے کہ فراق صاحب کو بھی بہت پسند تھا۔ میں نے ان اشعار کو انھیں گنگناتے سنا ہے۔

سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں ۔۔۔ لیکن اس ترک محبت کا بھروسہ بھی نہیں

مدتیں گزری تری یاد بھی آئی نہ ہمیں ۔۔۔ اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست ۔۔۔ آہ اب مجھ سے تیری رنجش بے جا بھی نہیں

فراق صاحب اکثر ایک لفظ کو دو بار استعمال کرتے تھے، ان کے ایسے بہت سے اشعار ہیں جن میں کسی لفظ کا ساتھ ساتھ دو بار استعمال کیا گیا ہے۔

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس

یہاں زبان کے استعمال کی عجیب بات ہے، جب آپ کہتے ہیں دھواں دھواں تھی یا اداس اداس تھا تو حقیقی طور پر معنی یہ ہوتا ہے کہ شام دھواں تھی لیکن جب کہیں گے کہ شام دھواں دھواں تھی تو مطلب یہ ہوگا کہ بلکل ٹھیک دھواں نہیں تھی، دھواں جیسی تھی۔ یا جب کہا کہ حسن بھی تھا اداس اداس، تو حسن اداس کہنے سے بھی ایک عکس بنے گا مگر اداس اداس کہنے والا یہ اشارہ کرنا چاہتا ہے کہ میں جس اداسی کی بات کر رہا ہوں وہ عام اداسی نہیں ہے۔ اس طرح معنی میں کچھ وسعت آجاتی ہے۔

اب آپ دیکھیں:

شام بھی تھی دھواں دھواں، حسن بھی تھا اداس اداس ۔۔۔ دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

اب یہاں یاد سی آکے رہ گئی نہیں ہے بلکہ کچھ اس طرح یاد آئیں کہ جیسے یاد آرہی ہیں۔ اس طرح ایک لفظ کے دوہرے استعمال سے فراق صاحب نے جذبے کی نزاکت کو بیان کر دیا ہے۔ یہ بات انھیں دوسروں سے الگ کرتی ہے۔ سننے میں بھی اچھا لگتا ہے۔

فراقصاحب کی شاعری میں جمالیات کے بڑے نازک اور اچھوتے تجربے بیان ہوئے ہیں۔ جو کسی اور جگہ نظر نہیں آتے۔ ایسا ہی ایک شعر ہے ۔

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی ۔۔۔ یہ حسن و عشق تو دھوکہ ہے سب مگر پھر بھی

اس شعر کو آپ گا کر یا اچھے سے اچھے راگ میں ڈھال کر پڑھیں تو شعر کا مفہوم چوپٹ ہو جائے گا۔ یہ شعر لکھا ہی گیا ہے گفتگو کے لہجے میں۔ اسی میں یہ اپنا معنیٰ کھولتا ہے۔ یہاں پھر بھی کے بعد کچھ نہ کچھ کہہ کر سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ آگے ہے۔

کہوں یہ کیسے ادھر دیکھ یا نہ دیکھ ادھر | کہ درد، درد ہے پھر بھی، نظر نظر پھر بھی

مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا لگتا ہے کہ فراق صاحب نے بھی آنکھوں پر اچھے شعر کہے ہیں۔ میں اردو کے بارے میں تو یقین سے نہیں کہہ سکتا بس یقین سے سنسکرت اور ہندی کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ حالاں کہ میری بات اردو کے بارے بھی درست ہوگی کہ کوئی ایسا بڑا شاعر نہیں ہوگا جس نے آنکھوں پر اچھے شعر نہ کہیں ہوں۔ ہندی میں تلسی داس اور نرالا ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس باب میں نرالا تلسی داس سے بھی بہتر ہیں۔ قدیم بھارت میں آنکھوں کے سلسلے میں سب سے بڑے شاعر کالی داس ہیں۔

تو خیر، فراق صاحب کے یہاں بھی آنکھوں پر اچھے شعر ہیں۔ جل سے بھرے بھرے نین والی بات تو میں نے ابھی آپ سے کہی ہی ہے۔

تری وہ نرم دوشیزہ نگاہیں دل نہیں بھولا | انہیں جب جب تری آنکھیں نگاہ اولین نکلی

کچھ اور شعر آنکھوں پر لکھتے تو مجھے اچھا لگتا، ایک یہ ہے کہ

دل کے آئینہ پہ پڑتی ہے اس طرح سے نگاہ | جیسے پانی میں ہچک جائے کرن کیا کہنا

وہ آنکھ زبان ہوگئی ہے | ہر بزم کی جان ہوگئی ہے

یہ ایک طرح سے 'گرا نین، نین بنو بانی' کا ترجمہ ہے۔

فراق صاحب کے یہاں جب ترقی پسند شاعری ان کے جمالیاتی ذوق سے ہم آہنگ ہو کر آتی ہے تو اچھے مصرعہ نکلتے ہیں۔

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم | صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کریں

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا | کچھ فضا، کچھ مسرت پرواز کی باتیں کریں

فراق صاحب خاص طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر ان کی بعض نظمیں بھی کافی اچھی ہیں، اردو میں مجاز کی نظم 'آوارہ' اپنے زمانے کی حیرت انگیز نظم ہے۔ کئی لحاظ سے فراق صاحب کی ایک طویل نظم 'جگنو' مجھے بہت پسند ہے اس نظم کو پڑھ کر یہ امید بندھی تھی کہ کھڑی بولی میں سورداس جیسی شاعری کی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں سورداس کی سی معصومیت اور پاکیزگی تو نہیں ہے مگر کسی حد تک ہے بھی، کیوں کہ وہ نظم مثال پر ہے۔

فراق صاحب کی دوسری نظم جو مجھے پسند ہے، وہ ہے 'آدھی رات'۔ اس میں آدھی رات کی خوابیدہ فضا

میں فطرت کے حُسن کا خزانہ کھلا پڑا ہے اور ہر طرح کی خوشبوئیں ایک دوسرے سے مقابلہ آرائی کر رہی ہیں۔ اور آخر میں ۱۹۶۲ء کی چین کی جنگ کے دوران کہی ہوئی فراق صاحب کی وہ مشہور غزل جو بہت مقبول ہوئی تھی، سب اسے گاتے گنگناتے پھرتے ہیں ۔

سخن کی شمع جلاؤ بہت اداس ہے رات — نوائے میر سناؤ بہت اداس ہے رات
کوئی کہے یہ خیالوں سے اور خوابوں سے — دلوں سے دور نہ جاؤ بہت اداس ہے رات
پڑے ہو دھندلی فضاؤں میں لحفہ لپیٹے ہوئے — ستارو سامنے آؤ بہت اداس ہے رات

■■

اسیم کاویانی

کیا جانتے نہیں ہو ندا فاضلی کو تم

بظاہر اس مضمون کا عنوان کچھ درشت لگ رہا ہے پر قارئین جانتے ہی ہوں گے کہ یہاں ندا ہی کے ایک مصرعے 'کیا جانتا نہیں ہوں ندا فاضلی کو میں' کو بتصرف اپنایا گیا ہے۔ باعثِ تحریر یہ امر ہے کہ اگر چہ ندا فاضلی کو ہم سے بچھڑے چار برس بھی نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کے حالاتِ زندگی پر جن لوگوں نے بھی قلم اٹھایا ہے، ان میں سے بیشتر نے جا بجا غچے کھائے ہیں۔ اپنی خودنوشت تحریر کرتے ہوئے ندا کے فکشن کے سے اسلوب نے اپنی وطنیت، تعلیم، عشق اور شادی کے تعلق سے وضاحتِ سنین سے گریز اور واقعات کے ابہام سے جو الجھاؤ پیدا کیے ہیں، لکھنے والوں کے قلم وہیں لڑکھڑائے ہیں۔ میری کوشش ہوگی کہ پہلے ان امور کو سلجھادوں۔

وطنیت، پیدائش: ندا فاضلی کا یہ بیان کہ ان کے نام میں 'فاضلی' کا تعلق کشمیر میں واقع ایک علاقے فاضلہ سے ہے جو کہ ان کا آبائی وطن تھا، ایک افسانہ ثابت ہو چکا ہے، اس لیے کہ کشمیر میں فاضلہ نامی کوئی مقام نہیں۔ ذاکر خان ذاکر نے ندا فاضلی کے انتقال سے کچھ دنوں قبل ایک انٹرویو میں ندا سے ان کے کشمیری تعلق کے بارے میں جاننا چاہا تھا تو انھوں نے فلسفیانہ انداز میں یوں جواب دیا تھا ؎

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر برسوں سے
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

...... میرے خیال سے ادیب، شاعر، نقاد کا سوچنے والا ذہن ماں کی کوکھ سے پیدا ہوتا

ہے، لیکن وہ زندگی بھر وراثت کے بوجھ کو گدھے کی طرح لادے ہوئے نہیں چل سکتا۔ وہ اپنی وراثت میں کچھ چھوڑتا جاتا ہے اور کچھ جوڑتا جاتا ہے اور اس طرح وہ اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے...... غالب کے انسان کا رشتہ کشمیر سے بھی ہے، ایران سے بھی ہے، پاکستان سے بھی ہے، امریکا سے بھی ہے، انگلینڈ سے بھی ہے۔ میرے والد کے پاس ایک شجرہ تھا، اس شجرے کی ابتدا ایک فاضل نام کے شخص سے ہوئی تھی۔ ممکن ہے کہ فاضل صاحب کشمیر سے آئے ہوں!' (روزنامہ 'انقلاب' ممبئی، فروری 2016)

'ممکن ہے' سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کے کشمیری ہونے کا انھیں خود یقین نہیں تھا۔ اس کے علاوہ 'فاضلہ' جسے وہ کشمیر کا ایک علاقہ بتایا کرتے تھے، یہاں ان کے مورث اعلا کا نام بن گیا۔ معاملہ یہ نظر آتا ہے کہ جس طرح غالب نے بے اُستادا کہلانے سے بچنے کے لیے عبدالصمد نامی ایک ایرانی نژاد استاد گھڑ لیا تھا، اسی طرح ندا نے قلمی زندگی کے آغاز میں اپنے خاندانی شجرے کے بانی کو 'فاضل' نام دے کر اپنے تخلص کے ساتھ فاضلی کا لاحقہ جوڑ لیا تھا کہ ایک فضیلت جھلکے، لیکن اپنی زندگی میں وہ کبھی بھی فاضلی کی تسلی بخش وضاحت نہیں کر پائے تھے۔ اپنی عمر کے آخری دور میں وہ ایک فنکار کا رشتہ ملک و قوم سے بالاتر بتا کر اور سارے عالمِ انسانیت سے جوڑ کر اِس طرح کے سوالوں کو غیر اہم باور کراتے رہے تھے جو کہ غلط بھی نہیں۔

ندا کی پیش کردہ دیگر سوانحی تفصیلات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ان کے والد یو پی کے ایک قصبے ڈبائی سے گوالیار میں آ کر بس گئے تھے، جہاں وہ ریلوے کے محکمے میں افسر ہو گئے۔ مثل مشہور ہے کہ آدمی اپنے پیٹ کے وطن میں رہتا ہے، سو گوالیار ان کا وطن نہیں تو وطنِ ثانی ٹھہرا۔ یہیں ان کا معاش جما، خاندان پھلا پھولا اور وہ زندگی کے عیش اور آزمائشوں سے گزرے۔ ندا اپنے والدین کی ان چاہی اولاد تھے، اس لحاظ سے کہ ان کی والدہ دوسرے کم سن بچوں کی پرورش کے خیال سے اسقاط حمل چاہتی تھیں لیکن ان کی کوششیں ناکام رہیں۔ زچگی کے لیے ہمیشہ کی طرح اپنی والدہ کے ہاں دلی آئی تھیں، جہاں ایک سرکاری اسپتال میں میں 12 اکتوبر 1938 کو ندا کا جنم ہوا تھا۔ راقم نے 'اعتراف' کے مدیر وقار قادری سے استفسار کیا تھا کہ انھوں نے 'ندا فاضلی نمبر' میں ندا کا سنِ پیدائش 1940 اور مقام گوالیار کس بنا پر درج کیا ہے؟ تو انھوں نے نجانے کس بوتے پر یہ جواب دیا تھا کہ ندا کے پاسپورٹ میں یہی درج ہے۔ راقم نے ندا کی شریکِ زندگی مالتی جوشی سے ندا کے پاسپورٹ کی نقل حاصل کی تھی۔ اس میں ندا کی پیدائش کی تاریخ اور سن 12 اکتوبر 1938 ہی درج ہے اور مقامِ پیدائش گوالیار، جو ممکن ہے کہ کسی تکنیکی مصلحت سے دیا گیا ہو۔

تعلیم: ندا نے شاید اپنے ناولانہ اسلوب کے باعث اپنی خودنوشت میں واقعات کے ماہ و سال کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا ہوگا، پھر بھی ان کی زندگی کے واقعات کے سیاق وسباق پر غور کرکے تعینِ زمانہ کیا جاسکتا ہے۔ تقسیمِ ہند کے بعد کے مخدوش حالات میں ندا کے والد نے اپنے اہل وعیال کو تحفظ کے خیال سے بھوپال بھیج دیا تھا۔ ان دنوں ندا گوالیار کے وی سی ہائی اسکول میں چھٹی کلاس میں پڑھ رہے تھے۔ بعد میں بھوپال لوٹ کر اسی اسکول سے انھوں نے تیسرے درجے میں میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ راقم نے ندا فاضلی پر مونوگراف میں سہواً ان کے بھوپال منتقل ہونے کا سال 1950 اور میٹرک میں کامیابی کا سال 1955 لکھ دیا ہے جب کہ ان کے سوانح میں بر سبیلِ تذکرہ آئے گاندھی جی کے قتل کے پس منظر سے ان کی بھوپال میں منتقلی کا سال 1948 ٹھہرتا ہے اور اس طرح میٹرک کرنے کا سال قیاساً 1953۔ گوالیار کے وکٹوریا کالج میں سائنس اسٹریم میں متواتر دو سال فیل ہونے کے بعد ('دیواروں کے بیچ'، پہلا اڈیشن، ص:72) یا 'دو تین سال ضائع' کرنے کے بعد (ایضاً، ص:87) انھوں نے فرسٹ ایئر آرٹس میں داخلہ لیا تھا اور اس وقت چونکہ وہاں شعبۂ اردو ختم ہو چکا تھا، اس لیے ہندی میڈیم سے (قیاساً 1961 میں) بی اے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس طرح جب انھوں نے اپنا ایم اے کا پہلا سال مکمل کیا تھا اور ان کا خاندان پاکستان کوچ کر گیا تھا تب 1962 کا سن رہا ہوگا۔ بقول ان کے وہ 'سن پینسٹھ کی ایک دوپہر کو بمبئی کے VT اسٹیشن پر اترے تھے۔' ('دیواروں کے باہر' پہلا اڈیشن، ص:8) برسوں بعد اردو رسائل کو انھوں نے جو کوائف بہم پہنچائے، اس میں وکرم یونی ورسٹی (اجین) سے ایم اے (اردو، ہندی) کیے جانے کی اطلاع دی گئی تھی۔

عشق اور شادی: ندا نے کمال راستی سے کام لے کر اپنے والد کے تذکرے میں وضاحت سے لکھا ہے کہ وہ ایک رنگین مزاج شخص تھے اور ان کی رنگ رلیوں اور شب گردیوں نے ان کی والدہ کو اختلاجِ قلب کی مریض بنا دیا تھا۔ ایک طوائف سے ان کے دو بیٹے بھی تھے۔ ان کی مدخولہ زبین اور اس سے ہوئے بیٹے چھٹو کی کردار نگاری میں ندا نے خاص زورِ قلم صرف کیا ہے۔ ندا کے بھائی مصطفی حسن جو اپنے خاندان کے پاکستان پہنچنے سے کافی پہلے وہاں جا کر settle ہو چکے تھے، گوالیار میں اپنے دوست سوشیل کدم کی چھوٹی بہن کو حاملہ کر گئے تھے اور اس کی منت وسماجت کے خطوط کے باوجود نہیں لوٹے تھے۔ خود ندا بھی گوالیار میں بیر کمار اور بھوپال میں الطاف جیسے دوستوں کی صحبت میں قبل از بلوغت ہی بالغانہ تجربوں سے گزر چکے تھے۔ بیر کمار کی موت کے بعد اس کی داشتہ شیلا داشتہ آید بکار کی مثل مالی طور پر ندا کے کام آتی رہی تھی اور بالآخر وہ جسمانی دوریوں کو بھی

عبور کر گئے تھے۔ بقول ندا جب انھوں نے شیلا کو اجرت دینے کی کوشش کی تھی تو شیلا نے جواب دیا تھا: 'تم میرے مرد کے دوست ہو، وہ تمھیں بہت چاہتا تھا۔ میرے تمھارے بیچ گاہکی کیسی؟' معترضہ طور پر عرض ہے کہ شیلا کے اس رویے کو بشری موانست و چاہت کا ایک اچھا مظہر سمجھا جا سکتا ہے۔ بس، ایسے میں سلام بن رزاق کا یہ تبصرہ کہ: '(شیلا) کے الفاظ کے پیچھے جو اخلاقی قدر یا جذباتی نکتہ ہے وہ شیلا کے کردار کو کوٹھے سے اٹھا کر مندر کی ویدی پر بٹھا دیتا ہے۔' ('اعتراف' ندا فاضلی نمبر، ص: 225)، ایک over statement ہی کہا جائے گا۔ یہ تو اندھ وشواش یا وفورِ عقیدت کی برسوں کی جبہ سائی ہے جو کسی کو مندر کی ویدی پر براجمان کرتی ہے۔ ندا اپنی کالج فیلو مس ٹنڈن پر بھی عرصے تک مختلف زاویوں سے نظریں سینکتے رہے تھے، لیکن وہ اپنی زندگی کے واحد عشق کے احوال میں جو انھیں عشرت سے تھا، کئی جگہ اہمال چھوڑ گئے ہیں۔

عشرت، ندا کی ہم محلہ اور بچپن ہی سے دیکھی بھالی تھی۔ عشق کالج میں پروان چڑھا تھا جہاں ندا اُس سے سینئر تھے۔ عشرت کی ایک تجربہ کار اور جی دار سہیلی وجیہ کی مدد سے وہ وصالِ یار کے مزے بھی لوٹ چکے تھے۔ عشرت اپنے خاندان کی مخالفت کو خاطر میں نہ لا کر ندا کے ساتھ بھاگ چلنے کے لیے بھی تیار تھی لیکن ندا ہی اپنی بے روزگاری کے باعث ہمت نہیں کر پائے تھے۔ پھر یوں بھی ہوا کہ ندا کا عشق 'یک طرفہ' رہ گیا اور عشرت نے کالج کے ایک اور سینئر ساتھی سے دل لگا لیا۔ ندا نے عشرت کی دو بہنوں کے سلسلے میں اطلاع فراہم کی ہے کہ چھوٹی نے ایک ہندو سے ناتا جوڑ لیا تھا اور دوسری اپنی پسند کے ایک شخص کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ غرض کہ اس باب میں ندا اور عشرت دونوں کے یہاں این خانہ ہمہ آفتاب است کی مثل صادق آتی ہے۔ بعد میں ندا نے تلاشِ معاش میں بمبئی آ کر بعد از خرابیِ بسیار، ادب سے تو نہیں البتہ فلموں میں گیت نگاری سے اپنے دلدر دور کیے تھے اور 'روٹی، گھر، کپڑے اور کتابوں کو ایک جگہ کرنے میں اسے بیس سال سے زیادہ لگ گئے۔' تھے ('دیواروں کے باہر'، ص: 8) اور وہ کھار ڈانڈا میں اپنا ایک فلیٹ خرید پائے تھے۔ انھیں دنوں غزل سرائی میں اپنی جگہ بنانے میں کوشاں مالتی جوشی ندا سے ان کی کچھ غزلوں کی طلب اور اپنے ڈکشن کو سدھارنے کے لیے ملی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ ان کی زندگی میں دخیل ہوتی گئی۔ قرائن کہتے ہیں کہ ندا اور عشرت میں رابطہ تو رہا ہوگا لیکن ان کے ملاپ میں کبھی انا حائل ہوگئی تو کبھی بدگمانیاں آڑے آگئیں۔ 1989 میں مالتی اپنے ایک میوزک کنٹریکٹ پر مڈل ایسٹ میں بحرین گئی ہوئی تھی، تب پاکستان سے ندا کی بہن طلعت کا آنا ہوا، جسے مالتی سے ندا کا رشتہ پسند نہ تھا۔ طلعت نے کسی طرح سے عشرت کو گوالیار سے بلایا اور ایک سادہ سی تقریب میں ندا سے عشرت کا نکاح کرا دیا گیا۔ گواہوں میں فلم ایکٹریس تبسم، صبا

فاضلی اور اوشا کھنا شامل تھے، پر نہ جانے کیا بات ہوئی کہ نکاح کے دن ہی وہ (عشرت) بمبئی میں ٹھہرنے کی بجائے واپس گوالیار چلی گئی اور پھر باوجود کوششوں کے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھی۔ ندا کی زندگی کے سکھ دکھ کی ساتھی مالتی جوشی بن گئی۔ ندا کو بھوپال کے قاضی سے عشرت کا خلع کا نوٹس ملا تھا اور پتا چلا تھا کہ وہ بھوپال منتقل ہوگئی ہے اور اپنے کالج کے اسی سینئر ساتھی کی شریک حیات بن چکی ہے۔ عشرت کے قصے کا ایک دل چسپ اور حیران کن پہلو یہ ہے کہ تقریباً چوتھائی صدی بعد بھی اس کے دونوں عاشق اس کے لیے چشم براہ نظر آتے ہیں۔

کسی بھی عورت کی زندگی میں ازدواج کا بندھن ایک خاص اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور وہ شاید ہی کبھی اپنی شادی کی سال گرہ بھولتی ہوگی لیکن سوئے اتفاق سے مالتی جوشی کو اپنی 'شادی' کے سلسلے میں زیادہ کچھ یاد نہیں۔ اس سلسلے میں راقم کے استفسار پر وہ بس اتنا ہی بتا پائی کہ بابری مسجد کے بعد برپا ہوئے فسادات کے کچھ دنوں بعد ان کی شادی ہوئی تھی۔ 'دیواروں کے باہر' میں ندا نے صاف طور پر لکھا ہے کہ شادی کے انسٹی ٹیوشن میں وہ یقین نہیں رکھتے۔ 'مالتی آزاد رشتے کو پابند بنانے' کے لیے کورٹ سے فارم بھی لائی تھی، لیکن بقول ندا وہ 'جیسے آئے تھے ویسے ہی (کورے) گھر میں کہیں پڑے ہیں۔' ('دیواروں کے باہر'، ص: 57)۔ یعنی اس کتاب کے دمِ تحریر تک یا مالتی جوشی سے تعلق قائم ہونے کے آٹھ برس بعد تک ندا نے ان پر دستخط نہیں کیے تھے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ندا کی خودنوشت سوانح عمری میں بکھری ہوئی ان تفصیلات کے باوجود بھی اُن پر لکھنے والوں کے یہاں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے۔ اس مضمون میں ندا کے حالاتِ زندگی پر لکھی گئی تحریروں کے سہو وخطا کے کچھ مقامات نشان زد کرتے ہوئے اپنے کچھ معروضات پیش کر رہا ہوں۔ شاید اس سے ندا پر آئندہ لکھنے والوں کو کسی قدر رہنمائی حاصل ہو جائے۔

'ندا کا تخلیقی سفر' (ڈاکٹر سیفی سرونجی) اور 'ندا فاضلی' (پروفیسر علی احمد فاطمی)

میرے پیش نظر ندا فاضلی کی حیات وفن پر لکھی مذکورہ دو کتابیں موجود ہیں۔ سیفی سرونجی نے پی ایچ ڈی کے لیے ندا فاضلی کی شاعری کو موضوع بنایا تھا، جب ان کی وہ تھیسس رد کر دی گئی تھی تو انھوں نے اپنا پی ایچ ڈی کا موضوع بدل لیا تھا اور ندا پر اپنی قلم فرسائی کو 'ندا کا تخلیقی سفر' کے نام سے کتابی صورت دے دی تھی، جسے ندا کی شاعری پر لکھی گئی اولین کتاب کہا جا سکتا ہے۔ کتاب کی تمہید میں لکھا ہے کہ اس کی تیاری کے دوران وہ کئی مرتبہ بمبئی آئے تھے اور ندا بھی کئی بار سرونج تشریف لے گئے تھے۔ وہ ندا کے ساتھ گوالیار بھی گئے تھے، جہاں ندا نے اپنا بچپن اور جوانی کا زمانہ گزارا تھا۔ اتنی مشقت کے

باوجود کتاب ایسی ہی ہے جیسی کہ سیفی سرونجی کی کتابیں ہوتی ہیں۔ ان کا پڑھنا اتنا ہی سودمند ہے جتنا نہ پڑھنا۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مطبوعہ 'ندا فاضلی' میں پروفیسر علی احمد فاطمی نے ندا کی حیات وفن پر مختلف لکھنے والوں کے نئے اور پرانے مضامین کو یکجا کر دیا ہے، جو کہ ندا کے فن کی تفہیم میں یقیناً معاون ثابت ہوں گے۔ تنقیدی وتبصراتی مباحث سے قطع نظر میرا مقصود یہاں صرف واقعاتی صحت وسقم پر نظر کرنا ہے، اس لحاظ سے دیکھتا ہوں تو جہاں کہیں ندا کے حالاتِ زندگی بیان ہوئے ہیں، غلطیاں در آئی ہیں۔ مثلاً نفیس الحکیم اور محمد عرفان نے اپنے مضامین میں بالترتیب ص:151 اور ص:167 پر یہ باور کرانا چاہا ہے کہ تقسیمِ ملک کے بعد ندا کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا تھا۔ اسی طرح ندا معید نے بھی تحریر کیا ہے کہ 'فرقہ ورانہ فسادات نے گھر کے ساتھ دلوں کو بھی بانٹ دیا تھا۔ ندا کا خاندان 1940 میں پاکستان منتقل ہو گیا تھا۔' (ص:160)، جب کہ اس وقت تو پاکستان پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ دراصل تقسیمِ ملک کے کوئی پندرہ برس بعد ندا کا خاندان پاکستان منتقل ہوا تھا۔ ڈاکٹر فخر الکریم نے ندا کے شعری مجموعوں کی تعداد پانچ تک محدود کر دی ہے (ص:113) اور ڈاکٹر نشاط فاطمہ کے نزدیک ندا کے 'دس شعری مجموعے اردو میں اور آٹھ ہندی میں ان کے مایۂ ناز شاعر ہونے کا ثبوت ہیں۔' (ص:148)، اس تقریظ وافراط کے برعکس درحقیقت ندا کا قلمی سرمایہ اردو میں سات شعری مجموعوں اور پانچ نثری کتابوں پر مشتمل ہے۔ ہندی میں علاحدہ سے کوئی شعری مجموعہ نہیں ہے۔ ان کے اردو کے شعری مجموعوں ہی کو جمع وتفریق کر کے چند انتخابات کو ہندی میں نیا نام دے کر اور چند شعری مجموعوں مثلاً 'لفظوں کا پل' وغیرہ کو دیوناگری میں منتقل کر کے ضرور شائع کیا جاتا رہا ہے۔ علی تنہا کا یہ بیان کہ 'ندا نے دہلی میں جنم لیا اور پھر بچپن ہی میں والدین کے ہمراہ گوالیار (بس) گئے جہاں سے انھوں نے انگریزی ادب میں ڈگری لی۔' (ص:77)، درست نہیں۔ ندا کے خاندان کی بود وباش ومعاش کی کرم بھومی گوالیار ہی تھا۔ ندا کا جنم دہلی میں ضرور ہوا تھا اور وہ ان کی ننھیال تھا، ان کی والدہ جب بھی اپنے میکے جاتی تھیں تو ندا اکثر ساتھ ہوتے تھے۔ ندا کا انگریزی ادب میں ڈگری یافتہ ہونا غیر محقق ہے، لیکن وہ ادب کے کتنے ہی ڈگری یافتہ ڈاکٹروں سے زیادہ وسعتِ مطالعہ کے حامل تھے۔

انتساب / اعتراف / اردو

☆ ندا فاضلی کی حیات میں ان پر شائع ہوئے تین ادبی رسالوں کے خاص نمبر اور چند ادبی جریدوں کے ندا پر مختص کیے گئے گوشوں پر بھی نقد ونظر کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ رسالوں کے نام ہیں: سرونج کا سہ ماہی 'انتساب' (شمارہ نمبر 22)۔ ممبئی سے وقار قادری وشرکا کا جاری کردہ کتابی

سلسلہ'اعتراف' (2005)، اور امراوتی کا سہ ماہی 'اردو' (2014)۔۔۔۔ڈاکٹر سیفی سرونجی ہی کے جریدے 'انتساب' کو ندا فاضلی پر اولین خاص نمبر شائع کرنے کا اختصاص حاصل ہے جو کہ ان کی محولہ بالا کتاب سے چند برس پہلے شائع ہوا تھا۔ اگرچہ ہم عصری کی مصلحتوں اور مروتوں کے باعث معیاری مضامین کا فقدان نظر آتا ہے، اس کے باوجود دیکھا جا سکتا ہے کہ 'انتساب' میں چھپے بشر نواز، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، انور خان، پریمی رومانی، نامی انصاری اور مشتاق مومن کے مضامین جن میں چند عمدہ ہیں تو چند کمزور بھی، ہمیں کچھ بعینہٖ اور کچھ قدرے تغیر و تبدل کے ساتھ تقریباً دو دہائی بعد 'اعتراف' میں مل جاتے ہیں اور پھر کوئی ایک دہائی بعد 'اعتراف' کے ندا فاضلی نمبر کا پچاس فی صد چربہ سہ ماہی 'اردو' کے خاص نمبر میں اٹھا لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پروفیسر علی احمد فاطمی کی مرتبہ 'ندا فاضلی' میں شامل مضامین میں سے ایک تہائی 'اعتراف' ہی سے ماخوذ ہیں۔

ندا پر نکلے خاص نمبروں میں 'اعتراف' کا ندا فاضلی نمبر صوری و معنوی ہر دو اعتبار سے خاص اہمیت کا حامل ہے، جس کے مرتبین میں رام پنڈت، اسلم پرویز اور وقار قادری شامل ہیں۔ یقیناً انھیں ندا کا بھی ساتھ حاصل رہا ہوگا۔ اس مجموعی کاوش کا خوش گوار نتیجہ یہ نکلا کہ 'اعتراف' کا یہ نمبر ندا کی شخصیت و فن پر وارث علوی، شمیم حنفی، کنہیا لال کندن، عتیق اللہ اور علی احمد فاطمی کے قابل قدر مضامین کے ساتھ کئی اور قدیم و جدید تحریروں کی یکجائی سے کافی وقیع بن گیا ہے۔ تحقیقی نکتۂ نظر سے بعض کمزوریوں کے باوجود تا حال ندا کی زندگی اور فن کو سمجھنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

وسیم فرحت کارنجوی کی ادارت میں سہ ماہی 'اردو' نے ساحرؔ اور ندؔا پر جو خاص نمبر شائع کیے ہیں۔ ان میں 'ساحر نمبر' کے بیشتر مضامین 'فن و شخصیت' (مدیر صابردت) اور 'ادب ساز' (مدیر نصرت ظہیر) سے لیے گئے ہیں۔ صابر دت نے جس شخصیت یا موضوع پر بھی 'فن و شخصیت' کا خاص نمبر پیش کیا تھا، اس کے لیے معاصر ادبا سے مضامین حاصل کرنے کے لیے وہ زمین کا گز بنے پھرا کرتے تھے اور ملک کے مشہور لکھنے والوں کے مضامین کے حصول میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ اسی طرح نصرت ظہیر نے جو ساحر کے die hard fan ہیں، 'ادب ساز' کے ساحر نمبر کے لیے بڑی کوششوں سے مضامین حاصل کر کے ایک مثالی خاص نمبر پیش کیا تھا۔ لیکن دیکھا جا سکتا ہے کہ نئے مدیروں میں جوڑ توڑ کر کے ادب کی خدمت کرنے کی ہوڑ لگی ہوئی ہے۔ غنیمت ہے کہ فرحت کارنجوی نے وقار قادری کے ذریعے 'اعتراف' کے ندا فاضلی نمبر کا ان پیج میں ٹائپ کیا ہوا مواد لے کر اپنے جریدے کا پیٹ بھرنے کا اعتراف تو کیا ہے۔

'اردو' کے ندا فاضلی نمبر میں صفحہ سات اور آٹھ پر 'تعارف' کی سرخی کے تحت ندا کی کتابوں کی جو

تفصیلات دی گئی ہیں، ان میں کہیں سنِ اشاعت غلط ہے تو کہیں کتاب کا نام یا کوئی اور تفصیل۔ راقم نے ذیل میں ایسے مقامات درج کر کے قوسین میں اغلاط کی درستی کر دی ہے۔ خط کشیدہ مندرجات کی غلطیاں وہ ہیں جو اڈیٹر نے 'اعتراف' سے منتقل کر لی ہیں اور بھول گئے کہ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

* 'لفظوں کا پل': اول اشاعت: 1971 (صحیح: 1969)، 'آنکھ اور خواب کے درمیاں' 1984 (صحیح: 1986)، 'شہر تو میرے ساتھ چل' (صحیح: شہر میرے ساتھ چل تو)، 'زندگی کی طرف' 2007 (2007 میں یہ مجموعہ 'زندگی کی تڑپ' کے نام سے شائع ہوا تھا۔)، 'شہر میں گاؤں': 622 صفحاتی انتخاب (اسے ندا نے اپنے اس وقت تک کے چھے مجموعہ ہائے کلام مع 'کچھ اور' غیر مطبوعہ کلام کو اکٹھا کر کے کلیات کی صورت میں شائع کیا تھا۔ اسے انتخاب کہنا اڈیٹر کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔)، 'ملاقاتیں': اول اشاعت 1986 (صحیح: 1971)، 'دنیا میرے آگے' 2009 (صحیح: 2008)۔ اسی طرح محض اس بنا پر کہ ندا نے ناول کا سا فارم اپنایا ہے، 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے باہر' کو قطعی طور پر ناول قرار دے دینا مضحکہ خیز ہے۔ ان کی بنیادی حیثیت ندا کی خود نوشت سوانح عمری کی ہے نہ کہ ناول کی۔ 'اعتراف' میں درج ندا کی غلط تاریخِ پیدائش بھی اُسی طرح نقل کر دی گئی ہے، پھر نجانے کیا سوچ کر قوسین میں دہلی بلدیہ کا اندراج بھی دے دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد کلیم ضیا: اردوؤ کے 'ندا فاضلی نمبر' میں ڈاکٹر محمد کلیم ضیا کا ایک مضمون بعنوان 'ندا فاضلی کی علمی اور فلمی شخصیت' بھی شامل ہے۔ انھوں نے ندا کے جو خاندانی حالات بیان کیے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بات بھی تو درست نہیں ہے۔: '----ولادت۔ دلی کے ایک کشمیری خاندان میں ہوئی۔ / فاضلہ کشمیر کے ایک علاقے کا نام ہے جہاں سے ان کے اجداد دہلی میں آ کر بس گئے تھے۔ / تقسیم وطن کے بعد کے فرقہ ورانہ فسادات سے بدظن ہو کر ان کے والدین پاکستان چلے گئے تھے۔' ص: 169، اگرچہ ندا کی فلمی شاعری پر لکھی ہوئی تحریروں کو کھنگالنا میرا مقصود نہیں، لیکن دیکھا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی پیش کردہ فلمی تفصیلات بھی نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔ مثلاً 'رضیہ سلطان' کا نغمہ 'آئی زنجیر کی جھنکار خدا خیر کرے' ندا سے منسوب کر دیا گیا ہے جبکہ وہ جاں نثار اختر کی تخلیق ہے۔

شاعر

جریدہ 'شاعر' نے اپنا ستمبر، اکتوبر 2016 کا شمارہ یادِ رفتگان کے نام سے چند مرحوم ادبا و شعرا کے لیے وقف کیا تھا۔ ان میں ایک گوشہ ندا فاضلی پر بھی شامل ہے، اس کا تو خیر ایک جواز بھی ہے مگر ماہ

نامہ ’شاعر‘ اور سہ ماہی ’انتساب‘ نے سستی شہرت کے متمنی ادیبوں اور شاعروں پر جس دھڑلے سے گوشے اور خاص نمبر نکالے ہیں، اس طرح تو شاید کرنل محمد خاں نے ’دھڑلے‘ بھی نہ نکالے ہوں گے۔ کیوں نہ دیگر مضامین پر تنقیدی نظر کرنے سے پہلے مدیر ’شاعر‘ کے فرمودات کو جانچ لیا جائے!

افتخار امام صدیقی: ☆’بمبئی سے ندا اور خاکسار ہی انڈو پاک مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ خاکسار نے بمبئی کے ترقی پسند شعرا میں سردار جعفری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر کے ساتھ بھی کل ہند اور عالمی مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ ندا فاضلی اکثر خاکسار کے ساتھ ہوتے تھے۔‘ ص:42 ☆’اردو کے مشہور شاعر راجستھان کے عقیل شاداب مرحوم نے کوٹہ میونسپل کارپوریشن کے تحت اردو کے جدید شعرا کو محیط ایک کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ اس میں خاکسار کے ساتھ ممبئی سے ندا فاضلی اور باقر مہدی کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مشاعرے کی نظامت ندا فاضلی کے سپرد تھی۔‘ ص:42 ☆’ندا فاضلی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جگجیت سنگھ نے براہِ راست یہ غزل ان سے گانے کے لیے مانگی تھی۔ جبکہ یہ حقیقت نہیں تھی۔ 1977 میں قبلہ اعجاز صدیقی نے ہم عصر اردو ادب نمبر شائع کیا تھا، اس میں ندا فاضلی کی یہ غزل شامل تھی۔ میں نے جگجیت بھائی سے کہا کہ آپ یہ غزل ضرور گائیے۔ ان دنوں جگجیت بھائی سے قربت کی وجہ سے میں نے دیگر شعرا، بشیر بدر، وسیم بریلوی کا کلام بھی گانے کا مشورہ دیا۔ ص:43 ☆ شاعر میں ندا کی سوانحی کتاب ’دیواروں کے بیچ‘ شائع ہو کر مقبول ہوئی تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ’خود نوشت کا دوسرا حصہ ’دیواروں سے باہر‘ سہ ماہی ’نیا ورق‘ میں ساجد رشید نے شائع کیا تھا۔ لیکن اس حصے کو وہ شہرت نہیں ملی۔‘ ص:43 (’کہاں سے یاد کروں، کہاں سے بھول جاؤں میں‘ از: افتخار......)

استدراک: مذکورہ بالا بیانات میں افتخار امام صدیقی کے یہاں غیر مناسب خودستائی کا اظہار دیکھا جا سکتا ہے۔ ندا فاضلی ان سے سینئر شاعر تھے اور عمر میں بھی کوئی نو برس بڑے تھے۔ بمبئی آنے سے قبل گوالیار کے دور ہی میں ندا فاضلی کا کلام اردو اور ہندی کے جرائد میں شائع ہونے لگا تھا۔ ستر کی دہائی کے آس پاس جدید شعرا کے منتخب کلام کے جو تین مجموعے مشہور ہوئے: ’نئے نام‘، ’گلوب‘ اور ’نئے کلاسکس‘، اُن میں ندا کا کلام موجود ہے۔ ندا نے بمبئی میں اپنی غریبی کے دور میں جبکہ افتخار امام کی عمر سترہ اٹھارہ برس کی رہی ہوگی کچھ عرصے دفتر ’شاعر‘ میں معاون مدیر کی حیثیت سے کام ضرور کیا تھا، وہ ایک الگ بات ہے لیکن افتخار امام کے پیرایۂ اظہار میں خود کو فائق باور کراتے ہوئے یوں لکھنا کہ انڈو پاک اور کل ہند مشاعروں میں ندا بھی ان کے ساتھ ہوا کرتے تھے اور کہیں صرف اس بنا پر کہ ندا کی غزل ’شاعر‘ کے خاص نمبر میں شائع ہو چکی تھی یہ کہنا کہ جگجیت سنگھ کے ذریعے ندا کی اس

غزل کا گایا جانا اُن کی سفارش کا نتیجہ تھا، ان کی پست ظرفی کو ظاہر کرتا ہے۔ ندا کی سوانحی کتاب 'دیواروں کے بیچ' 'شاعر' میں شائع ہو کر مقبول ہوئی تھی اور 'شاعر' کی رسائی بھی زیادہ تھی، اس حقیقت سے انکار نہیں۔ لیکن افتخار امام کو 'شاعر' جیسے (اس وقت کے) ساٹھ باسٹھ سالہ قدیم جریدے کا تقابل کوئی دو سالہ 'نیا ورق' جیسے جدید جریدے سے کرنا اور یہ کہنا کہ 'دیواروں کے باہر' کو وہاں شائع ہونے پر وہ شہرت نہیں ملی، زیب نہیں دیتا۔ جس نے بھی 'دیواروں کے بیچ' کا مطالعہ کیا ہے، اس نے ندا کے بیان کی دل آویزی اور ان کے بقیہ حالاتِ زندگی کو جاننے کے لیے 'دیواروں کے باہر' کو بھی ڈھونڈ ڈھونڈھ کر پڑھا ہے۔

افتخار امام صدیقی۔ مزید: ☆'وہ (ندا) ہندی کے مشہور دوہا نگار کبیر کے سچے عاشق تھے۔' ص:42 ☆ 'ایک مشہور شعر ماہر القادری کی موت کا سبب ہوا۔ سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا، کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی۔ جدہ کے عالمی مشاعرے میں ماہر القادری نے اس شعر پر اعتراض کیا تھا، پھر انھیں عارضہ قلب ہوگیا۔' ص:42 ☆ 'لفظوں کا پل سے کلیات 'سب کا ہے ماہتاب' (تک) ندا فاضلی نے غزل، نظم، گیت، دوہے ہر صنف میں اپنی تخلیقی جودت کا اظہار کیا ہے۔' ص:43 ☆ 'انھوں (ندا) نے اکثر اعتراف کیا کہ داغ کے صرف دو شاگرد زیادہ مشہور ہوئے اقبال اور سیماب۔' ص:43 ☆ 'ندا فاضلی کے لکھے ہوئے فلمی اور غیر فلمی گیتوں پر پی ایچ ڈی کرنے والے انیس جاوید نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ندا کے گیتوں کے مکھڑے شاعر کے لیے دیں گے۔' ص:43 ☆ ندا فاضلی کی دوستی ساحر لدھیانوی سے بھی تھی۔ ساحر اور جاں نثار اختر کا بہت گہرا رشتہ تھا۔ جاں نثار اختر زود گو اور ساحر کم آمیز تھے۔ ندا فاضلی سامنے تھے۔ فلموں کے لیے گیت لکھتے وقت ساحر گیت کا مکھڑا لکھوا دیتے پھر دونوں مل کر پورا گیت مکمل کروا دیتے۔ فلم تاج محل کا ایک گیت اختر رنگ ہے ۔ پاؤں چھو لینے دو پھولوں کو عنایت ہوگی ، ورنہ ان کو ہی نہیں ہم کو بھی شکایت ہوگی' ص:44

☆اسی گوشے میں لشکر (گوالیار) سے لکھا ہوا ندا فاضلی کا ایک قدیم خط 'شاعر' کی توصیف میں شائع ہوا تھا۔ افتخار نے نوٹ لگایا تھا: 'خط میں شاعر کے شمارے پر نپی تلی رائے کا اظہار ندا فاضلی کے عالمی ادب کے مطالعے کا پتہ دیتا ہے۔' ص:45 (ایضاً)

استدراک: ☆ کبیر کا ذکر محض 'دوہا نگار' کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ کم از کم ان کے نام کے ساتھ ایک انقلابی فکر کے حامل مفکر یا سنت اور سماجی مصلح کے لاحقے لگائے جا سکتے تھے۔ دوہے ان کی فکر کے ترجمان اور ان کی پیغام رسانی کا وسیلہ تھے۔ ☆ ماہر القادری کو ندا کے بے تکے شعر کا ناگوار

گزرنا عین ممکن ہے، لیکن افتخار امام نے ندا کے شعر کے تعلق سے جو چٹکلا چھوڑا ہے، وہ قطعی غیر معتبر ہے۔ پھر بیان کی ابتدا میں اس شعر کو موت کا سبب بتایا جا رہا ہے تو اخیر میں عارضۂ قلب کا۔ ماہر القادری کی موت کے بعد ان کے جریدے 'فاران' کے ماہر القادری نمبر بابتہ دسمبر 1978 میں ان کی موت کی تفصیل یوں درج ہے کہ جدہ میں پاکستانی سفارت خانے کے وسیع لان میں منعقدہ مشاعرے میں ماہر القادری، احسان دانش، جمیل الدین عالی، حفیظ جالندھری، اقبال عظیم اور کئی شاعر اور چند شاعرات موجود تھیں۔ مشاعرے کے پہلے دور میں سامعین کی طرف سے اگرچہ 'جمنا کا کنارہ' کی فرمائش ہو رہی تھی، پر ماہرؔ نے اپنے چند متفرق اشعار ہی سنانے پر اکتفا کیا تھا، البتہ دوسرے دور میں ان کی سنائی گئی چند نظموں نے داد پائی تھی۔ ان کے بعد حفیظؔ جالندھری اسٹیج پر آئے۔ جب انھوں نے اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎

بہشت میں بھی ملا ہے مجھے عذابِ شدید
یہاں بھی مولوی صاحب ہیں میرے ہم سائے

تو انھوں نے مولوی کا لفظ ادا کرتے ہوئے ماہر القادری کی طرف اشارہ کر دیا۔ ماہرؔ نے اٹھ کر مائک کو اپنی طرف موڑ کر کہا: سچ تو یہ ہے کہ حفیظؔ صاحب غلط مقام پر آگئے (بہشت ان کا مقام نہیں)۔ حفیظؔ نے پھر یہ شعر پڑھا اور پلٹ کر کچھ کہنا چاہتے تھے، لیکن وہاں ماہرؔ کا سر پیچھے لڑھک گیا تھا اور دمِ واپسیں تھا۔ پھر صرف پندرہ بیس سیکنڈ میں ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ ☆ 'سب کا ہے ماہتاب' نہیں بلکہ ندا نے 'شہر میں گاؤں' کو کلیات کی شکل دی تھی۔ جس میں انھوں نے 'لفظوں کا پل' سے لے کر 'زندگی کی طرف' تک کے اپنے چھے شعری مجموعوں سمیت 'کچھ اور' غیر مطبوعہ کلام کو اکٹھا کر کے شائع کیا تھا۔ اس کے دو برس بعد انھوں اس اثنا میں تخلیق ہوا مزید کلام 'سب کا ہے ماہتاب' کے نام سے الگ شائع کیا تھا۔ ☆ واقعہ یہ ہے کہ سیماب کا خانوادہ اس طرح اقبال سے سیماب کی ہمسری جتانے کے حیلے ڈھونڈتا رہتا ہے۔ تلمیذِ داغ ہونا سیماب کے لیے فخر و مباہات کی بات ہو سکتی ہے، اقبال کے لیے نہیں۔ اقبال نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں داغ کے پاس اپنی چند غزلیں ڈاک سے بھیج کر ان پر اصلاح لی تھی۔ اس مراسلت کی مدت مختصر رہی تھی، پھر بھی اقبال نے کہا تھا: ع مجھے بھی فخر ہے شاگردیِ داغِ سخن داں کا۔ لیکن بعد میں داغ کے رنگ میں لکھی ہوئی اپنی غزلیں انھوں نے تلف کر دی تھیں۔ (بحوالہ 'زندہ رود'، ص: 218)۔ دراصل داغ کی شاگردی، اقبال کے بحرِ زندگانی کی ایک موجِ کم آب ہے۔ وہ اپنے افکار اور ان افکار کو سانچے میں ڈھالنے والے اسلوب کے آپ ہی خالق تھے اور خاتم بھی۔ ☆ انیس جاوید نے ندا فاضلی کے فلمی اور غیر فلمی

گیتوں پر کوئی پی ایچ ڈی نہیں کی۔ اگر وہ 'کرنے والے' تھے تب بھی تا دمِ تحریر تو نہیں کی ہے۔ نہ ہی 'شاعر' کے اس گوشے میں انیس جاوید نے ندا کے گیتوں کے مکھڑے لکھے ہیں۔ بے بات کی بات اسی کو کہتے ہیں۔ ☆ چونکہ ندا اور اختر کے اشتراک کے حوالے سے فلم 'تاج محل' کا ذکر بھی کیا گیا ہے، جس کا ایک گیت 'پاؤں چھو لینے دو پھولوں کو عنایت ہوگی' بقول افتخار امام 'اختر رنگ ہو گیا ہے'۔ اس پر قارئین کی اطلاع کے لیے اتنا عرض کر دوں کہ فلم 'تاج محل' 1963 میں ریلیز ہوئی تھی اور اس وقت تک ندا نے بمبئی میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔ ☆ یہ بیان بتاتا ہے کہ ندا کے ایک مدحیہ خط نے کس طرح مدیر 'شاعر' کو اپنے مداح کو نوازنے پر آمادہ کیا اور اسے عالمی ادب کا پارکھ قرار دے دیا گیا جبکہ اس وقت تک ندا نے اپنا بی اے بھی مکمل نہیں کیا تھا۔ خط کشیدہ عبارات ('پورا گیت مکمل' وغیرہ) سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح خانوادہ شاعر کی ادبی صحافت کی طرح، ان کی ادبی زبان بھی زوال پذیر ہو چکی ہے۔

شاہد ماہلی: 'شاعر' کے اسی گوشے میں شاہد ماہلی صاحب نے اپنی یادوں کے سہارے سے ندا فاضلی کے جدوجہد کے دنوں کے بارے میں خاصی معلومات بہم پہنچائی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ 2002 میں انھیں غالب انعام برائے شاعری دیا گیا تھا۔' (ص:47)، غالباً انھیں غالب ایوارڈ شاعری پر نہیں بلکہ برائے نثر یا برائے ادب کی ذیل میں دیا گیا تھا۔ یوں بھی چند سال قبل انھیں شاعری پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا جا چکا تھا۔ ان کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ: 'شادی میں ناکامی کے بعد مالتی ان کی زندگی میں داخل ہونے لگی تھی...... ندا ان کا تعارف اپنی دوست کے طور پر کرتے تھے...... مگر حقیقت بہت کم لوگوں کو معلوم تھی۔' (ص:47)، غالباً شاہد مرحوم نے بھی اسے live in relationship کی طرح کا رشتہ باور کیا تھا۔

سلیمہ بی کولور: شاعر کے گوشے میں 'سفر در سفر کا شاعر، ندا فاضلی' کی سرخی کے تحت سلیمہ صاحبہ نے ندا کی فلمی شاعری کا اچھا احاطہ کیا ہے۔ یہاں چند اغلاط کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں: ☆ 'ان کا آبائی وطن کشمیر کا ایک علاقہ فاضلہ ہے۔ اسی نسبت سے فاضلی کہلائے۔' (ص:51) ☆ 'وکٹوریہ کالج میں میجر سبجیکٹ کے طور پر انگریزی ادب کو پڑھا، جس کے سبب انگریزی کے ڈگری یافتہ کہلائے۔' (ص:51) ☆ 'ندا فاضلی دراصل فلم انڈسٹری میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتے تھے۔' (ص:51) ☆ 'ابتدائی زندگی دہلی، گوالیار، بھوپال کے اردو ادبی ماحول میں بسر کرنے کے بعد 1960 کو روزی کی تلاش میں بمبئی چلے آئے۔' (ص:51)

استدراک: ☆ فاضلہ کی بحث اوپر آچکی ہے اور اب اس مفروضے کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔

☆ ان کے انگریزی ادب کے ڈگری یافتہ ہونے کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا ہے۔ ☆ 'رس نٹ راج' جیسے ایک معمولی ہندی فلمی اخبار میں انتہائی کم اجرت پر پونے جا کر ملازمت کر چکے ندا کا فلم انڈسٹری سے دل چسپی نہ رکھنا ناقابلِ یقین ہے۔ اپنی جدوجہد کے دنوں کے بارے میں انھوں نے حسرت بھرے لہجے میں لکھا تھا کہ فلموں میں گیت لکھنا تو کوئی مشکل کام نہیں، گیت لکھنے کے مواقع حاصل کرنا بہت دشوار ہے اور جب انھیں مواقع ملے تو انھوں نے انتہائی معمولی درجے کی فلموں کو بھی قبول کرنے سے گریز نہیں کیا تھا۔ جب انھیں خوب شہرت اور دولت حاصل ہوگئی اور لوگوں نے ساحر اور مجروح کی مقبولیت کے مقابل ندا کی فلمی شاعری کو تول کر اس کا پلڑا کافی ہلکا پایا تو انھوں نے اپنے ادبی سرمائے کے حجم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، اپنی فلمی شاعری کی کم طلبی کو غیر اہم اور فلم کی گیت نگاری کو کم وقعت ظاہر کرنے میں بھی سنکوچ نہیں کیا تھا۔ 'رخ ہواؤں کا جدھر کو ہے ادھر کے ہم ہیں' ☆ ندا 1960 میں نہیں 1965 میں روزی کی تلاش میں بمبئی آئے تھے۔

فیاض رفعت: 'شاعر' کے گوشے میں فیاض رفعت کا ایک مضمون بھی چند مرحومین پر پرسے کے طور پر شائع ہوا ہے۔ ندا پر لکھے ان کے شذرے میں ان کی سہل انگاری نے کئی نشانات چھوڑے ہیں، مثلاً: ☆ 'بے پناہ شاعر ہونے کے علاوہ وہ یکتائے روزگار زمانہ تھے'.......... دعا ڈبائیوی ان کے بزرگوں میں سے تھے۔ ☆ 'ان کی خودنوشت ایک سچے اور کھرے آدمی کی خودنوشت ہے۔ جس میں انھوں نے اپنی زبوں حالی، خستگی اور بے چارگی کے ساتھ ساتھ پامالی کا ذکر بے محابانہ کیا ہے۔' ص:69 ('ہوا مجھ میں روشن خدا دیر سے: ندا فاضلی')

استدراک: لگتا ہے کہ سن رسیدہ ادیب کے قلم سے 'یکتائے روزگارِ زمانہ' اور 'بے محابانہ' کے فقرے بے دھیانی میں نکل گئے۔ 'یکتائے روزگارِ زمانہ' کہنا، کچھ 'شبِ وصل کی رات' کا سا معاملہ ہے۔ اپنی زبوں حالی، خستگی، بے چارگی اور پامالی کا ذکر کرنے میں قرینہ اس بات کا متقاضی ہے کہ ندا نے کوئی پردہ داری نہیں کی یا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہاں ڈر کا کوئی مقام نہیں کہ 'بے محابانہ' لکھا جائے اور ہاں! ندا کے بزرگوں کی تعداد بیس، پچیس یا اس سے زیادہ رہی ہوگی لیکن والدِ بزرگوار ظاہر ہے ایک ہی ہو سکتے تھے، وہ دعا ڈبائیوی تھے۔ انھیں بزرگوں کی بھیڑ میں گم کر دینا نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علی تنہا نے یہ لطیفہ لکھا ہے کہ ایک انگریزی ناولسٹ نے ندا سے ان کے والد کے انتقال پر لکھی نظم سن کر جب یوں چوٹ کی تھی کہ 'آپ ایشیائی، ماں باپ کے مرنے پر اتنا روتے کیوں ہیں!' تو ندا نے برجستہ جواب دیا تھا 'کیا کروں میرے تو ایک ہی والد تھے'۔

نیادور

لکھنؤ کے ماہ نامہ 'نیا دور' نے فروری 2018 میں ندا فاضلی اور بشیر بدر پر مخصوص ایک انتہائی خوب صورت اور دیدہ زیب شمارہ شائع کیا تھا۔ مجموعی طور پر کوئی بیس عدد مشمولات ہیں۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ مضامین چاہے جیسے بھی رہے ہوں، اڈیٹر پر انھیں بڑی بڑی سرخیوں سے سجانے کا خبط بری طرح سوار ہے۔

عتیق اللہ: کیا اڈیٹر 'نیا دور' جانتے ہیں کہ ان کے 'خاص اصرار' (ص:2) پر حاصل ہوا عتیق اللہ صاحب کا مضمون تقریباً تیرہ برس پرانا ہے! جو پہلی بار غالباً 'اعتراف' کے ندا فضلی نمبر کے لیے لکھا گیا تھا، پھر کسی اور جریدے میں بھی نظر سے گزرا تھا۔ 'اردو' کے ندا فاضلی نمبر میں بھی شامل ہے اور علی احمد فاطمی کے مجموعہء مضامین میں بھی۔ بہر کیف یہ ایک قابلِ مطالعہ مضمون ہے لیکن اس میں ان کا ایک بیان محلِ نظر ہے اور وہ مضمون کی ہر اشاعت میں منتقل ہوا ہے: 'بھوپال کے بعد ندا عین وقت پر گھر سے بھاگ جاتا ہے اور باقی تمام گھر کے افراد پاکستان کی راہ لیتے ہیں۔' ('ندا فاضلی کی زندگی کی پیچیدہ نفسیاتی گرہیں اور دیواروں کے بیچ' ص:43)

استدراک: ندا کے سوانح سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے والد نے 1948 میں اپنے اہل و عیال کو بھوپال میں منتقل کر دیا تھا۔ وہ غالباً ایک دو سال بعد ہی گوالیار لوٹ آئے تھے۔ انھوں نے گوالیار ہی کے وکٹوریا کالج سے، جس کا نام بدل کر مہارانی لکشمی بائی گورنمنٹ کالج ہو گیا تھا، اندازاً 1962 میں ایم اے کا پہلا سال مکمل کیا تھا اور اسی سال ان کا خاندان پاکستان کو پیارا ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ بھوپال سے گوالیار کے بیچ ایک دہائی سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہے۔

شکیل اعظمی: بالی وڈ کے نغمہ نگار نے اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھا ہے کہ 'ندا فاضلی کا پورا خاندان گوالیار سے پاکستان ہجرت کرنے کو تیار تھا...... بڑوں کے اس فیصلے میں ندا کو بھی شریک ہونا چاہیے تھا کیونکہ (!) بٹوارے کے وقت ندا فاضلی لڑکپن کی عمر میں تھے۔ یہ عمر شرارت کی تو ہو سکتی ہے فیصلے کی نہیں۔ فیصلہ سنجیدگی چاہتا ہے اور سنجیدگی آتے آتے آتی ہے۔' ('ندا فاضلی اپنی منفرد شاعری کے عصری سیاق و سباق کے تناظر میں' ص:44)

استدراک: عرض ہے کہ اس طرح کی وطن بدلی کو ہجرت نہیں کہتے۔ ندا کے والد اپنے بڑے بیٹے کے وہاں برسرِ روزگار ہو جانے اور اس کے ذریعے بلائے جانے کے بعد، اپنی زمین جائیداد بیچ کر پوری منصوبہ بندی کے ساتھ وہاں گئے تھے اور ہاں! اس وقت ندا کی عمر کوئی چوبیس برس کی تھی اور وہ اپنا ایم اے کا پہلا سال مکمل کر چکے تھے۔ کوئی عقل کا پورا ہی اسے لڑکپن کی عمر بتائے گا۔

دعا کیجیے کہیں امیت شاہ کو نہ پتا چل جائے کہ شکیل اعظمی ندا کے والدین کے پاکستان جانے کے فیصلے کو سنجیدگی کا حامل اور ندا کے ہندستان میں رہ جانے کے فیصلے کو ان کی نادانی سمجھتے ہیں۔ ان کے مضمون میں ان کی خودستائی بھی ایک مبالغے کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً انھوں نے 1994 میں سورت میں گجرات اردو اکاڈمی کے تحت وارث علوی کی صدارت میں منعقدہ ایک مشاعرے کا ذکر کیا ہے۔ جہاں ندا پہلی ہی ملاقات میں ان سے گھل مل گئے تھے۔ جب انتظامیہ نے کچھ مقامی شعرا کے ساتھ شکیل کو بھی نہ پڑھوانے کا فیصلہ کیا تو ندا نے کہا تھا کہ اگر شکیل نہیں پڑھے گا تو میں بھی نہیں پڑھوں گا۔ آخر ان کی بات مانی گئی۔ یہاں تک کہ مشاعرے کے بعد سرکٹ ہاؤس میں شراب کے ساتھ ان کی شاعری کی محفل سجی۔ 'جس میں پروفیسر وارث علوی، ندا فاضلی، جاوید اختر، محمد علوی اور افتخار امام صدیقی نے گھنٹوں ان کی شاعری سنی۔' (ص:46) غرض کہ انھوں نے بھونڈے پن کے ساتھ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش کی ہے۔ 'عصری سیاق وسباق کے تناظر' بھی کچھ 'ایصالِ ثواب پہنچانے' جیسی بے تکی بات ہے۔ تقریباً ہر مضمون پر لگی شیطان کی آنت کی سی سرخیاں مصنفین کی بجائے اڈیٹر کی 'ندرتِ فکر' کا نمونہ معلوم ہوتی ہیں۔

زیبا محمود: کا لکھا ہوا 'ندا فاضلی کی شعری کائنات اور اس کے مخصوص معنوی تلازمات و تعلیقات' ایک قابلِ ذکر مضمون ہے۔ چند (خط کشیدہ) مندرجات تصحیح طلب ہیں، مثلاً: 'مقتدیٰ حسن ندا فاضلی ...... دہلی میں مقیم ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔' (ص:61) اور '1964 میں ندا نے بمبئی کا رخ کیا۔' (ص62)۔ ان اغلاط کی وضاحت اس مضمون کی تمہید میں موجود ہے۔ 'اردو' کے ندا فاضلی نمبر میں شائع شدہ اس مضمون کی مکرر اشاعت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہن سال سرکاری جریدہ 'نیا دور' مطبوعہ مضامین قبول کرنے میں بڑا فراخ دل ہے اور اگر ان پر معاوضہ بھی ادا کرتا ہے تو پھر لکھنے والے کے پو بارہ ہیں۔

عائشہ ضیا: نے 'ندا فاضلی کی جدید ترین اردو شاعری اور اس کے امتیازی پہلو' کی سرخی کے تحت کافی محنت سے ایک اچھا مضمون لکھا ہے۔ ایک جگہ انھوں نے سہو سے لکھ دیا ہے کہ 'ندا فاضلی 1938 میں گوالیار میں پیدا ہوئے۔' (ص:63)۔

مظہر احمد: نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے کہ 'ندا فاضلی کی یادداشتیں بعنوان 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے باہر' (دو جلدیں) جو اولاً ماہ نامہ 'شاعر' کے صفحات کی زینت بنیں۔' ('ندا فاضلی کی نثر نگاری کی تفہیم اور قرأت کا ایک خوش گوار تجزیہ' ص:48)۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ندا کی یادداشتوں کی پہلی کتاب جریدہ 'شاعر' اور دوسری بمبئی کے جریدے سہ ماہی 'نیا ورق' کے صفحات کی

زینت بنی تھی۔

ایوانِ اردو

☆ناز خاں: ماہ نامہ 'ایوانِ اردو' بابت مارچ 2017 میں ناز خاں کا ایک مضمون 'سارا گھر لے گیا گھر چھوڑ کے جانے والا' شائع ہوا تھا۔ مضمون پڑھ کر دیے گئے نمبر پر انھیں فون کیا گیا تو انھوں نے اپنا نام فرح ناز بتایا تھا۔ غالباً پی ایچ ڈی کر چکی ہیں یا کر رہی ہیں۔ اس مضمون میں جگہ جگہ ناز صاحبہ کی لاپروائیوں کے نشانات دیکھے جا سکتے ہیں۔ 'فاضلہ'، 'کشمیری خاندان' اور 'دلی میں آکر بسنے' جیسے مفروضات تو گویا ندا پر لکھے سوانحی مضامین کا ضروری جزو ہو گئے ہیں، سو وہ تو ہیں ہی (ص:36)۔ ناز کے دیگر فرمودات ہیں: ☆'ان کا پہلا دیوان 'لفظوں کے پھول' کے نام سے 1969 میں منظرِ عام پر آیا۔......... اس کے علاوہ ان کی کویتاؤں کے بھی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں 'طوفانوں کا پل'، 'مور ناچ' شامل ہے۔...... وہیں 'آنکھ اور خواب کے درمیاں'، 'کھویا ہوا سا کچھ'، 'آنکھوں بھر آکاش' اور 'سفر میں دھوپ تو ہوگی' جیسے مجموعے بھی ان کی شاعرانہ صلاحیت اور عمدہ سوچ کی نشاں ندہی کرتے ہیں۔' (ص:36) ☆'کسی بھی مصنف کے لیے اپنی ذاتی باتوں کو الفاظ میں پرونا کافی مشکل کام ہے لیکن ندا فاضلی نے اپنی قلم کے ساتھ بھی انصاف پرتی سے کام لیا ہے۔' (ص:36) ☆'ایک جگہ وہ بہت ہی خوب صورت اور سہل انداز میں لکھتے ہیں ؎ سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا، کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہو گئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھوں نے شہری زندگی کو بھی لکھا۔' (ص:37) ☆'1946 میں روزگار کی تلاش انھیں ممبئی لے گئی۔' (ص:37) ☆'اپنی بے باکی کے لیے مشہور ندا نے 'درباری کڈ' نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ اس میں انھوں نے ان لوگوں کے بارے میں لکھا تھا جو اپنی دولت اور سیاسی لوگوں سے نزدیکی کی وجہ سے انعام، اعزاز پاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ کتاب منظرِ عام پر آئی تو اس کی کافی مخالفت ہوئی۔' (ص:38)

استدراک: ☆ندا کی نظموں اور غزلوں کے پہلے شعری مجموعے کا نام 'لفظوں کا پل' تھا نہ کہ 'لفظوں کے پھول' اور اسے دیوان کہنا بھی غلط ہوگا۔ اسی طرح 'طوفانوں کا پل' بھی ناز صاحبہ کے ذہن کا عجیب و غریب اختراع ہے۔ انھوں نے ندا کے اردو اور ہندی مجموعوں کو بھی گڈمڈ کر دیا ہے۔ ہندی کے پبلشروں نے ندا کے اردو شعری مجموعوں کا منتخب کلام اکٹھا کر کے اسے کوئی نیا نام دے کر تجارتی نقطۂ نظر سے کتابیں چھاپی ہیں۔ 'آنکھوں بھر آکاش' اور 'سفر میں دھوپ تو ہوگی'، ایسے ہی مجموعے ہیں۔ ☆یہ ایک عجیب خیال ہے کہ کسی مصنف کے لیے دنیا جہان یا کائنات کی فکر کو تو چھوڑیے، اپنی ذاتی باتوں کو بھی 'لفظوں میں پرونا' مشکل ہے۔ ☆ناز صاحبہ کو ندا کا 'شہری زندگی پر

لکھا' کچھ نظر آیا بھی تو ندا کے ایک بدنامِ زمانہ شعر میں! ندا ہی نے کہیں کیا خوب لکھا ہے کہ 'جن باتوں کو خود نہیں سمجھے اوروں کو سمجھایا ہے۔' ☆ 1946 میں ندا کی عمر محض آٹھ برس کی تھی اور انھوں نے پرائمری بھی ختم نہیں کی تھی چہ جائیکہ 'روزگار کی تلاش'۔ ☆ 'درباری کذ' ندا کی کسی کتاب کا نام نہیں اور شاید یہ کسی بھی کتاب کا نام نہیں ہے۔ لگتا ہے ناز صاحبہ نے انٹرنیٹ پر ندا کی ریسرچ کی ہے، وہ بھی مواد کے کھرے کھوٹے کو پرکھے بنا۔ وہاں وکی پیڈیا پر ندا کے پہلے شعری مجموعے کا نام 'لفظوں کے پھول' ہی درج ہے۔ ناز صاحبہ کو بخشیے، لیکن ہماری اردو اکاڈمیوں کے جریدوں کے compilers سے یہ سوال ضرور پوچھا جانا چاہیے کہ کیا وہ اڈیٹر کی حیثیت سے کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے کی تنخواہیں لے رہے ہیں؟

■■ Mob:9322154702

نظمیں

شاھد عزیز

ذرّہ

میں ایک ذرّہ ہوں
اس زمین کا
میں ایک دھارا ہوں
روشنی کا
میں ایک لمحہ ہوں
اس مکاں سے
لامکاں کے درمیاں کا
میں ایک ٹپکا ہوں
بادلوں سے ٹپکنے والی
حیاتِ نو کا
میں زندگی کے لیے بنا ہوں
اگر کبھی میں بکھر گیا تو
زمین فلک اور یہ چاند تارے
یہ جگمگاتے ہوئے ستارے
کہیں خلاؤں میں جا رہیں گے
نہ پھر کہیں بھی ہوا میں ہوں گی
یہ زندگی کی مدریں ہوں گی
میں ایک ذرّہ اس زمین کا
میں زندگی کے لیے بنا ہوں

ابھی

ابھی سفر میں ہیں
سبز سائے
ابھی اجالوں میں
زندگی ہے
ابھی ستاروں میں
روشنی ہے
ابھی ہواؤں میں
تازگی ہے
ابھی تو سورج
چمک رہا ہے
ابھی تو دنیا
سنور رہی ہے
ابھی کسی سے
گلہ نہیں ہے
ابھی وہ دشمن
ملا نہیں ہے

بہت دن بعد

بہت دن بعد
سورج کے نکلنے پر

ہمارے گھر کے آنگن میں
سنہری دھوپ اتری ہے
گلی کوچوں میں
پھر کھلتے ہوئے
چہرے نظر آئے
بہت دن پہلے یہ سورج
سمندر میں کیوں اُترا تھا
بہت دن تک
کناروں پر کوئی کشتی نہیں آئی
کوئی طوفان گزرا تھا
بہت دن بعد
سورج کے نکلنے پر
مجھے سب یاد آتا ہے
کہ میں نے اپنے ہاتھوں سے
اجالوں کے
پرندے مار ڈالے تھے

زندگی

یہی سب زندگی ہے
اس میں ایسا ہوتا رہتا ہے
کوئی مرتا ہے جیتا ہے
کسی کو منزلیں آواز دیتی ہیں
کوئی بے نام راہوں میں
بھٹکتا ہے
پرندے پھر کہیں جا کر
کسی انجان بستی میں اترتے ہیں
اور یہ بھی بھول جاتے ہیں
کہ وہ اپنی زمینیں چھوڑ آئے ہیں
چلو ہم بھی
پرندوں کی طرح سے
زندگی کو پھر سے جیتے ہیں
اور یہ بھی بھول جاتے ہیں
کہ جو ہم سے بچھڑتے ہیں
وہ ہم کو یاد آتے ہیں

■■

شاهد ماہلی

ہم سفر

تم میرے ہم سفر ہو
میرے ساتھی
تم میرے ہر وقت ساتھ رہتے ہو
سائے کی طرح
رات دن، صبح شام
کبھی تم خواب چرا لیتے ہو
نینداڑا دیتے ہو
مگر میرے ساتھی ہو
سب لوگوں سے مجھے جوڑے رکھتے ہو
ساری دنیا کو میرے قریب کر دیتے ہو
نئے دوست بناتے ہو
پرانے دوستوں کو دور کر دیتے ہو
تم میرے دشمن ہو
نہیں دوست ہو
ہاں دونوں ہو
کبھی تم دو کی شادی کر دیتے ہو
کبھی طلاق
کبھی دو دلوں کو ملا دیتے ہو
کبھی دور کر دیتے ہو
تم بوڑھوں کی مجبوری ہو
جوانوں کی محبوبہ
اور بچوں کو؟
ایک دن تم ان کی آنکھیں پھوڑ دو گے
انھیں اندھا بنا دو گے
پھر تم کس کے ہم سفر بنو گے؟
کس کے؟
بولو؟

■■

شارق عدیل

پنجرہ

پرندے زندگی کو گنگنانے کا
سلیقہ جانتے ہیں
پرندے زندگی کو بوجھ کی صورت نہیں ڈھوتے
پرندے جستجو میں آب و دانے کی
خلاؤں میں بھٹکتے ہیں
مگر یہ جذبۂ نغمہ سرائی کو
کبھی مجروح تک ہونے نہیں دیتے
مگر یہ طائرانِ خوش نوا جب بھی
قفس کی بے خطر آزادیوں کو اوڑھ لیتے ہیں
تو اپنے سارے نغمے بھول جاتے ہیں

■■

خالد عبادی

پس یقین کرو

زندگی اس نظم کی طرح ہے
جو بغیر موسیقی
بغیر برش
بغیر تیشہ
اور بغیر حسن کے نہیں لکھی جا سکتی

ایک نامعلوم بات، نامعلوم بار لکھنے کے بعد بھی
مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے
یہ سب میں پہلی بار لکھ رہا ہوں
اور مجھے سب معلوم ہے

تم کتنے نامعلوم جنموں سے، کتنی نامعلوم بار گزر کر
ایک معلوم زندگی میں داخل ہوتے ہو
تم میں کتنی آگ، کتنا پانی، کتنا غبار اور کتنی دھند ہے
کبھی کبھی تم میں سے کوئی جان لیتا ہے
تمہارے علاوہ
شگوفہ کیسے پھوٹتا ہے، خوشبو کیسے پھیلتی ہے
اور روشنی کیوں کر سبز پوش ہو جاتی ہے

کہیں کوئی تضاد نہیں
تم سب اسی محل کی تعمیر کر رہے ہو

پھر کتابیں خط بدلنے سے
محترم یا نامحترم کیوں ہو جاتی ہیں
نظریے کیوں بدل جاتے ہیں
تعصب، تمسخر، تصادم، تجاوز، تغافل
ہندو پاک اور نسل کشی میں

مجھے سب معلوم ہے
سب سے خوبصورت شے کی تلاش
سب سے بدصورت انجام تک لے جاتی ہے
لیکن یہ جو سرشاری ہوتی ہے یقین کی
تیغِ ستم ہو کہ دستِ فنا
دونوں کو بے دم کر دیتی ہے
پس اگر میں کہتا ہوں
''زندگی اس نظم کی طرح ہے''
تو یقین کرو

کہ یہ جو سرشاری ہوتی ہے یقین کی
بے دم کر دیتی ہے
تیغِ ستم ہو کہ دستِ فنا
دونوں کو

گتھی

گتھی نہیں سلجھتی
تو حیرت قائم ہوتی ہے

اور کبھی کبھی الجھن
مسئلہ کہاں سے شروع ہوتا ہے
تھانے دار نہیں جانتا

بچے کھیلتے ہیں
بوڑھے سوچتے ہیں
اور جوان پا بہ رکاب ہیں
گتھی نہیں سلجھتی
حیرت قائم رہتی ہے
مسئلہ حیرت سے شروع ہوتا ہے
یا حیرت مسئلہ ہے
گتھی نہیں سلجھتی
خیال لفظوں میں ہے یا ذہن میں
خیال انگیزی
ذہن میں ہے یا لفظوں میں
اور خیال مقدم ہے یا خیال انگیزی
یا باہم دگر
گتھی نہیں سلجھتی

ایک شرمسار ہے ایک سرشار
اور دونوں بیٹھے ہیں
ایک ہی صف میں
یعنی شاعر اور جولا ہے
■■

جمال اُویسی

تمھارا جانا

(ساقی فاروقی کی یاد میں دو نظمیں)

کوئی بے لاگ سی اک چیز تھی
تم آدمی تھے
صیقل اس پہ یہ تماشا بھی فسوں تھا
جاں کنی تھی
تہ گرداب مچلتا ہوا دل
کس کی خاطر تھا نہیں کچھ معلوم
اپنے احساس کی شدت میں جلا بیٹھے تم
وہ مکاں جس کا کبھی دھیان نہ آیا تم کو
قفسِ تنگ میں لہرائی تھی موآج سی شے
ہاں وہی شے جسے تم اپنی بقا کہتے تھے
میں جسے اپنی سہولت سے انا کہتا ہوں
یاد رکھنے کے لیے اور کوئی چیز نہ تھی
تم نے محفل کو سمٹنے نہ دیا
اُٹھ گئے بن کہے، بن پوچھے
ادب والوں نے...
تم پہ الزام کئی رکھے ہیں
یہ بھی معلوم ہے
تم کو کوئی رغبت ہی نہ تھی
زندگی سے، ادبی قدر سے، بت خانے سے

اجنبی اجنبی ہوتا ہے
بہر حال تھے تم
اپنے احساس سے، افکار سے
انکار سے مرتے دم تک
تم کو وابستگی کتنی تھی
یہ میں جانتا ہوں

جنگل کا خوف

کالے گھنے جنگل میں
ایک بڑا سا سانپ
مرے رستے میں پڑا تھا
وہ اژدھا تھا
برسوں وہ چپ چاپ
پڑا رہتا تھا
جس موسم میں جاگتا تھا
اس موسم میں
رستے میں قدموں کی چاپ
بڑھی ہوئی تھی
شاید اس کو اذن ہوا کرتا تھا
جاگنے کا
میں بھی ڈرا سہا جنگل سے
بھاگنے کو بے چین ہوا
جنگل سے ملحق تھا ایک سمندر
اُس میں کود گیا
سب نے آخری بار
اس کی آنکھیں دیکھیں
جانے کیوں اجداد کی آنکھیں
یاد آئیں
وہ دن ہے اور آج کا دن ہے
میں نے سمندر پار نہیں کیا ہے اب تک
اور جنگل کا خوف
بھلا نہیں پایا ہوں
لیکن اب یہ سمندر کیسے پار کروں؟
کوئی جزیرہ، کوئی ساحل
مجھ کو نظر نہیں آتا!
(اس نظم میں ساقی فاروقی کی ایک نظم کی تھیم کو اُلٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ ج.ا.)

عطاء الرحمٰن طارق

امرت دھارا

رگ رگ میں، جیون کی
دھارا جو بہتی ہے
بہتے ہی رہتی ہے

دھرتی کو اُپون کا
شرنگار دیتی ہے
ساز کے سینے میں
ہلکورے لیتی ہے
دنیا کے میلے میں
اُلہاس بھرتی ہے

کتنی ہی صدیوں سے
کتنے ہی قرنوں سے
رگ رگ میں، کل کل کا
سنگیت جاری ہے

سرشار ہوں ایسے،
میرا تو بس جیسے،
ہر انگ روشن ہے

جب تک یہ دھرتی ہے
جب تک یہ ساگر ہے
جب تک یہ دنیا ہے
تب تک یہ جیون ہے

جیون کے امرت کی
دھارا جو بہتی ہے
اُس کو تو بہنا ہے
بہتے ہی رہنا ہے!

■■

برجیش امبر

تب اور اب

آخری بلب تھا یہاں
اس کے آگے تھا
خوف کے خاردار پیڑوں سے آباد
ریتیلا
پتھریلا
کھلا۔خالی میدان
آگے بڑھنے پر
ساتھ ہو جاتا اندھیرا
اس ٹمٹماتی روشنی میں
کتنا کب تک
ہوتا ممکن
سفر

اگنے لگیں ہیں
عمارتیں ان گنت
بغیر بلب کا بجلی کا کھمبا
دیکھتا ہے
چندھیائی آنکھوں سے
جنگل
روشنی کو

کون جانے کس لیے

آ گئے پھر
زندہ رہنے
یا نیا جوڑا بنانے
یا چمکتے جسم کو
پانیوں کی نت نئی نم ناکیوں سے
خشک کرنے
اجاڑ
ریتیلی پناہوں میں
وادیوں سے برف کی
اڑتے ہوئے

کسی کی یاد میں کب کون اپنی عمر کھوتا ہے

یہاں کوئی نہیں ہے
بیابانوں میں بھی آبادیاں ہی گشت کرتی ہیں
سمندری تھپیڑے مارتی موجوں کے پھیرے
ہیں

نمی اب نام کو ملتی کہاں ہے ان فضاؤں میں
ہوا کے ہونٹ سوکھے ہیں
اکیلا اونٹ اپنی داڑھ کی کھجلی مٹاتا ہے

کسی کی یاد میں کب کون اپنی عمر کھوتا ہے

نیا ہونے کے لیے

گھنے بیاباں کے
خاردار درخت کی شاخ پر
لہرا رہی ہے
کینچلی
کہاں ہوگا؟

آس پاس کوئی تہہ خانہ نہیں ہے؟

ضروری ہوتا ہے کیا
اکیلا ہونا
اتارنے کے لیے
کینچلی

■■

ساجد سومرو

کورا رشتہ...

پورا مدعا
آدھے صفحے پہ لکھ دینا
آدھا کاغذ کورا ہی رہنے دینا
آدھے پن کو پورے پنے پہ لکھنا
آدھا لکھا پوری بات بتا دیگا
کورا حصہ عکس ہے
کورے رشتے کا....

الجھی ہوئی نظم

محبت
دل کے کھنڈر سے نکلا
مٹی کے برتن کا
کوئی بوسیدہ ٹکڑا ہے
جواب
کتابوں کے میوزیم میں ہی
سجا ہوا نظر آتا ہے...

فردِ جرم

جھوٹ بولنا
جھوٹ سننا
جھوٹ بیچنا
جھوٹ لینا
اور جھوٹ سوچنا
اب ہمارے خون میں شامل ہو گیا ہے
سچ ہمیں
خواب میں بھی اچھا نہیں لگتا

غزلیں

حنیف ساحل

◆

قصہ گو سے خوش بیانی مانگ لے
تیری اپنی ہے کہانی مانگ لے

بولتے لڑتے جھگڑتے جب تھے ہم
ساعتیں وہ سب پرانی مانگ لے

سوچ مت سود و زیاں، دستِ طلب
آج اس سے خوش گمانی مانگ لے

آج وہ تجھ پر بہت ہے مہرباں
قربتوں کی جاودانی مانگ لے

بجھ سکے تیری اگر تشنہ لبی
دشت سے اک قطرہ پانی مانگ لے

جس سے ہے منسوب بادل اور ہوا
اس سے دریا کی روانی مانگ لے

آج پھر آیا ہے وہ خنجر بکف
اس سے زخموں کی نشانی مانگ لے

رنگ سارے لے کے پھرتا ہے حنیفؔ
لال پیلا آسمانی مانگ لے

حنیف ساحل

◆

کتابِ خونچکانی لکھ رہا ہوں
میں اپنی ہی کہانی لکھ رہا ہوں

ابھی اک آگ سی جلتی ہے اندر
ابھی شعلہ بیانی لکھ رہا ہوں

تمھاری بات کا شکوہ ہے کس کو
میں بے زبانی لکھ رہا ہوں

کرم مجھ سے زیادہ غیر پر تھا
میں اس کی مہربانی لکھ رہا ہوں

سحر کے رخ پہ چھائی ہے اداسی
مگر شامیں سہانی لکھ رہا ہوں

سماعت میں جو سب کے پھیل جائے
میں وہ جادو بیانی لکھ رہا ہوں

جنوں خیزی میں اب تک اس گلی کی
ہے کتنی خاک چھانی لکھ رہا ہوں

اثاثہ ہے یہ میری زندگی کا
کہ میں یادیں پرانی لکھ رہا ہوں

چلو اب نیند بھی آتی ہے ساحلؔ
غزل کا مصرعِ ثانی لکھ رہا ہوں

حنیف ساحل

◆

سفر بے سمت میرا ہے نہیں بھی
ہے سر پہ آسماں نیچے زمیں بھی

مجھے آساں ہوئیں دشواریاں سب
وہ میرا ہم سفر ہے ہم نشیں بھی

بنا سجدے بھی روشن لگ رہی ہے
تری دہلیز اور میری جبیں بھی

اسے دیکھا برسوں بعد میں نے
وہ اب بھی پُرکشش ہے اور حسیں بھی

نہ کوئی خواب، خواہش اور تمنا
نہیں کوئی گماں، کوئی یقیں بھی

جنوں ہے جستجو کا بے خودی ہے
ہمیں اپنی خبر ہے اور نہیں بھی

گزارا یوں بھی کرلیتے ہیں ساحلؔ
کبھی فاقہ کبھی نانِ جویں بھی

مرغوب اثر فاطمی

◆

رقابت میں نوازش ہو رہی ہے
سو مر جانے کی خواہش ہو رہی ہے

لگا رکھی ہے چھتری مصلحت کی
کہ بہتانوں کی بارش ہو رہی ہے

ہمارا زخم ہے رکھ دینگے مرہم
تمہیں بے وجہ خارش ہو رہی ہے

ہماری ہوگئی نیندوں سے اَن بَن
تو خوابوں کی گزارش ہو رہی ہے

تمناؤں کے پر رنگیں ہوئے کیا
وقارِ جاں کی کاہش ہو رہی ہے

ہمیں قرطاس سے حرفِ غلط سا
مٹا دینے کی کاوش ہو رہی ہے

اثرؔ جو بے ادب ہیں، کیسے بولیں
ادب کے ساتھ سازش ہو رہی ہے

مرغوب اثر فاطمی

◆

ترے بے کمال لہجے وہ کمال کر رہے ہیں
کہ وفا شعار سائے سے خود اپنے ڈر رہے ہیں

وہ چلا گیا مصور ہمیں شاہکار دے کر
جسے پوت کر اناڑی نئے رنگ بھر رہے ہیں

مرے رخ پہ ڈالتے ہیں وہ نگاہِ فاتحانہ
جو رہِ مزاحمت میں مرے ہم سفر رہے ہیں

وہ رجوعِ والہانہ یہ ادائے بے نیازی
کئی زخم بھر چکے ہیں کئی پھر نکھر رہے ہیں

نہ مجالِ باریابی نہ شعورِ ہم کلامی
تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں

انہیں کیا غرض عطا سے انہیں کیا ستم کی پروا
جو وفورِ عاشقی میں بنے سنگِ در رہے ہیں

مری آنکھ دیکھتی ہے وہی خیمۂ بہاراں
جسے چومنے کو گرداں شمس و قمر رہے ہیں

مرغوب اثر فاطمی

◆

ذہن آشفتہ کرامات پہ مائل تو نہیں
چرخِ امکاں پہ طلسمات کے بادل تو نہیں

خوش خیالی میں بھی اس بات کا احساس رہا
جو الجھتا ہے کسی فکر کا آنچل تو نہیں

میری صبحوں کو جو شاموں میں بدل دیتا ہے
وہ شبِ تار کا بہتا ہوا کاجل تو نہیں

مدتوں سے نہیں چھایا ہے کوئی رنگِ نشاط
دل کا در طرزِ تغافل سے مقفل تو نہیں

جھیل کی سطح پہ کچھ طائرِ خوش باش پھرے
کروٹیں یادوں نے لیں پر کوئی ہلچل تو نہیں

دیکھ لیجے گا مگر جاتے ہوئے سوئے طرب
راستے میں کھڑے تابندہ مسائل تو نہیں

اس کی آہٹ پہ چلی بادِ بہاراں پھر سے
غور سے دیکھ اثرؔ گزرا ہوا پل تو نہیں

محسن جلگانوی

◆

آکے لگتا ہے ہر اک زخم کا پتھر مجھ کو
تم نے کیوں رکھ دیا آئینہ بنا کر مجھ کو

درو دیوار ملے اور نہ کہیں گھر مجھ کو
بے زمینی لیے پھرتی رہی دردر مجھ کو

کاغذی ناؤ کنارے پہ مری ڈوب گئی
اور دیتا رہا آواز سمندر مجھ کو

سمت تا سمت سلگتی ہیں سروں کی فصلیں
خوں رلاتا ہے لہو رنگ یہ منظر مجھ کو

اپنے پیکر کے ہی سائے کو اماں دے نہ سکوں
اے زمیں اتنا بھی کرنا نہ تناور مجھ کو

منتظر ہوں کہ کبھی لوٹ مجھے لے جائے
جو بنا کر گیا اک میل کا پتھر مجھ کو

زرد پتہ ہوں شجر کا مری ہستی کیا ہے
کب ہوا لے کے چلی جائے اڑا کر مجھ کو

میں ''پکاسو'' کی بنائی ہوئی تصویر جو ہوں
آج تک پڑھ نہ سکا کوئی برابر مجھ کو

تو مرے قرب رفاقت پر بھروسہ مت کر
اپنے ہی آپ سے لگتا ہے بہت ڈر مجھ کو

محسن جلگانوی

◆

اس سے بڑھ کر سانحہ ایسا بھی گزرا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا

آنسوؤں کی جھیل میں جلتی ہوئی دو کشتیاں
اس نے کاغذ پر قلم سے اور کچھ لکھا نہ تھا

لے اڑی بے سمت جنگل میں اسے پاگل ہوا
وہ پرندہ جھنڈ میں رہ کر بھی اڑتا نہ تھا

آگ، آندھی، ریت، طوفان اور کالی ساعتیں
اپنے دل کا یہ علاقہ تو کبھی ایسا نہ تھا

اس لیے ہم اس جزیرے سے پلٹ کر آگئے
پاؤں میں صحرا نہیں تھا، آنکھ میں دریا نہ تھا

کس کی بینائی میں آخر اپنا چہرہ ڈھونڈتا
شہر تو اپنا تھا لیکن کوئی بھی اپنا نہ تھا

ملنے آئے گا تو خنجر بھی چھپا کر لائے گا
اس قدر کم مائیگی کا اس کا اندازہ نہ تھا

گھر سے باہر کیا نکل آئے کہ پہچانے گئے
اب سمجھ آیا کہ اپنے گھر میں آئینہ نہ تھا

صف بہ صف آیا مقابل اک قبیل دشمناں
ہم کو محسنؔ حیثیت کا اپنی اندازہ نہ تھا

سیفی سرونجی

◆

یہ نہیں کہتا کہ سب پر دھاک ہونا چاہیے
آدمی کو کچھ مگر چالاک ہونا چاہیے

ڈوب کر گہرائیوں سے وہ اُبھر کر آئے گا
شرط اتنی ہے کہ وہ تیراک ہونا چاہیے

گفتگو جو کر سکیں کھل کر کسی سے در گھڑی
یار کوئی ایک تو بیباک ہونا چاہیے

آگئے در پر ترے کپڑے جنوں میں پھاڑ کر
ہاتھ میں پتھر ترے یا خاک ہونا چاہیے

چور دل کے ہر طرف آنے لگے ہیں اب نظر
گھر کا دروازہ ہمیشہ لاک ہونا چاہیے

شعر کہنے کے لیے سیفی تمھیں سلام ہے
عقل ہونا چاہیے اور ادراک ہونا چاہیے

سیفی سرونجی

◆

یہ جھوٹ ہے کہ مرا کوئی مدعا ہی نہیں
سوال یہ ہے کہ اس نے کبھی سنا ہی نہیں

بس ایک بار وہ پھر گزر گیا ہے
پھر اس کا نام بھی عمر بھر سنا ہی نہیں

کہا تھا اور مگر مسکرا کے دشمن نے
عجیب بات ہے یہ ہاتھ پھر اٹھا ہی نہیں

نجانے کس لیے خاموش ہو گیا سن کر
کہ اس کے پاس مرے درد کی دوا ہی نہیں

مجھے یقین تھا دو لفظ تو لکھے گا وہ
جواب اس نے مرے سوال کا مگر دیا ہی نہیں

تمام چاہتیں یک طرفہ رہ گئیں سیفی
تمھارے پیار کا جادو مگر چلا ہی نہیں

جمال اُویسی

◆

کم سخن میں ہوں دائمی خاموش
میرے اندر کی لہر بھی خاموش

دیکھتا ہوں سوال کرتا نہیں
جان کب سے ہے بے بسی خاموش

کوئی کٹ کر گرا لہو پھوٹا
پیش منظر پہ آدمی خاموش

وہ جو کہتا تھا میں جو سنتا تھا
نصف شب کی ہے وہ گھڑی خاموش

جانے کب سے مظالم کہنہ میں
جنگ ٹھہری ہے سرکشی خاموش

اب مری مردہ آنکھ میں نہیں کچھ
شخصیت گم ہے طرفگی خاموش

تن بہ تقدیر ہوتے جائیں سب
آسماں چُپ ہے خواجگی خاموش

سب نے اب تک جو شاعری کی ہے
چیخ ہے کچھ دبی دبی خاموش

جمال اُویسی

◆

کیسے کہوں کہ جل نہ سکی بجھ چکی ہے آگ
سینے میں میرے جھانک کے دیکھو دبی ہے آگ

میں شعر لکھ رہا تھا کہ شعلہ لپک پڑا
معلوم کب مجھے تھا کہ اندر لگی ہے آگ

رنگ بہار حسن چمن سب انہی سے ہے
گل پیکروں میں کیسی سمائی ہوئی ہے آگ

سودا ہے میرے سر میں سمایا ہوا عجیب
منوا کے خود کو چھوڑے گی ایسی لگی ہے آگ

عمر عزیز صرف ہوئی اضطراب میں
اب آخری پڑاؤ میں ٹھنڈی پڑی ہے آگ

خرقہ اُتار پھینکیے اب خانقاہ کا
مرشد سمیت مدرسہ میں لگ گئی ہے آگ

دانشوروں کے زعم کو اک تازیانہ ہے
خاشاک کو لا نہ سکی بُجھ چکی ہے آگ

پرویز اختر

◆

دیکھو تو سہی زیست کے امکان بھی ہوں گے
شاید کہ اسی بھیڑ میں انسان بھی ہوں گے

گردن پہ لگے زخم کی سوزش سے کھلی آنکھ
ہم سوچتے تھے جنگ کے اعلان بھی ہوں گے

اللہ کسی کو کبھی بھوکا نہیں رکھتا
دل اس نے دیا ہے تو کچھ ارمان بھی ہوں گے

دنیا میں کوئی چیز بھی بے وجہ نہیں ہے
میں ہوں تو مرے واسطے میدان بھی ہوں گے

دیکھو کبھی دنیا تو پریشان نہ ہونا
اب خیر سے دیدے ہیں تو حیران بھی ہوں گے

نیکی کا بدی سے ہے، بہت پاس کا رشتہ
انعام کے نزدیک ہی بہتان بھی ہوں گے

لازم ہے تو ملزوم بھی ہو گا یہیں پرویزؔ
جب زخم ملے ہیں تو نمکدان بھی ہوں گے

پرویز اختر

◆

طنز کرتا ہے آئینہ مجھ پر
وقت کیسا یہ آ پڑا مجھ پر

ایک ہلکی سی ضرب ماری تھی
شہر سارا ہی آ پڑا مجھ پر

ایسا لگنے لگا ہے اب مجھ کو
ہر مصیبت کی انتہا مجھ پر

جان دے کر ہی ہو سکا ہے ادا
کئی صدیوں کا قرض تھا مجھ پر

سورۂ ناس پڑھتا رہتا ہوں
کوئی جادو نہ چل سکا مجھ پر

ڈھونڈنے ایک بھی نہیں نکلا
سبھی پڑھتے ہیں فاتحہ مجھ پر

عمر گزری وفا شعاری میں
قتل ہونا بھی فرض تھا مجھ پر

لوگ کرتے گئے کرم پہ کرم
قرض بڑھتا چلا گیا مجھ پر

چلتا رہتا ہوں بن تھکے پرویزؔ
کھلتا جاتا ہے راستہ مجھ پر

پرویز اختر

نذر میر

ہوا ہے نہ ہو گا زمانہ کسی کا
اٹھانا کسی کو گرانا کسی کا

کئی رہنما تھے علاوہ بھی دل کے
مگر ہم نے کہنا نہ مانا کسی کا

تعلق کہاں زندگی سے ہمارا
تعارف ہے بس غائبانہ کسی کا

مقدر ہی اول مقدر ہی آخر
نہ پانی کسی کا نہ دانہ کسی کا

جو باقی بچیں گے وہ کیسے جئیں گے
اگر ہو ہی جائے زمانہ کسی کا

بنا وجہِ عظمت نظر میں سبھی کی
جو کردار تھا مجرمانہ کسی کا

زمانے کو برداشت ہوتا نہیں ہے
نیا کوئی پودا لگانا کسی کا

بہت درد دیتا ہے پرویزؔ اختر
مسلسل ہمیں آزمانہ کسی کا

وہاں پر ہیں پرویزؔ اب ہم جہاں پر
نہ آنا کسی کا نہ جانا کسی کا

پرویز اختر

سب کی آنکھوں میں رہا کرتے تھے
فرد ہیں، قوم ہوا کرتے تھے

اب تعلق میں غرض ہے شامل
دوست بچپن میں ہوا کرتے تھے

راستے، تال، تلیا، ٹیلے
کتنے رومان ہوا کرتے تھے

اس کا خوش ہونا بہت بھاتا تھا
ہم نشانے کو خطا کرتے تھے

عشق پروان وہاں چڑھتا تھا
جہاں آسیب رہا کرتے تھے

ہاتھ تو اب بھی ملاتے ہیں لوگ
دل مگر پہلے ملا کرتے تھے

دست برداری ہمیں آتی تھی
ہم کہا مان لیا کرتے تھے

کر لیا خود کو ہی برباد آخر
وقت برباد کیا کرتے تھے

پہلے آنکھوں کو میسر تھے آپ
پہلے ہم شعر کہا کرتے تھے

سلیم محی الدین

کتابوں سے نکالا جا رہا ہے
مجھے پردے پہ لایا جا رہا ہے

کہانی کی ضرورت بھی تو دیکھو
اگر تم سے لکھایا جا رہا ہے

جزیروں سے محبت اٹھ گئی ہے
سمندر کو لتاڑا جا رہا ہے

خراشوں پر خراشیں ہیں بدن پر
مگر چہرہ نکھارا جا رہا ہے

مجھے ہنسنے کی عادت ہو گئی تھی
سو اب رونا سکھایا جا رہا ہے

مرے خوابوں کی دنیا کو سُنا ہے
جزیروں میں بسایا جا رہا ہے

پرانے کینوس کی سلوٹوں پر
نیا چہرا ابھارا جا رہا ہے

سلیم محی الدین

کسی مقام پہ آ کر جو میں ٹھہر جاتا
سمندروں کی طرح پانیوں سے بھر جاتا

کتابِ وصل نئے باب سے مزین ہے
وبائے ہجر نہ چلتی تو عشق مر جاتا

ہماری آگ بھی گلزار ہو گئی ہوتی
خلل دماغ کا دل میں ذرا اتر جاتا

تمام رات اسی بے وفا کا چہرہ ہے
کوئی تو دن اسے بھولے ہوئے گزر جاتا

چراغ جی نہ سکے زندگی چراغوں سی
کوئی نہ تھا جو ہواؤں کے کان بھر جاتا

نہ دل سنبھال سکا اور نہ آنکھ نے ٹوکا
سفر نصیب مسافر کہیں ٹھہر جاتا

قمر صدیقی

◆

ضمیر خفتہ کو بیدا کیوں نہیں کرتے
یہ کیسے لوگ ہیں انکار کیوں نہیں کرتے

ہمارے صبر کی میعاد بڑھتی جاتی ہے
ہم اپنے آپ کو بیزار کیوں نہیں کرتے

گزر نہ جائے کہیں وقت کی مسیحائی
ہم اپنے درد کا اظہار کیوں نہیں کرتے

یہ جھوٹ ہے کہ یہاں سچ کی حکمرانی ہے
ہم ایسے جھوٹ سے انکار کیوں نہیں کرتے

یہاں سے اُڑ کے پرندے کبھی نہ لوٹیں گے
ہم اِن درختوں کو ہشیار کیوں نہیں کرتے

سنا ہے ہوگا یہاں سے گذر مسیحا کا
سو اپنے آپ کو بیمار کیوں نہیں کرتے

قمر صدیقی

◆

چار سو ہے غبار مٹی کا
کیوں نہ ہوگا شمار مٹی کا

خاک میں مل گئی ہے خاک مری
آج اُترا اُدھار مٹی کا

رقص کرتے ہیں ہاتھ مٹی کے
دیکھتا ہوں سنگار مٹی کا

سارے کوزوں میں زندگی بھر کے
ہوگیا خود کمہار مٹی کا

لا رہا ہوں کھلونے مٹی کے
بڑھ رہا ہے اُدھار مٹی کا

سونے چاندی کے ساتھ رہ کے قمرؔ
اب تلک ہے سنار مٹی کا

ندرت نواز

جانے یہ کھیل کون کھلاتی رہی ہوا
زلفوں سے رخ کو ترے چھپاتی رہی ہوا

ماحول ایسے ہو گئے جینا محال ہے
یہ بھی خبر ہوا میں اڑاتی رہی ہوا

سازِ حیات دل میں لیے عمر بھر رہے
سوز جہاں میں مجھ کو گھماتی رہی ہوا

ویران دل کے حجرے نے توڑا اسکوت کو
دیکھو تو وہم کیسی مچاتی رہی ہوا

آنے کے بعد اپنے صنم کے دیار سے
نغمہ وفا کا ہم کو سناتی رہی ہوا

یہ حوصلہ نوازؔ نہ میرا ہوا ہے پست
جدوجہد کا جام پلاتی رہی ہوا

زبیر گورکھپوری

دشمنوں کی ہار کا ماتم سے اندازہ ہوا
سب کو میری فتح کا پرچم سے اندازہ ہوا

وہ جدا ہم سے ہوا تو رات روئی ہے بہت
آنسو کیسے ہوتے ہیں شبنم سے اندازہ ہوا

کوئی لب زیرِ تبسم کوئی لب ہے جاں بہ لب
لوگ کتنے پانی میں ہیں غم سے اندازہ ہوا

جان ہے اِن سے زیادہ میرے تحت اللفظ میں
بے سُروں کے بے سُرے سرگم سے اندازہ ہوا

اتنی طاقت تیری بدگوئی میں کیسے آ گئی
تیرے ہاتھوں میں ہے جو اس بم سے اندازہ ہوا

بارشوں کے دن تھے جب وہ ہم سے بچھڑا تھا زبیرؔ
دل کے زخموں کا ہمیں موسم سے اندازہ ہوا

مقصود بستوی

◆

لئے ہتھیلی پہ ہم اپنی جاں نکل آئے
حصارِ ذات سے باہر کہاں نکل آئے

ہماری ہجر کی شب رازداں نکل آئے
یہ کتنے چاند سرِ آسماں نکل آئے

بڑے سکون سے منزل پہ ہیں قیام گزیں
جو پیچھے چھوڑ کے شورِ سگاں نکل آئے

غبارِ دشتِ نوردی جو سر پہ چمکا تو
حدِ نگاہ کئی سائباں نکل آئے

بھنور میں چھوڑ کے مجھ کو تماش بین یہ سوچ
اسی بھنور سے اگر بادباں نکل آئے

رکھا جو گھر میں قدم سیم و زر کی دیوی نے
تو پھر ہمارے کئی مہرباں نکل آئے

جمائے بیٹھے ہیں مقصودؔ اس کے در پہ نظر
کسی بہانے وہ رشکِ بتاں نکل آئے

شارق عدیل

◆

ویراں نہیں تاحدِ نظر کیسے کہیں ہم
اس دشتِ بلاخیز کو گھر کیسے کہیں ہم

اس ملک کو برباد سیاست نے کیا ہے
یہ ایک حقیقت ہے مگر کیسے کہیں ہم

پہلا سا نہیں جاہ و جلال ان میں اگرچہ
ویران مکانوں کو کھنڈر کیسے کہیں ہم

اطراف سے غافل ہوں جو منزل کی طلب میں
ان لوگوں کو اربابِ نظر کیسے کہیں ہم

ہر شخص تصنع کے لبادے میں ہے مسرور
مایوس نہیں ذہن و نظر کیسے کہیں ہم

غرقاب اگر پتلیاں ہوں بھی گئیں شارقؔ
بہتے ہوئے اشکوں کو بھنور کیسے کہیں ہم

فرحان عمر

◆

کام ہر روز یہ ہوتا ہے کس آسانی سے
اس نے پھر مجھ کو سمیٹا ہے پریشانی سے

مجھ پہ کھلتا ہے تری یاد کا جب بابِ طلسم
تنگ ہو جاتا ہوں احساسِ فراوانی سے

آخرش کون ہے جو گھورتا رہتا ہے مجھے
دیکھتا رہتا ہوں آئینے کو حیرانی سے

میری مٹی میں کوئی آگ سی لگ جاتی ہے
جو بھڑکتی ہے ترے چھڑکے ہوئے پانی سے

تھا مجھے زعم کہ مشکل سے بندھی ہے مری ذات
میں تو کھلتا گیا اس پر بڑی آسانی سے

کوئی ہنگامہ کریں صبح کے آجانے تک
رات کٹنے کی نہیں قصۂ طولانی سے

فرحان عمر

◆

خود اپنے واسطے کارِ سخن بناتے ہیں
کسی کی زلف کو جب پُر شکن بناتے ہیں

غزالِ شام و سحر یوں ہی رم کئے جائیں
ہم اپنے سینے کو دشتِ ختن بناتے ہیں

اسی کی مٹی کے ہم بھی بنے ہوئے ہیں میاں
یہ چاک ہے چلو اس کا بدن بناتے ہیں

یہ لوگ بھاگے ہوئے ہیں ترے وصال سے کیا
جو تیرے ہجر کو اپنا وطن بناتے ہیں

ہمیں پہ پڑتی ہے ان آنسوؤں کی بوچھاریں
تو ہم بھی ان کے لئے بانکپن بناتے ہیں

تمام عمر کی آشفتگیِ جاں کے عوض
کسی کے لمس کو اپنا کفن بناتے ہیں

حاجرہ نور زریابؔ

◆

لب پہ پھر وہ سوال گم گشتہ
کیا تمہی ہو جمالِ گم گشتہ

پردۂ ذہن پر ہیں نقش تمام
آج تک ماہ و سال گم گشتہ

آپ شہروں میں ڈھونڈتے رہیے
ہم ہیں خواب و خیال گم گشتہ

دل مجروح اب بھی رکھتا ہے
حاجتِ اندمال گم گشتہ

نام ماضی ہے آج کل جس کا
ہے وہ میرا ہی حال گم گشتہ

زہر پھیلا ہوا ہے نفرت کا
چاہتیں ہیں مثال گم گشتہ

وقت لوٹا سکے نہیں ممکن
وہ مرے خد و خال گم گشتہ

عید کی منتظر نہیں میں بھی
اور تو بھی ہلال گم گشتہ

اب کہاں وہ قرارِ جاں زریابؔ
اب کہاں وہ وصال گم گشتہ

فوزیہ اختر رداؔ

◆

ان سہاروں سے خوف آتا ہے
اب کناروں سے خوف آتا ہے

کر چکی ہوں میں دفن یادوں کو
پر مزاروں سے خوف آتا ہے

میری قسمت میں وہ نہیں ورنہ
کب ستاروں سے خوف آتا ہے

پاسداری کی دیکھ کر دنیا
پاسداروں سے خوف آتا ہے

بھید دل کا نہ کھول دیں آنکھیں
راز داروں سے خوف آتا ہے

ہے رداؔ ڈر تو بس جدائی کا
ان اشاروں سے خوف آتا ہے

پاش: نظموں کے سبب قتل ہونے والا انقلابی شاعر

تعارف و ترجمہ: فرحان حنیف وارثی

پنجابی کے مزاحمتی ادب کے نامور شاعر اوتار سنگھ سندھو المعروف پاش ۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو جالندھر ضلع کے ناکوڈر میں واقع Talwandi salem نامی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ پاش نے اپنی مختصر سی زندگی میں بڑی شہرت پائی تھی۔ ایسی مقبولیت شاذ و نادر ہی کسی قلم کار کو نصیب ہوتی ہے۔ انھیں نہ صرف اپنے، بلکہ ہر کسی کے لیے یکساں دنیا کی تمنا تھی اور اسے حاصل کرنے کی لڑائی میں ان کے پاس بیچ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پاش کا موازنہ انقلابی شاعری کی وجہ سے بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد سے کیا جاتا ہے۔ وہ مغربی بنگال سے اٹھنے والی انقلابی تحریک نکسل واد سے متاثر ہو کر بائیں بازو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ نکسل باڑی کی تحریک مشرقی پنجاب میں کسان مزدوروں اور محنت کش طبقے کی حقیقی نمائندہ تحریک تھی۔ انھیں انقلابی شاعری کی اولین کتاب 'لوہ کتھا' (آہنی قصہ) میں شامل عسکری اور سخت گیر محاوروں اور الفاظ کی وجہ سے دو برس کی جیل ہوئی تھی۔ رہائی کے بعد وہ ماؤ نواز فرنٹ میں شامل ہو گئے تھے۔

وہ زندگی اور اس دنیا کو بے پناہ محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ مٹی کی گرد، دھوپ، درد اور نمی کو اپنی سانسوں میں محسوس کرنے والے شاعر تھے۔ ان کی نظموں میں بیل، روٹیاں، حقہ، گڑ، چاندنی رات، بالٹی میں جھاگ والا دودھ اور کھیت کھلیان پوری توانائی کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کا پورا وجود زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے مل کر بنا تھا۔ ان کے بارے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ پنجابی میں لکھنے کے باوجود انھیں ہندی حلقے نے بھی پلکوں پر بٹھایا ہے۔ نئی نسل بھی ان کی نظموں کی گرویدہ ہے۔

انھوں نے لکھا ہے "میں آدمی ہوں اور بہت، بہت، چھوٹے چھوٹے "کچھ" کو جوڑ کر بنا ہوں۔" وہ تا عمر اس چھوٹے چھوٹے بہت کچھ کو بچانے کی ضد اور اس بہانے انسان کو انسان بنائے رکھنے کی للک میں لہولہان ہوتے رہے۔ کبھی کبھی وہ بدمزاجی کے بھی شکار ہوئے لیکن کڑواہٹ کبھی دکھائی نہیں دی۔ مثلاً پنجابی کے ایک پبلشر نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کا مجموعہ شائع کرنے کے عوض انھیں رائلٹی دے گا لیکن جب ان کے مجموعے کی ساری کاپیاں فروخت ہو گئیں تو پبلشر اپنے قول سے مکر گیا اور رائلٹی دینے سے منع کر دیا۔ انھیں اس دھوکے سے افسوس ہوا تھا۔ وہ پنجابی کے واحد ایسے شاعر ہیں جن کی نظموں میں محبت اور غصے کی آمیزش ہے۔ وہ کہتے ہیں "میں صرف آدمی بن کر زندگی بتانا چاہتا تھا مگر مجھے کیا بنا دیا گیا۔" اپنی نظم 'اب میں وداع لیتا ہوں' میں انھوں نے کہا ہے کہ مجھے جینے کی بہت، بہت چاہ تھی، میں گلے گلے تک زندگی میں ڈوب

جانا چاہتا تھا، میرے حصے کی زندگی بھی جی لینا میرے دوست۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ بہت بے ذائقہ ہے، اس بے رنگ دنیا کے نقشے سے نپٹنا۔

پاش کو پتہ تھا کہ نظموں کو ہتھیار میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ وہ الفاظ کی طاقت سے بھی بخوبی واقف تھے۔ وہ لفظوں کو نہتے لڑنے کی خاطر چھوڑتے وقت ایک کرب محسوس کرتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں، ''تم نے صرف اپنی سہولت کے لیے لفظوں کو تراشنا سیکھ لیا ہے، تم نے انھیں انڈے میں مچلتے چوزے کی طرح کبھی نہیں دیکھا، میں نے الفاظ کو برداشت کیا ہے، اپنے خون میں پناہ دی ہے۔ میں گرو گوبند سنگھ نہیں، اپنی کویتا کا لباس پہنا کر انھیں روانہ کرنے کے بعد میں بہت رویا ہوں۔'' انھوں نے پندرہ برس کی عمر میں نظمیں لکھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے شہرت کی اونچائیوں کی سمت بڑھنے کا آغاز کیا تھا۔ بیس سال کی عمر میں اولین مجموعے 'لوہ کتھا' کی اشاعت سے قبل ہی وہ مشہور ہو چکے تھے۔

بلاشبہ وہ پنجابی کے بے حد پاپولر شاعر تھے اور آج بھی ہیں۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے جس کا ملال انھیں ساری زندگی رہا۔ ان کے والد فوج میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ گھر سے باہر رہتے تھے اور والدہ غیر تعلیم یافتہ تھیں۔ ان کے بڑے بھائی کو تعلیم کی غرض سے باہر بھیجا گیا تھا لیکن وہ بری صحبت کا شکار ہو گئے جس کی وجہ سے انھیں پڑھانے والا کوئی نہیں تھا۔ تعلیم کی حصولیابی کے لیے انھوں نے اپنے بل بوتے پر کافی تگ و دو کی اور کسی طرح بارہویں جماعت میں کامیابی بھی حاصل کر لی لیکن بی اے کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

وہ اپنی ذاتی زندگی میں بے باک تھے، چاہے پیار ہو یا نشہ، انھوں نے ہر کام کھل کر کیا۔ اپنی نظموں میں تو وہ اپنی زندگی سے زیادہ بے باک رہے۔ انھیں نظریات اور عمل میں کسی طرح کی ملاوٹ سخت ناپسند تھی۔ وہ ان لوگوں سے دوری بنائے رکھتے تھے جو ڈر ڈر کر اور گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے تھے۔ ان کی مشہور کتابوں میں لوہ کتھا (۱۹۷۱)، اُڈیاں بازاں مگر (۱۹۷۳)، ساڈیاں سمیاں وِچ (۱۹۷۸)، اور کھلرے ہوئے ورکے (۱۹۸۹) قابل ذکر ہیں۔ ان کی کلیات 'سب توں خطرناک' بھی شائع ہو چکی ہے۔ ہندی میں ان کی کتابیں ''بیچ کا راستہ نہیں ہوتا''، ''پاش کے آس پاس''، ''پاش کی کویتائیں''، ''سمئے او بھائی سمئے'' اور ''ہم لڑیں گے ساتھی'' عنوان سے بازار میں دستیاب ہیں۔ وہ سیاڑ (۷۳-۱۹۷۲)، ہیم جیوتی (۷۵-۱۹۷۴) اور ہاک (۱۹۸۲) نامی رسائل سے بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے ''اینٹی ۴۷ فرنٹ'' نامی جریدے کی ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائی ہیں۔ ان کی اہلیہ کا نام راج وِندر کور سندھو اور بیٹی کا نام وِنکل سندھو ہے۔ پاش کے پاس بھارت کے علاوہ کناڈا کی بھی شہریت تھی۔

پنجابی کے معروف شاعر بلی سنگھ چیما بتاتے ہیں، ''پنجابی ہی نہیں بلکہ ہندی کے بھی کئی بڑے قلم کار پاش کو ان کی کویتاؤں کے سبب نکسل وادی آندولن کا کوی ماننے کی بھول کر بیٹھتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاش کے ساتھ یہ ناانصافی ہے کیوں کہ انھوں نے اپنے پنجابی جیون کے ہر رنگ کو اپنی کویتا میں پینٹ کیا ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ پتہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۶۷ میں جالندھر میں بی ایس ایف جوائنٹ کی تھی مگر تین ماہ کے

بعد چھوڑ دیا تھا۔ اسی دوران انھوں نے جین ہائی اسکول میں ۹ ویں جماعت کی پڑھائی مکمل کی تھی۔" انھوں نے بتایا، "انقلابی آندولن میں شرکت کی وجہ سے انھیں کئی بار جھوٹے مقدموں میں پھنسا کے جیل میں بند کیا گیا تھا لیکن عدالت نے انھیں باعزت بری کیا تھا۔ انھوں نے پنجابی میں بی اے کے مساوی گیانی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ پنجاب ساہتیہ اکادمی نے انھیں ۱۹۵۰ء میں ایک سال کی فیلوشپ دی تھی۔ انھوں نے ۱۹۷۸ء میں کپورتھلا ضلع کے شیخ پورے سے جے بی ٹی کا امتحان پاس کیا تھا۔ ہائی اسکول میں پنجابی کا ٹیچر بننے کے لیے اس امتحان میں بیٹھنا ضروری ہوتا ہے۔"

ہندی کے بڑے نقاد نامور سنگھ نے کہا تھا "وہ بدعا کے زیر اثر جی رہے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ بات صحیح ہو، کیوں کہ انھیں اپنے پسند کی زندگی نہیں ملی تھی۔ ہندوتوا کی علمبردار آر ایس ایس نے رابندر ناتھ ٹیگور، مرزا غالب اور ایم ایف حسین کے بعد گیارہویں کی نصابی کتاب Aaroh سے پاش کی نظم 'سب سے خطرناک' کو نکالنے کی مانگ کی تھی۔ آر ایس ایس کے ایجوکیشن سیل کے نگراں دینا ناتھ بترا اور بی جے پی کے چند سیاستدانوں نے بھی اس نظم کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔

پنجاب میں جب خالصتانی تحریک شباب پر تھی اور قلم کاروں نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی تب بھی پاش نظمیں لکھنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے شدت پسندوں کے خلاف مورچہ سنبھال رکھا تھا۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۸۸ کو وہ اپنے دوست ہنس راج کے ساتھ گاؤں میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے تب خالصتان کے حامیوں نے اندھا دھند فائرنگ کی جس میں وہ اور ان کا دوست جاں بحق ہوگیا۔ موت کے وقت وہ صرف ۳۷ سال کے تھے۔ نامور سنگھ نے ان کا موازنہ اسپین کے شاعر فیڈریکو گارسیا لارکو سے کیا ہے جنھیں جنرل فرینکو نے ان کی نظموں کے خوف سے قتل کروا دیا تھا۔

گھاس

میں گھاس ہوں
آپ کے ہر کیے دھرے پر اُگ آؤں گا

چاہے یونی ورسٹی پر بم پھینک دو
ہاسٹل کو ملبے کا ڈھیر بنا دو
یا پھر ہماری جھونپڑیوں پر بلڈوزر چلا دو

تم مجھے کیا نقصان پہنچاؤ گے؟
میں تو گھاس ہوں
ہر شے پر اُگ آؤں گا

چاہے بنگے کو ڈھیر کر دو
سنگرور مٹا ڈالو
یا پھر لدھیانہ ضلع کو دھول میں ملا دو

میری ہریالی
دو سال یا دس سال کے بعد بھی
اپنا کام ضرور کرے گی
سواریاں پھر کسی کنڈیکٹر سے پوچھیں گی
یہ کون سی جگہ ہے؟
مجھے برنالہ اتار دینا
جہاں ہرے گھاس کا جنگل ہے

میں گھاس ہوں
جو مجھے کرنا ہے، وہ میں کروں گا
میں آپ کے
ہر کیے دھرے پر اُگ آؤں گا

مشروط

ہم اپنی ہتھیلی پر
کچھ اس طرح کے سچ کی خواہش رکھتے ہیں
جیسے گڑ کی چاشنی میں ذرہ ہوتا ہے
جیسے حقے میں نکوٹین ہوتی ہے
جیسے ملاپ کے وقت
محبوب کے لبوں پر
ملائی جیسی کوئی چیز ہوتی ہے۔

خواب

ہر کسی کو
بارود کے بے جان ریزوں میں
سوئی آگ کے خواب نہیں آتے
بدی کی خاطر اٹھی
ہتھیلی کو پسینے نہیں آتے
شیلف میں رکھی
تاریخ کی کتابوں کو بھی
خواب نہیں آتے
خوابوں کے لیے
برداشت کرنے والے دلوں کا ہونا لازمی ہے
آنکھوں میں نیند کا ہونا
لازمی ہے
خواب اس لیے ہر کسی کو نہیں آتے

آئین

آئین
یہ کتاب مر چکی ہے
اسے مت پڑھو
اس کے الفاظ میں موت کی ٹھنڈک ہے
اور ایک ایک صفحہ

زندگی کے آخری پل کی طرح بھیانک ہے
یہ کتاب جب لکھی گئی تھی
اس وقت میں ایک جانور تھا
سویا ہوا جانور
اور جب میں بیدار ہوا
تو میرے انسان بننے تک
یہ کتاب مر چکی تھی
اب اگر اس کتاب کو پڑھو گے
تو جانور بن جاؤ گے
سوئے ہوئے جانور

ان کے الفاظ خون کے ہوتے ہیں

ساری عمر جنھوں نے تلوار کا نغمہ گایا ہے
ان کے الفاظ خون کے ہوتے ہیں
اور خون لوہے کا ہوتا ہے
جو موت کے کنارے جیتے ہیں
ان کی موت سے زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے
جن کا خون اور پسینہ
مٹی میں گرتا ہے
وہ مٹی میں دب کر اُگ آتے ہیں

کیا کیا نہیں ہے میرے پاس

کیا کیا نہیں ہے میرے پاس
شام کی رِم جھم
نور میں چمکتی زندگی
لیکن میں اپنوں کے بیچ
گھِرا ہوا ہوں
کیا کوئی مجھ سے چھین لے گا
رات میں یا کسی انجانے میں
اندھیرے میں قید کر دیں گے

کیا مسل دیں گے
زندگی سے زندگی

کیا مجھے اپنوں میں سے الگ کر دیں گے
اس پوٹلی میں
آپ کی موت کا انتظام قید ہے
سب کچھ بے شمار ہے میرے پاس
جسے دیکھ کر آپ سمجھتے ہیں
اس میں کچھ نہیں ہے

بھگت سنگھ نے پہلی بار

بھگت سنگھ نے پنجاب کو پہلی بار

جنگلی پن، پہلوانی اور جہالت سے
دانائی کی جانب موڑا تھا

جس دن پھانسی دی گئی
ان کی کوٹھری میں لینن کی کتاب ملی
جس کا ایک صفحہ مُڑا ہوا تھا
پنجاب کی جوانی کو
اُن کے آخری دن سے
اس مڑے صفحے سے آگے بڑھنا ہے
چلنا ہے آگے

ہمارے خون کو عادت ہے

ہمارے خون کو عادت ہے
موسم نہیں دیکھتا، محفل نہیں دیکھتا
زندگی کا جشن شروع کر دیتا ہے
سولی کے نغمے چھیڑ دیتا ہے

لفظ پتھروں پر بہہ بہہ کر گھس جاتے ہیں
خون ہے کہ اس وقت بھی گاتا ہے
ذرا سوچو کہ روٹھی ہوئی سرد راتوں کو منائے کون؟
بے درد پلوں کو ہتھیلی پر کھلائے کون؟
یہ خون ہی ہے جو روزانہ آبشاروں کے ہونٹ
چومتا ہے
یہ خون ہی ہے جو تاریخ کی دیواروں کو پھلانگتا ہے
یہ جشن، یہ نغمے، کسی کے واسطے بہت ہیں
جو کل تک ہمارے خون کی خاموش ندی میں
تیرنے کی مشق کرتے تھے

آدھی رات میں

آدھی رات میں
سات رضائیوں میں بھی
میری کپکپی نہ رُکی
جیسے ستلج میرے بستر تک آ گئی
ساتوں رضائیاں گیلی ہو گئیں
بخار ایک سو چھ اور ایک سو سات ڈگری تک پہنچ گیا
ہر سانس پسینہ پسینہ
زمانے کو پلٹنے میں مصروف رہنے والے
کبھی بخار سے مرتے نہیں
موت کے شانوں پر جانے والوں کے لیے
زندگی کا سفر
موت کے بعد شروع ہوتا ہے
جس سورج کی دھوپ
میرے لیے حرام ہے
میں اس کے سایے سے بھی انکار کر دوں گا
میں ہر خالی صراحی توڑ دوں گا
میرا خون اور پسینہ مٹی میں مل گیا ہے

میں مٹی میں دبنے کے بعد بھی
اُگ آؤں گا

میں پوچھتا ہوں

میں آسمان میں اُڑتے ہوئے سورج سے پوچھتا ہوں
کیا وقت اسی کا نام ہے
کہ حادثے کچلتے چلے جائیں
مست ہاتھی کی طرح
ایک پورے انسان کا شعور؟
کہ ہر سوال
کام میں منہمک بدن کی غلطی ہی ہو؟

کیا ہر مرتبہ پُرانا لطیفہ
سنا دیا جاتا ہے
کیوں کہا جاتا ہے کہ ہم زندہ ہیں
ذرا سوچو
کہ ہم میں سے کتنوں کا رشتہ
زندگی جیسی کسی شئے کے ساتھ وابستہ ہے؟

رب کی یہ کیسی رحمت ہے
کہ سونا بوتے پھٹے ہوئے ہاتھوں
اور منڈی کی درمیان رکھے تخت پر
پھیلے ہوئے گوشت کی
اس پلپلی ڈھیری پر

ایک ہی وقت نازل ہوتی ہے؟

آخر کیوں
بیلوں کی گھنٹیاں
اور پانی نکالتے انجن کے شور میں
گھرے ہوئے چہرے پر
ایک چیختی خاموشی جم گئی ہے؟

کون تِل کے کھا جاتا ہے
مشین میں چارہ ڈال رہے
کترے ہوئے ارمانوں والی ڈولو کی مچھلیاں؟
کیوں گڑگڑاتا ہے
میرے گاؤں کا کسان
ایک معمولی سی پولیس کے آگے؟
کیوں کسی دبے کچلے آدمی کو چونکانے کے لیے
ہر وار کو
کویتا کہہ دیا جاتا ہے؟
میں پوچھتا ہوں آسمان میں اڑتے ہوئے سورج سے

ہم لڑیں گے ساتھی

ہم لڑیں گے ساتھی، اداس موسم کے لیے
ہم لڑیں گے ساتھی، غلام خواہشوں کے لیے

ہم چُنیں گے ساتھی، زندگی کے ٹکڑے

ہتھوڑا اب بھی چلتا ہے، اُداس سندان پر
ہل اب بھی چلتا ہے، چیختی زمین پر
یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے، سوال ناچتا ہے
سوال کے کندھے پر چڑھ کر
ہم لڑیں گے ساتھی
قتل ہوئے جذبوں کی قسم کھا کر
بجھی ہوئی نظروں کی قسم کھا کر
ہاتھوں پر پڑے گٹھوں کی قسم کھا کر
ہم لڑیں گے ساتھی

ہم لڑیں گے تب تک
جب تک ویرو چرواہا
بکریوں کا پیشاب پیتا ہے
کھلے ہوئے سرسوں کے پھول کو
جب تک بونے والے خود نہیں سونگھتے
کہ سوجھی آنکھوں والی
گاؤں کی ٹیچر کا شوہر جب تک
جنگ سے لوٹ کر نہیں آتا

جب تک پولیس کے سپاہی
اپنے بھائیوں کا گلا گھونٹنے پر مجبور ہیں
کہ دفتروں کے بابو
جب تک لکھتے ہیں خون کے الفاظ

ہم لڑیں گے جب تک

دنیا میں لڑنے کی ضرورت باقی ہے
جب تک بندوق نہ ہوگی، تب تک تلوار ہوگی
جب تلوار نہ ہوگی، لڑنے کی لگن ہوگی
لڑنے کا ڈھنگ نہ ہوگا، لڑنے کی ضرورت ہوگی

اور ہم لڑیں گے ساتھی
ہم لڑیں گے
کہ لڑے بغیر کچھ نہیں ملتا
ہم لڑیں گے
کہ اب تک لڑے کیوں نہیں
ہم لڑیں گے
اپنی سزا قبول کرنے کے لیے
لڑتے ہوئے جو ہلاک ہو گئے
ان کی یاد تازہ رکھنے کے لیے
ہم لڑیں گے

سب سے خطرناک ہوتا ہے

محنت کی لوٹ سب سے خطرناک نہیں ہوتی
پولیس کی پٹائی سب سے خطرناک نہیں ہوتی
غداری اور لالچ کی مٹھی سب سے خطرناک نہیں
ہوتی

بیٹھے بٹھائے پکڑے جانا، بُرا تو ہے
سہمی سی خاموشی میں جکڑے جانا، بُرا تو ہے

لیکن سب سے خطرناک نہیں ہوتا

فریب کے شور میں
صحیح ہونے کے باوجود دبنا، بُرا تو ہے
جگنوؤں کی لو میں پڑھنا، بُرا تو ہے
مٹھیاں بھینچ کر بس وقت نکالنا، بُرا تو ہے
سب سے خطرناک نہیں ہوتا

سب سے خطرناک ہوتا ہے
مُردہ امن سے بھر جانا
تڑپ کا نہ ہونا اور سب برداشت کرنا
گھر سے کام کے لیے نکلنا
اور کام سے لوٹ کر گھر جانا
سب سے خطرناک ہوتا ہے
ہمارے خوابوں کا مر جانا

سب سے خطرناک وہ گھڑی ہوتی ہے
جو آپ کے کلائی پر چلتے ہوئے بھی
آپ کی نگاہ میں رُکی ہوئی ہے
سب سے خطرناک وہ آنکھ ہوتی ہے
جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی برف کی طرح جمی
ہوتی ہے
جس کی نظر دنیا کو محبت سے چومنا بھول جاتی ہے
جو چیزوں سے اُٹھتی اندھے پن کی بھاپ پر
لُڑھک جاتی ہے

جو روزمرہ کے ترتیب کو پیتے ہوئے
ایک بے مقصد ٹھہراؤ کے اُلٹ پھیر میں کھو جاتی ہے

سب سے خطرناک وہ چاند ہوتا ہے
جو ہر قتل اور ہر جرم کے بعد
ویران ہونے والے آنگن میں چڑھتا ہے
لیکن آپ کی آنکھوں میں مرچی کی طرح گڑھتا
نہیں ہے

سب سے خطرناک وہ نغمہ ہوتا ہے
جو آپ کے کانوں تک پہنچنے کے لیے
مرثیہ پڑھتا ہے
دہشت پیدا کرنے والوں کے دروازوں پر
جو غنڈوں کی طرح اکڑتا ہے

سب سے خطرناک وہ رات ہوتی ہے
جو زندہ روح کے آسمانوں پر ڈھلتی ہے
جس میں صرف اُلو اور ہُوا ں ہُوا ں کرتے گیدڑ
بولتے
قدیم اندھیرے کے بند دروازوں اور چوکھٹوں
پر چپک جاتے ہیں

سب سے خطرناک وہ سمت ہوتی ہے
جس میں زندگی کا سورج ڈوب جائے
اور جس کی مردہ دھوپ کا کوئی ٹکڑا

آپ کے جسم کے مشرق میں چُھپ جائے
محنت کی لوٹ سب سے خطرناک نہیں ہوتی
پولیس کی پٹائی سب سے خطرناک نہیں ہوتی
غداری اور لالچ کی مٹھی سب سے خطرناک ہوتی
ہے

اب میرا حق بنتا ہے

میں نے ٹکٹ خرید کر
تمھاری جمہوریت کی نوٹنکی دیکھی ہے
اب تو میرا تماشا گاہ میں بیٹھ کر
ہائے ہائے کرنے اور چیخنے کا حق بنتا ہے
آپ نے بھی ٹکٹ دیتے وقت
کوئی رعایت نہیں کی
اور میں بھی اب اپنے ہاتھوں سے
پردے پھاڑوں گا
گدّے جلا ڈالوں گا

پارلیمنٹ

زہریلی شہد کی مکھی کی جانب انگلی نہ کرو
جسے آپ چھتا سمجھتے ہیں
وہاں عوام کے نمائندے رہتے ہیں

آخر میں

ہمیں پیدا نہیں ہونا تھا
ہمیں لڑنا نہیں تھا
ہمیں تو برفیلی چوٹی پر بیٹھ کر
عبادت کرنی تھی
لیکن جب ستلج کے پانی سے بھاپ اٹھی
جب قاضی نذر الاسلام کی زبان رُکی
جب لڑکوں کے پاس جیمس بانڈ دیکھا
تو میں نے کہا، چل بھائی سنت سادھو *
نیچے زمین پر چلیں
گناہوں کا بوجھ تو بڑھتے جاتا ہے
اور اب ہم آئے ہیں
یہ لو ہمارا فتح نامہ
ہمارے حصے کا خنجر ہمیں گھونپ دو
ہمارا پیٹ حاضر ہے

* پاش کا شاعر دوست

جاوید صدیقی

سرپھرا

اصولی طور پر یہ خاکہ مجھے اس وقت لکھنا تھا جب میرے ہاتھوں میں ساجد کے گرم کھردرے ہاتھوں کالمس زندہ تھا۔ جب کانوں میں اس کی آواز کی گونج مدھم نہیں ہوئی تھی۔ مگر وقت گزرتا چلا گیا اور میں یہی سوچتا رہا کہ ساجد کی ہفت پہلو شخصیت کو کس زاویے سے دیکھوں کہ وہ سمٹ کر میرے قلم کے دائرے میں آسکے، مگر اندازہ ہوا کہ یہ ناممکن ہے۔

ساجد رشید صحافی تھے، کہانی کار تھے، ناول نگار تھے، ڈرامے لکھتے تھے، پینٹنگ کرتے تھے، کارٹون بناتے تھے اور سماج میں مثبت انقلاب لانے کے لیے سربکف رہتے تھے۔ انھیں جس زاویے سے بھی دیکھیے ایک مکمل شخصیت دکھائی دیتی ہے۔ اب ایسی ''مجموعہ شخصیات'' پر کوئی لکھے بھی تو کیا لکھے اور کیسے لکھے؟

مگر لکھنا تو پڑے گا کیوں کہ دوستی کا تقاضہ یہی ہے۔ یہاں یہ بتانا دل چسپ ہوگا کہ ہماری دوستی کی ابتدا ایک ایسے ناگوار نوٹ سے ہوئی تھی جس کے نتیجے میں دشمنی ہوجانی چاہیے تھی مگر ہوئی نہیں۔

یہ 1995 کی بات ہے کہ نہرو سینٹر میں ''تمہاری امرتا'' کا شو تھا۔ شو ختم ہو چکا تھا۔ میں ایک کونے میں کھڑا چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اپنی بیوی فریدہ کا انتظار کر رہا تھا جو ہال کے اندر کسی سے باتیں کر رہی تھیں کہ اچانک ساجد سامنے آکھڑے ہوئے، ان کے ساتھ فیاض احمد فیضی بھی تھے جنھیں میں جانتا تھا۔ فیضی نے کہا۔

''یہ ساجد رشید آپ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''

میں نے ساجد کا نام تو سنا تھا مگر کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے ذرا غور سے دیکھا۔
سانولا رنگ، سر کے بال آگے سے اڑے ہوئے، سنہری فریم کے اندر چمکتی ہوئی آنکھیں اور سیاہ مونچھوں کے الجھے ہوئے بالوں کے نیچے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ جس کا مطلب سمجھنا مشکل تھا۔
میں مسکرایا۔ ''پوچھیے!''
ساجد نے چشمے کے پیچھے اپنی آنکھیں جھپکائیں اور اونچی آواز میں کہا۔
''یہ آپ نے کیا لکھا ہے جاوید صاحب؟''
میں اس تیور اور اس جملے بلکہ حملے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے لڑکھڑا گیا۔
''کیا کچھ غلط لکھ دیا میں نے؟''
وہ ذرا سا آگے کو آئے اور زور سے ہاتھ ہلا کر بولے۔ ''یہ تو ڈراما ہی نہیں ہے!''
میں ذرا چڑھ گیا۔ ایک تو میں اس شخص کو جانتا نہیں، دوسرے اتنی بدتمیزی سے بات کر رہا ہے، میں نے بھی آواز اونچی کی جو میرا طریقہ نہیں ہے۔ اور پوچھا۔
''کتنا جانتے ہیں آپ ڈرامے کے بارے میں؟''
''میری چھوڑیے۔ مگر سچ یہی ہے کہ آپ نے ڈرامے کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنایا ہے!''
اب مجھے غصہ آچکا تھا۔ میں نے پوچھا۔
''آپ کے خیال میں یہ نو سو (۹۰۰) آدمی جو اندر بیٹھے تھے بیوقوف ہیں؟''
کہنے لگے۔ ''وہ سب شبانہ اعظمی اور فاروق شیخ کو دیکھنے آئے تھے!''
میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس بے ہودہ آدمی کو کون سی گالی دوں کہ فریدہ آگئیں۔
''چلیے۔'' انھوں نے کہا۔
ساجد نے بڑے ادب سے فریدہ کو سلام کیا۔ ''آداب بھابی۔''
میری طرف ایک مذاق اڑانے والی مسکراہٹ پھینکی اور فیضی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے باہر جانے والے ہجوم میں شامل ہو گئے۔
''یہ کون تھے؟'' فریدہ نے پوچھا۔
''شیکسپیئر کے سگے بھتیجے ہیں، ڈرامے پر ڈاکٹریٹ لے کے ابھی ابھی آئے ہیں!''
فریدہ نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ پھر ساجد کی طرف نظر ڈالی۔
اور اس طرح سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہوں۔ ''ہوگا کوئی!''
ہماری پہلی ملاقات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگلی ملاقات کیسی ہوئی ہوگی، مگر آپ کو تعجب ہوگا

کہ دوسری ملاقات بالکل ویسی نہیں تھی۔ کچھ مہینوں بعد پریس کلب میں پاکستانی شاعرہ فہمیدہ ریاض کے ساتھ ایک ملاقات کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جب میں وقت مقررہ پر پریس کلب پہنچا تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ پتہ چلا کہ کسی وجہ سے فہمیدہ کا بمبئی آنا ملتوی ہو گیا تھا، اسی لیے اس شام کی نشست منسوخ ہو چکی ہے۔ مجھے ان لوگوں پر بہت غصہ آیا جنھوں نے بلانے کے لیے فون تو کیا تھا، مگر نہ آنے کی خبر دینے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ میں واپس جا رہا تھا کہ ساجد رشید سے ٹکرا گیا۔ جو مقدر حمید سے باتیں کرتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ وہ بڑے تپاک سے ملے، خیر و عافیت پوچھی، فہمیدہ ریاض کے نہ آنے پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا۔

''اب آپ اتنی دور سے آئے ہیں تو ایک کپ چائے تو پی کر جائیے!''

دل تو نہیں چاہتا تھا کہ اُن کے ساتھ چائے پیوں مگر تھکا ہوا تھا اور مقدر حمید بھی اصرار کر رہے تھے اس لیے بیٹھ گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ چائے پیتے پیتے ساجد نے پوچھا۔

''تو آج کل کیا لکھ رہے ہیں آپ؟''

مجھے لگا ساجد پھر ایک بار میری بے عزتی کرنے کے موڈ میں ہیں۔ اس لیے میں نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''میں کیا لکھوں گا۔ مجھے لکھنا آتا ہی کہاں ہے۔''

ساجد مسکرائے اور بولے: ''کیا بات کرتے ہیں آپ؟ اردو رپورٹر میں آپ کا ہر کالم پڑھا ہے میں نے، خاص طور سے 'آ بیل مجھے مار'۔ واہ کیا کالم تھا!''

میں نے پوچھا: ''اگر مجھے لکھنا آتا ہے تو آپ نے یہ کیوں کہا تھا کہ 'تمہاری امرتا' ڈراما ہی نہیں ہے۔''

''اپنی اُس بات پر میں آج بھی قائم ہوں۔ تمہاری امرتا ڈراما نہیں ہے۔ آپ تیار ہوں تو میں بحث کے لیے تیار ہوں۔''

میں نے سوچا اِن حضرت کو کھری کھری سنانے کا اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ اس لیے میں نے کہا۔

''میں بحث کے لیے تیار ہوں۔'' اور پوچھا۔

''تو آپ کے خیال میں تمہاری امرتا ڈراما نہیں ہے؟''

ساجد نے زور سے سر ہلایا اور بولے۔

''جی نہیں۔ اِس میں ڈرامے والی کوئی بات نہیں ہے۔''

اور ہماری بحث شروع ہو گئی۔ مقدر حمید کچھ دیر تو بیٹھے مزے لیتے رہے پھر معذرت کر کے چلے

گئے، انھیں ڈاکٹر کے پاس جانا تھا۔
تیکھے سوالوں اور ٹیڑھے جوابوں کے دوران ہم نے بہت سی گرم چائے پی، گرم پکوڑے کھائے اور پکوڑوں سے زیادہ گرما گرم بحث کی جو تقریباً ڈھائی گھنٹے جاری رہی۔ بحث کے نتیجے میں دو اہم باتیں ہوئیں پہلی تو یہ کہ میں نے ساجد کو یہ کہہ کر چت کر دیا کہ ''لفظ ڈراما کا مطلب ہے کوئی ایسی بات جو انوکھی اور غیر متوقع ہو۔ ضروری نہیں ہے کہ اُس میں Movement ہو، Light ہو، Music وغیرہ ہو۔ ایسا کوئی اصول ابھی تک مقرر نہیں ہوا۔''
وہ قائل ہو گئے اور مان لیا کہ تمہاری امرتا نہ صرف یہ کہ ڈراما بلکہ اچھا ڈراما ہے۔
دوسری بڑی بات یہ ہوئی کہ ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ دوستی کی ایک ادا یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ دوست کی خوبیاں ڈھونڈتی ہے تاکہ دوستوں کے درمیان قربت، اخلاص، اور اعتماد بڑھ سکے، جو دوستی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے اور رشتے کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ میں نے بھی ساجد کے بارے میں پڑھنا، پوچھنا اور جاننا شروع کیا تو پتہ چلا کہ یہ صاحب جو بظاہر تیل نکلا ہوا تِل نظر آتے ہیں، کافی پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔ بہت ساری کہانیاں، ڈرامے اور ایک ناول لکھ چکے ہیں اور ان کا کالم ''زندگی نامہ'' ہندستان ہی میں نہیں، پاکستان میں بھی کافی مقبول ہے۔ باقاعدہ سیاست میں نہیں ہیں یعنی کسی پارٹی کا جھنڈا اٹھا کر نہیں چلتے، مگر سیاست کی چھوٹی بہن سماجی خدمت سے اچھے تعلقات رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ساجد کا بڑا سروکار فرقہ پرستی سے تھا۔ وہ فرقہ واریت کے بھیانک منظر، کشمیر، مہاراشٹر، اتر پردیش بلکہ خود اپنے شہر میں دیکھ چکے تھے۔ ان کا کہنا تھا فرقہ پرستی ایک زہر ہے جس کی تجارت کی جا رہی ہے اور نفع کمایا جا رہا ہے۔
ایک بار انھوں نے کہا تھا۔
''یہ مندر مسجد کا مسئلہ ہے ہی نہیں یہ تو ایک ذہنیت ہے جو چہرہ بدل بدل کر سامنے آتی رہتی ہے۔''
جیسے جیسے وقت گزرا ساجد سے بہت سی ملاقاتیں اور باتیں ہوئیں۔ مجھے بہت سے مواقع ملے کہ میں ساجد کو قریب سے دیکھ سکوں اور سمجھ سکوں، اور ہر بار یہ احساس ہوا کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے۔
ساجد رشید کی شخصیت میں سراب اور سمندر ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے اور دیکھنے والے الجھ کر رہ جاتے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ساجد کو چونکانے کا شوق تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی بات کہا یا لکھا کرتے تھے جو دوسروں سے بالکل مختلف ہوتی تھی۔ اختلاف رائے تو ویسے ہی لوگوں سے ہضم نہیں ہوتا ہے وہ ساجد کی باتوں کو کیا برداشت کرتے، جس میں تلوار کی تیزی اور تیزاب کی تندی ہوا کرتی تھی۔ ساجد کے بارے میں دنیا کی رائے یا تو بہت اچھی تھی یا بہت بُری۔ ان کے دوست سرآنکھوں پر رکھتے تھے

تو دشمنوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جن کی آنکھوں میں ساجد کا وجود کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔ ساجد کے دشمنوں میں وہ لوگ زیادہ تھے جو اُن سے نظریاتی اختلاف رکھتے تھے۔ بہت سے لوگوں نے تو ساجد کی بے باکی اور بے خوفی کو چھرے اور چاقو کی مدد سے ختم کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

یہ اگست ۲۰۰۴ کی بات ہے۔ میں دہلی میں تھا جب مجھے ساجد پر قاتلانہ حملے کی خبر ملی۔ میں نے فون کیا تو پتہ چلا کہ اسپتال میں ہیں۔ ان کے بیٹے شاداب نے فون اٹھایا اور ساجد سے بات کرائی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا حال ہے بھائی؟''

جواب میں ایک کھرکھراتی ہوئی مگر مضبوط آواز سنائی دی۔

''حال اُن بزدلوں کا پوچھیے جو پیچھے سے وار کر کے بھاگ جاتے ہیں۔''

ساجد نے بتایا کہ وہ حملہ آوروں کو جانتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ حملہ ان کی زبان بند کرنے کے لیے کرایا گیا تھا۔ مگر زبان تو بند نہیں ہوئی اور یہ حقیقت ہے کہ جس چھرے کی دھار ساجد پر آزمائی گئی تھی اس کی تیزی ساجد کے قلم میں آ گئی۔ اس حادثے کے بعد انھوں نے جو کچھ لکھا اس کی کاٹ کی مثال اُس وقت کی پوری صحافت میں نہیں ملتی۔ ظلم، جبر، سماجی نابرابری، سیاسی استحصال، پس ماندگی، بدعنوانی اور مسلمانوں کی مسلکی منافرت کے خلاف ساجد نے جو کچھ لکھا، جم کر بے باکی سے لکھا اور ایسا لکھا کہ آج بھی حوالے کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ساجد کا قلم اگر ننگی تلوار تھا تو زبان بھی نوک خنجر تھی۔ جہاں جاتے، جو بھی بولتے اور جس موضوع پر بولتے وہ دل میں چبھ جاتا۔

دن تاریخ تو یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ انڈین چیمبرس آف کامرس میں ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ ساجد رشید، مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے ساتھ سرکار کے نامنصفانہ برتاؤ کا ذکر کر رہے تھے۔ بات چلتے چلتے کہیں اور پہنچ گئی اور ساجد رشید نے اشارتاً ایک ایسے نام نہاد مسلم لیڈر کا حوالہ دیا جو دوسروں کی محنت کا سہرا اپنے سر باندھنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔

اچانک پچھلی صف میں سے ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور چیخ کر بولے۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ساجد صاحب؟ یہ موقع ان باتوں کا نہیں ہے۔''

حاضرین میں بے چینی پھیل گئی، لوگوں کو لگا اب کوئی جھگڑا شروع ہو جائے گا۔ مگر ساجد پر اثر بھی نہ ہوا، انھوں نے چشمے کے اندر سے اپنی آنکھیں چمکائیں اور انگلی اٹھا کر بولے۔

''ابھی مت روکیے، سُن لیجیے۔ جب جھوٹ بولنے لگوں تو ٹوک دینا۔''

ساجد کے بے باک، بے لاگ اور بے خوف بیانات سے وہ تمام لوگ تو ڈرتے ہی تھے جو اُن کے نشانے پر ہوتے تھے۔ ان کے دوست بھی پریشان ہوتے رہتے تھے کہ پتہ نہیں یہ سرپھرا کب

کہاں کیا بول دے اور کیا کر ڈالے، مگر ساجد رشید کو ان تمام باتوں کی کوئی پرواہ کبھی نہیں رہی۔ وہ نہ کبھی مایوس ہوتے تھے اور نہ ڈرتے تھے۔ کوئی کچھ بھی کہے۔ انھوں نے اپنے نظریات کو اس لیے بدلنے کی کوئی کوشش کبھی نہیں کی کہ بہت سے لوگ ان سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ سماج میں نظریاتی اختلافات کی لہریں نہ اٹھیں تو سارا سماج ایک ٹھہرا ہوا گندا تالاب بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ ان لوگوں کی بھی عزت کرتے تھے جو ان سے صحت مند اختلاف رکھتے تھے۔

جب تسلیمہ نسرین بمبئی آئی تھیں۔ ایرپورٹ پر اُن ہزاروں لوگوں کا ہجوم تھا جو تسلیمہ کو پکڑ کے سر عام پھانسی دینے کے حق میں تھے۔ پولیس کا زبردست پہرہ تھا۔ صحافیوں کو بھی روکا جا رہا تھا مگر ساجد نہ جانے کیسے اندر پہنچ گئے۔ تسلیمہ سے ملاقات کی، اُن کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں اور جب کچھ دوستوں نے پوچھا کہ یہ کیا حرکت تھی؟ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تسلیمہ سے ملنے کی کیا ضرورت تھی، تو ان کا جواب تھا۔

''دنیا میں کہیں بھی جرم ثابت ہونے سے پہلے سزا نہیں سنائی جاتی ہے۔ پھر تسلیمہ کے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اُسے ایک ایسے جرم کی سزا دی جا رہی ہے جو اُس کا جرم ہے ہی نہیں۔''

(ان کا اشارہ تسلیمہ نسرین کی کتاب ''لجا'' کی طرف تھا۔ جس سے سارا ہنگامہ شروع ہوا تھا)

چھوٹے بڑے درجنوں ایسے واقعات ہیں جن سے ساجد کی فکری انفرادیت اور ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی فطرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حاجی علی درگاہ میں خواتین کے داخلے پر پابندی لگادی گئی کہ مردوں کے تقدس میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس مضحکہ خیز غیر منطقی دلیل کے خلاف شدید احتجاج ہوا اور عورتوں نے ایک زبردست جلوس نکالا جو ورلی سے چلتا ہوا درگاہ تک پہنچا۔ اس جلوس کی سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ ہزاروں عورتوں کے ساتھ صرف ایک مرد پلے کارڈ لیے چل رہا تھا اور وہ تھا ساجد رشید!

ایسے بہت سے واقعات بھی ہیں جن سے ان کی سوچ کے Contradictions کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی مثال میں ایک دل چسپ واقعہ یاد آتا ہے۔

ہوا یوں کہ ہمارے ایک مشترکہ دوست نے پتہ نہیں کس وجہ سے یا کس موڈ میں ساجد سے کہہ دیا کہ جاوید صاحب کہہ رہے تھے: ''یہ ساجد اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟''

ساجد نے اس بات کا برا مانا، بہت سے دوستوں کے سامنے یہ بات دہرائی اور پوچھا کہ ''میں نے کیا کیا ہے۔ جو جاوید صاحب نے ایسا کہا؟''

دھیرے دھیرے یہ خبر پھیل گئی کہ ساجد اور جاوید میں کچھ اَن بن ہوگئی ہے۔ لطف لینے کی بات

یہ ہے کہ اُن بن کے فریق ثانی یعنی مجھے بھنک بھی نہیں ملی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے الیاس شوقی کا کہ انھوں نے فون کیا اور پوچھا۔

''آپ نے ایسا کیوں کہا۔ کیا ساجد سے آپ کو کوئی شکایت ہے۔ اگر ہے تو کیا ہے۔ بتایئے؟''

اب میں حیران کہ جن صاحب کے بیان سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے، ان سے تو میری ملاقات ہی نہیں ہوئی تو ساجد کے بارے میں کچھ کہنے کا سوال ہی کیا پیدا ہوتا ہے۔ شوقی نے میری بات پر یقین کیا اور کہا کہ وہ ساجد کو بتا دیں گے۔ بات ختم ہو جائے گی، مگر مجھے بڑا صدمہ ہوا کہ ساجد نے یقین کیسے کر لیا؟ جبکہ وہ جانتے ہیں کہ میں کافی منہ پھٹ ہوں اور اگر کسی کو کچھ کہنا ہوتا ہے تو اس کے منہ پر کہہ دیتا ہوں۔ اسی لیے دوستوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ صدمہ اس کا بھی تھا کہ ساجد جیسے آدمی میں اخلاقی جرأت کی اتنی کمی ہے کہ وہ مجھ سے براہ راست نہ پوچھ سکے، اور دوسروں سے شکایت کرتا پھرے۔ میں نے دل میں سوچا یہ آدمی کچے کانوں کا ہے اس لیے قربت جو بڑھ رہی ہے اسے روکنا پڑے گا۔ مگر اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے میں نے ان صاحب کو فون کیا جو اس فساد کی بنیاد تھے۔ انھوں نے فوراً مان لیا کہ جب کوئی ملاقات ہی نہیں ہوئی تو کچھ کہنے سننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میں نے گفتگو ریکارڈ کی اور ساجد کو سنا کر کہا۔

''آئندہ جب بھی ایسی کوئی بات ہو تو دل میں لے کے مت بیٹھا کرو، پوچھ لیا کرو، اگر سچ ہو گی تو ایک دوست نہیں دشمن سامنے آ جائے گا اور جھوٹ ہو گی تو دوست کھونے سے بچ جاؤ گے!''

بعد میں ایک مرتبہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ساجد نے کہا تھا۔

''جذباتی آدمی ہوں، دل دکھانے والی چھوٹی سی بات بھی بڑی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کا اظہار بہت مشکل ہوتا ہے!''

میں نے کہا۔ ''برادر آپ کو جو بات بری لگتی ہے اس کے خلاف کالم سیاہ کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اظہار مشکل ہوتا ہے!''

بولے۔ ''میں انہیں باتوں پر کالم سیاہ کرتا ہوں جن کا تعلق براہ راست میری ذات سے نہیں ہوتا۔''

ہے نا مزیدار CONTRADICTION کہ ایک آدمی ایک ہی وقت میں جذباتی بھی ہو سکتا ہے اور انتہائی غیر جذباتی بھی، اگر اُن چند کمزریوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو ہر انسان میں کچھ کم یا کچھ زیادہ ہوتی ہیں تو ساجد ایک صوفی صفت، قلندر مزاج انسان نظر آتے ہیں۔ اللہ نے ان کو جتنی عزت اور شہرت عطا کی تھی اتنی دولت تو نہیں دی تھی مگر عسرت اور پریشانی بھی نہیں تھی۔ چاہتے تو

ٹھاٹھ سے رہ سکتے تھے مگر میں نے ان کو دکھاوا کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ نہایت سادہ کپڑے پہنتے تھے، رہن سہن بھی سادہ تھا۔ کھانے پینے کے شوقین تھے مگر مرغن کھانوں سے بچتے تھے۔ ایک بار کہا تھا۔

''میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں رشوت اور گھی ہضم نہیں ہوتا۔ تر مال کھاؤں تو پیٹ پر دانے نکل آتے ہیں۔''

وہ سب کو ساتھ لے کر چلنے والے آدمی تھے اور اس کوشش میں اگر کوئی اُن سے آگے نکل جائے تو بہت خوش ہوتے تھے۔ آج کے بہت سے نامور صحافی کبھی ساجد کے جونیر بلکہ شاگرد تھے۔ اردو ٹائمز، مہانگر، صحافت اور نیا ورق کے ذریعے انھوں نے درجنوں نوجوان صحافیوں کو ذہن سازی کی تربیت دی جو ایک جرنلسٹ کے لیے بے حد ضروری ہے۔ وہ محنتی ایمان دار اور بے باک صحافیوں کی ایک پوری نسل تیار کرنا چاہتے تھے جو بہت بڑا کام ہے۔ ساجد کو اپنے لیے کچھ بچا کر رکھنے کا شوق کبھی نہیں رہا۔ ان کے پاس جو کچھ بھی تھا اُسے بانٹ کر بہت خوش ہوتے تھے۔ چاہے وہ ان کا تجربہ ہو، علم ہو، خلوص ہو یا پھر مالی امداد ہو۔ کتنے ہی ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو ساجد کا احسان مانتے ہیں کہ انھوں نے مہاراشٹر ساہتیہ اکیڈمی کے ذریعے اُن کے خوابوں کو پورا کیا۔

ساجد کو اگر کہیں Talent نظر آجاتا تو اُسے اُبھارنے اور سنوارنے میں کبھی پیچھے نہ رہتے۔ یہاں اگر میں اپنی مثال دوں تو غلط نہ ہوگا۔ میں نے کالم لکھے، ڈرامے لکھے، فلمیں لکھیں مگر کبھی سنجیدہ ادب کی طرف توجہ نہیں کی۔ لیکن جب خاکے لکھنے شروع کیے تو جن لوگوں نے ہمت افزائی کی ان میں ساجد پیش پیش تھے۔

ایک رات ۲ بجے کے قریب ان کا فون آیا۔ پوچھا۔ ''کیا آپ جاگ رہے ہیں؟''

میں نے کہا ''میں تو اس لیے جاگ رہا ہوں کہ لکھ رہا ہوں۔ آپ کیوں جاگ رہے ہیں؟''

کہنے لگے۔ ''آپ کا خاکہ یوں ہی ایک نظر ڈالنے کے لیے اٹھایا تھا مگر آپ کی زبان اتنی اچھی ہے کہ پہلے جملے نے ہی باندھ لیا۔ دوبار پڑھ چکا ہوں اور تیسری بار پڑھنے کا ارادہ ہے۔''

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک نئے نویلے ادیب کو اِس سے بڑی داد اور کیا مل سکتی ہے۔ اُس رات ساجد نے مجھ سے ایک وعدہ لیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا۔

''وعدہ کیجئے کہ نیا ورق کا کوئی شمارہ آپ کی تحریر سے خالی نہیں جائے گا۔''

میں نے وعدہ کیا تھا اور الحمدللہ آج تک اپنے وعدے پر قائم ہوں۔ ساجد جیسے دوست کی بات خالی کیسے جا سکتی ہے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ساجد رشید کی پہچان ان کی صحافت ہے۔ یہ خیال کسی حد تک

درست بھی ہے۔ کیوں کہ انھوں نے اپنی عملی زندگی کی ابتدا صحافت سے کی اور اُسی میدان میں قلم دوڑاتے ہوئے شہید ہوئے۔ لیکن ان کی ایک اور بے پناہ صلاحیت کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا ہے جو اسے ملنا چاہیے تھا اور وہ ہے ساجد کی افسانہ نگاری۔

ساجد کی کہانیوں کے پانچ مجموعے ریت گھڑی، نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی، ایک چھوٹا سا جہنم اور سونے کے دانت (ہندی) ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔ پانچویں کتاب ''ایک مردہ سر کی حکایت'' ان کی وفات کے بعد شائع ہوئی۔ ساجد کی کہانیاں جن لوگوں تک پہنچی تھیں ان سے تحسین بھی حاصل کر چکی تھیں۔ وارث علوی اور گوپی چند نارنگ جیسے نقادوں کا خیال تھا کہ ساجد اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ حساس اور باریک بین ہیں۔ وہ انسانی زندگی پر چڑھے ہوئے طرح طرح کے پرت ہٹا کر سچائیوں کو دیکھ لینے کی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں۔

کہانی کار ساجد کا عدیم المثال کارنامہ ان کی کہانی ''ایک مردہ سر کی حکایت'' ہے۔ اردو کا ادب ایسی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے جن کے محرک سیاسی اور سماجی حادثات ہیں۔ اس ضمن میں جنگ آزادی، تقسیم ہند اور دہشت گردی پر لکھی گئی کہانیوں کے حوالے جا سکتے ہیں۔ ساجد کی کہانی مردہ سر کی حکایت بھی ایک دہشت گردانہ حملے کے ردعمل سے جنمی کہانی ہے۔ اس کہانی کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک ہی وقت میں نابینا سیاست، سماجی بے حسی، انسانی کمزوری اور ان سب کے نتیجے میں ایک سوچنے والے ذہن پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیتی ہے۔ ساجد کی کہانی کا بیانیہ عام کہانیوں سے بالکل مختلف ہے اور اس کا کمال یہ ہے کہ قاری اُس ذہن میں اترتا چلا جاتا ہے جو سوچ تو سکتا ہے مگر ایک کٹے ہوئے سر کے اندر قید ہے۔ اور جب کہانی ختم ہوتی ہے تو پڑھنے والا سوچنے لگتا ہے کہ کیا ہم سب کٹے ہوئے مردہ سر نہیں ہیں جو اپنے جسم تلاش کر رہے ہیں۔ وہ جسم جو ہم نے خود ہی انتہا پسندی کے بم سے اڑا دیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اردو کی سو (۱۰۰) عظیم کہانیوں کی فہرست بنائی جائے تو مردہ سر کی حکایت سرفہرست ہوگی۔ دنیا ان کے باقی کارناموں کو یاد رکھے یا نہ رکھے یہ ایک کہانی ساجد کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

ساجد عام طور پر دل کی باتیں نہیں چھپاتے تھے مگر جب دل کا مرض ہوا تو نہ جانے کیوں چھپالیا۔ ہوسکتا ہے ان کے خاندان والوں اور کچھ قریبی دوستوں کو معلوم رہا ہو مگر مجھے ان کی بیماری کا حال بہت دیر سے معلوم ہوا۔

اپریل ۲۰۱۱ میں ساجد کے بیٹے شاداب کی شادی پر بائیکلہ کے ایک وسیع کمپاؤنڈ میں ریسپشن تھا۔ ساجد کا حلقہ بہت بڑا تھا اس لیے طرح طرح کے مہمان بھرے ہوئے تھے۔ ساجد سب کا

استقبال کر رہے تھے۔ گلے بھی مل رہے تھے، باتیں بھی کر رہے تھے۔ مگر مجھے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ بجھے بجھے سے ہیں۔ وہ چمک جو ہمیشہ ان کی آنکھوں میں دکھائی دیتی تھی غائب تھی۔ میں نے بات کرنے کی کوشش کی تو انھوں نے ٹھیک سے جواب بھی نہیں دیا۔ مجھے لگا کہ وہ پھر ایک بار مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو گئے ہیں اور حسب عادت بتا نہیں رہے ہیں۔ میرا شک اس وقت یقین میں بدل گیا جب میں اسٹیج پر دولہا کے ساتھ تصویر کھینچوا رہا تھا تو ساجد اسٹیج کے نیچے کھڑے تھے اور فوٹو کھینچوانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے کئی بار آواز دی۔

''ایسا موقع بار بار نہیں آتا ہے۔ ایک تصویر آپ کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔''

انھوں نے اشارے سے کہہ دیا ''آتا ہوں۔'' مگر نہیں آئے۔ اور میرے ساتھ فوٹو نہیں کھینچوایا۔ مجھے بے حد تکلیف ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جو یہ حضرت اتنے روٹھے ہوئے ہیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ایک دن جھلا کر ساجد ہی کو فون کر دیا۔

پہلے تو خوب برا بھلا کہا پھر پوچھا کہ اس طرح توہین کرنے کی وجہ کیا تھی۔ جواب میں جو کچھ ساجد نے کہا وہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ انھوں نے کہا۔

''سینے میں اتنا درد تھا جاوید صاحب کہ سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ایسی شدید تکلیف تھی کہ میں اسٹیج کی تین سیڑھیاں بھی نہیں چڑھ سکتا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔''

مجھ پر شرمندگی اور افسوس کا جو عالم گزرا وہ بس میں ہی جانتا ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ وہ اتنے زیادہ بیمار ہیں۔

پتہ چلا کہ ساجد کے دل کی حالت کافی خراب ہے دواؤں سے کوئی افاقہ نہیں ہو رہا ہے۔ اور ڈاکٹروں نے بائی پاس کرانے کی صلاح دی ہے۔ مگر آپریشن آسان نہیں ہے کیوں کہ ان کے دل کی شریانیں بہت باریک ہیں اور ایسا آپریشن ہر Cardiologist کے بس کا نہیں ہوتا۔ اس کے لیے کسی Expert کی ضرورت ہے۔ بڑی مشکل سے ایک ایسے ماہر ڈاکٹر کا پتہ لگایا گیا جو ساجد جیسے الجھے ہوئے کیس سلجھانے کے لیے مشہور تھا۔

ڈاکٹر نے ساجد کا فائل دیکھا اور آپریشن کے لیے تیار ہو گیا مگر اس نے جو فیس مانگی وہ چار گنا زیادہ تھی۔ ساجد کے لیے اتنی بڑی رقم کا بندوبست آسان نہیں تھا اور وہ مدد کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے والے بھی نہیں تھے۔

جو لوگ ساجد کے ساتھ گئے تھے انھوں نے ڈاکٹر سے درخواست کی کہ وہ اتنی ہی فیس لے جتنی عام طور پر لی جاتی ہے۔ مگر اس ڈاکٹر نے جس نے ایم بی بی ایس کی ڈگری ہاتھ میں لیتے وقت قسم

کھائی تھی ۔وہ زندگی بھرانسانیت کی خدمت کرے گااوراپنے مقدس پیشے کو تجارت نہیں بنائے گا۔
ساجد کے فائل کو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا۔
''ایک پیسہ کم نہیں ہوگا۔آپریشن کرانا ہے تو پوری فیس لاؤ۔ورنہ باہر جاؤ''
ساجد نے فائل اٹھایا اور کہا۔ ''اب چاہے مرجاؤں مگر اس لالچی سے آپریشن نہیں کراؤں گا''
آج میں سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ بات فیس کی کمی یا زیادتی کی نہیں تھی ۔دراصل ساجد کی غیرت اس تذلیل کو برداشت نہ کرسکی جو ڈاکٹر نے فائل پھینک کر کی تھی۔
سات جولائی ۲۰۱۱ کی ایک بھیگی ہوئی صبح کو ساجد کا بائی پاس ہوا۔ہم سب کو بتایا گیا کہ آپریشن کامیاب ہوا ہے اور وہ ہفتے عشرے میں گھر آجائیں گے۔خود ساجد نے بھی اسپتال جانے سے پہلے یہی کہا تھا۔
'جلد ہی ملاقات ہوگی۔میں بس یہ گیا اور یہ آیا۔''
مگر ایسا ہوا نہیں اور گیارہ جولائی کو وہاں چلے گئے جہاں کوئی جانا نہیں چاہتا مگر سب کو جانا پڑتا ہے۔
وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے اس کا اندازہ تب تک نہیں ہوتا جب تک وہ گزر نہ جائے۔ساجد کو گئے ہوئے بھی برسوں گزر چکے ہیں۔
کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے لمحوں کی تیز ہوا ساری یادوں کو اپنے ساتھ اڑا کے لے گئی ہے اور کبھی لگتا ہے یہ سب کل ہی کی تو بات ہے، کل ہی تو ساجد نے فون کیا تھا۔کل ہی تو انھوں نے کہا تھا۔
''بس یہ گیا اور یہ آیا۔''
ساجد اپنا وعدہ بھولنے والوں میں سے نہیں ہیں۔وہ بار بار مجھ سے ملنے آجاتے ہیں کبھی نیا ورق بن کر کبھی شاداب اور التمش کی صورت بن کر اور کبھی الیاس شوقی، اسلم پرویز، غنی بھائی جیسے دوستوں کے جلو میں۔وہ جب بھی آتے ہیں میرے سیٹنگ روم میں ایک مدھم من موہنی خوشبو سی پھیل جاتی ہے جیسے کوئی معطر نمازی کھڑکی کے نیچے سے گزر گیا ہو جیسے کہیں پاس ہی لوبان جل کے بجھ گیا ہو۔جب بھی وہ خوشبو آتی ہے میں آنکھیں بند کرلیتا ہوں اور ساجد رشید کو یاد کرنے لگتا ہوں۔اور مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی ایک سرگوشی سنائی دیتی ہے۔

مری جان ، آج کا غم نہ کر کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر، کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

■■

الیاس شوقی

لفظوں کا مسیحا

(رشید حسن خاں)

خاں صاحب سے میری پہلی ملاقات ممبئی یونیورسٹی کے کنووکیشن ہال کے ایک سمینار میں ہوئی تھی۔ شاید اردو ڈپارٹمنٹ کی طرف سے وہ سمینار منعقد ہوا تھا۔ مجھے تاریخ یاد نہیں ہے۔ خاں صاحب تقریر کر رہے تھے اور ان کا انداز بڑا دلکش تھا۔ جن لوگوں نے خاں صاحب کو سنا ہے وہ جانتے ہیں کہ خاں صاحب چھوٹے چھوٹے جملوں میں ٹھہر ٹھہر کر اپنی بات سمجھاتے تھے۔ میرے قریب یوسف کھتری صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ یوسف بھائی پہلے مکتبہ جامعہ میں تھے پھر وہاں سے الگ ہو کر انھوں نے کچھ دنوں بعد بھنڈی بازار کی فٹ پاتھ پر ہمدرد دواخانے کے مقابل میں محب بکڈپو کے نام سے ایک باکڑہ کھول لیا۔ بمبئی کے تقریباً سارے ادیب وشاعر فٹ پاتھ کے اس باکڑے پر آتے تھے۔ یوسف بھائی کا ادبی ذوق اور اخلاق دونوں بے مثال تھے۔ مَیں نے یوسف بھائی سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو انھوں نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''انھیں نہیں جانتے، ارے یہ رشید حسن خاں ہیں''۔ مَیں خاں صاحب سے اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ بس نام سنا تھا اور چوں کہ ان کا تعلق زبان کے اس موضوع سے تھا جس سے عام طور پر لوگوں کو کم دلچسپی ہوتی ہے، یعنی زبان وقواعد۔ تو میرے یہاں بھی اس تعلق سے ایک بے اعتنائی کا رویہ تھا بلکہ اکثریت کا یہی احوال ہے۔ حالاں کہ یہ غلط ہے اور شاید اسی لیے فی زمانہ ہمارے اکثر اردو ادیبوں کی تحریروں میں زبان وبیان اور املا کی غلطیاں عام ہیں۔ بہ ہر حال سمینار ختم ہوا تو لوگ ہال کے باہر چائے پر ایک

دوسرے سے مل رہے تھے۔ یوسف بھائی مجھے لے کر خاں صاحب کے پاس پہنچے اور ان سے میرا تعارف کرایا۔ خاں صاحب نے اتنی محبت اور شفقت کا مظاہرہ کیا کہ مَیں اسی ملاقات میں ان کا گرویدہ ہوگیا۔ یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ مَیں پہلی بار ان سے مل رہا ہوں۔

مَیں نے خاں صاحب کو ان کے جانے کے بعد عقیدت بھرا ایک خط لکھا۔ خاں صاحب پُرانے زمانے کے آدمی تھے اس لیے وضع داری ان کی شخصیت کا ایک خاص حصہ تھا۔ انھیں چاہے کوئی بھی خط لکھے وہ اس کا جواب ضرور دیتے تھے اور بڑی محبت سے دیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد مجھے خاں صاحب کا ایک لفافہ ملا جس میں میرے خط کا جواب اور ساتھ میں میرا تحریر کردہ خط بھی موجود تھا۔ خاں صاحب نے املے کی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے میرے خط کا پوسٹ مارٹم کردیا تھا۔ جواب میں املے کی باریکیوں پر بھی روشنی ڈالی تھی۔ خط پڑھ کے جی خوش ہوگیا تھا۔

شاید ۱۹۸۴ء کا سال رہا ہوگا۔ خاں صاحب اردو املا پر منعقدہ ممبئی یونیورسٹی کے ایک سمینار میں شرکت کے لیے بمبئی آئے ہوئے تھے۔ کالینہ کیمپس کے ICSSR HALL میں پروگرام تھا۔ شام میں جب سمینار ختم ہوا تو انور خان، انور قمر اور علی امام نقوی کے ساتھ مَیں بھی ان کے گیسٹ ہاؤس کے کمرے پر پہنچا۔ ان دنوں مَیں بمبئی سے ایک مختصر سا رسالہ 'قلم' نکالتا تھا۔ مَیں نے خاں صاحب کو اس کا ایک شمارہ پیش کرتے ہوئے قلم کے لیے ان کے کسی نئے مضمون کی فرمائش کی۔ انھوں نے رسالے کو لے کر دیکھا اور فوراً مضمون بھیجنے کا وعدہ کرلیا۔ مَیں نے سمجھا کہ شاید میری دلداری میں مضمون کے لیے ہامی بھرلی ہے، لیکن کچھ دنوں بعد مجھے خاں صاحب کا ایک لفافہ ملا جس میں جوابی خط کے ساتھ ان کا مضمون 'ادب اور صحافت' بھی ملفوف تھا (یہ مضمون قلم کے مشترکہ خاص شمارے ۶۔۷۔۸ میں شائع ہوا تھا)۔

ویسے تو بمبئی کے تقریباً سبھی ادیب و شاعر ان سے ملنے پروگرام میں یا اس کے بعد ان کی جائے قیام پر آتے تھے لیکن بعض بزرگ ادیب جو بمبئی میں رہتے تھے خاں صاحب ان سے ملنے خود جاتے تھے۔ جیسے اختر الایمان، مجروح صاحب اور باقر مہدی وغیرہ۔ یہ ان کی وضع داری تھی مَیں ان موقعوں پر اکثر ان کے ساتھ ہوتا تھا خاص طور پر باقر صاحب کے یہاں تو وہ صرف میرے ساتھ ہی جاتے تھے۔ بمبئی کے سارے سینئر ادیبوں میں باقر صاحب کو وہ سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ خاں صاحب کی شخصیت میری فکری تربیت کا ایک اہم حصہ ہے۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں وہ اتنی آسانی سے سمجھاتے کہ عمر بھر کے لیے یاد رہ جاتیں۔ اردو ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ پروفیسر عبدالستار دلوی، خاں صاحب کے بڑے معتقد تھے اور انھیں بہت چاہتے تھے اسی لیے خاں صاحب کو اکثر بمبئی

یونیورسٹی میں توسیعی لیکچر کے لیے بلواتے رہتے تھے۔ ایک بار خاں صاحب ایم اے کے طلبا کو لیکچر دے کر ہال سے باہر نکلے تو ان کے ساتھ مَیں بھی تھا اور خاں صاحب سے تھوڑا سا فاصلہ قائم رکھ کر ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ انھوں نے کہا: ''آپ پریشان نہ ہوں مَیں کمرے تک چلا جاؤں گا''۔ میرا ارادہ تھا کہ انھیں کمرے تک چھوڑ آؤں گا اور ایسے موقعوں پر ہم کہتے بھی یہی ہیں۔ مَیں نے کہا: نہیں خاں صاحب مَیں آپ کو چھوڑ کے آتا ہوں۔'' خاں صاحب مجھ سے دو قدم آگے چل رہے تھے، فوراً رُک گئے اور میری طرف دیکھ کر بولے: ''میاں! جانتے ہو، بلّی چھوڑنے جاتے ہیں، آدمی نہیں''۔ مَیں اس غیر متوقع جواب پر خفیف سا ہو کے رہ گیا۔ پھر خاں صاحب نے ''بلّی چھوڑنا'' محاورے کی تفصیل بتائی جو آج تک یاد ہے۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی بہت سی باتیں حافظے میں محفوظ ہیں۔ مثلاً ایک بار وہ املا پر لیکچر دے رہے تھے درمیان میں اضافت کی بات نکل آئی اور انھوں نے کہا کہ اکثر لوگ ہیں جو اضافت کے متعلق بھی صحیح طور پر نہیں جانتے۔ انھیں اضافت کی قسمیں بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ مثلاً پس منظر کو وہ پسِ منظر کہتے ہیں۔ اب اگر اس کے معنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پسِ منظر کا مطلب ہوگا منظر کے پیچھے۔ منظر تو جو کچھ نظر آرہا ہے وہ ہے اس کے پیچھے کیا ہے کیسے پتہ چلے گا۔ جب کہ پس منظر کا مطلب ہے پیچھے کا منظر۔ یہ اضافتِ مقلوب ہے۔ اضافتِ مقلوب کا ایک واقعہ مجھے بھی یاد آرہا ہے آپ بھی سنیے۔ ایک پروفیسر صاحب نے ایک کتاب دکھاتے ہوئے کہا: ''دیکھیے سرِ ورق کتنا خوب صورت ہے''مَیں نے ان کا جملہ درست کرتے ہوئے کہا کہ ہاں کتاب کا سرورق بہت خوب صورت ہے۔ انھوں نے دوبارہ کہا: ''ہاں یہی تو مَیں کہہ رہا ہوں کہ سرِ ورق بہت خوب صورت ہے''۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں اپنی زبان دانی پر بڑا زعم تھا اور وہ سب کو تقریباً جاہل سمجھتے تھے۔ اگر مَیں کھل کے ان کی غلطی کی نشاندہی کر دیتا تو آپ اندازہ لگا لیجیے ان کا کیا حال ہوتا۔ واضح رہے کہ اس واقعے سے مجھے اپنی علمیت جتانا مقصود نہیں ہے بلکہ ایک صورتِ حال کی نشاندہی کرنا ہے۔

اب آپ معنی پر ذرا غور کیجیے: اضافتِ نسبتی کی حالت میں سرِ ورق کا مطلب ہوتا ہے ورق کا سر، یعنی اوپری سرا جہاں عام طور پر کچھ لوگ بسم اللہ لکھتے ہیں یا جہاں سے عبارت شروع کی جاتی ہے۔ جب کہ یہی اضافتِ مقلوب کی صورت میں سرورق ہو جاتا ہے جس کے معنی ہوتے ہیں سر کا ورق یعنی کتاب کا اوپری ورق جسے ٹائٹل کہا جاتا ہے اور یہ لفظ اسی معنی میں عام طور پر رائج ہے۔ ان معنوی باریکیوں پر عام طور سے نہ تو لوگ توجہ دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی نزاکتوں کو سمجھتے ہیں، بلکہ کتنے تو ایسے ملیں گے جو یہی نہیں جانتے کہ اضافتیں کتنی ہیں اور ان کا کام کیا ہے۔

خاں صاحب بمبئی کے نوجوان ادیبوں میں بہت مقبول تھے۔ وہ ان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ وہ جتنے دن بھی بمبئی میں رہتے ہم لوگ انھیں گھیرے رہتے۔ بس سب کی یہی کوشش رہتی کہ ان کے لیے کیا کچھ کرلیں۔ ایک مرتبہ انور خان نے خاں صاحب کی اپنے گھر دعوت رکھی اور اس میں مجھے بھی شامل کیا۔ خاں صاحب وہاں دیر تک انور خان کے بچوں سے باتیں کرتے رہے اور انھیں ہلکی پھلکی نصیحتیں بھی کیں۔ ان کی گفتگو کا انداز کچھ اتنا دلچسپ ہوتا کہ بچے بھی بہت جلد ان سے گھل مل جاتے۔ کھانے سے فارغ ہوکر جب ہم نکلے تو مَیں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خاں صاحب کو ایک روز میرے گھر چلنے کی دعوت دی، لیکن انھوں نے فوراً کہا: ''اس بار نہیں اگلی بار آؤں گا تو تمھارے گھر چلوں گا۔'' وہ سیدھی اور تصنع سے عاری باتیں کرتے تھے۔ اگلی بار جب وہ بمبئی آئے تو مَیں نے انھیں وعدہ یاد دلایا، وہ مسکرائے اور آنے کی ہامی بھرلی۔ اس کے بعد خاں صاحب جب بھی بمبئی آتے تو میرے اور انور خان کے گھر ایک بار ضرور تشریف لاتے تھے۔ شاید اوروں کے مقابلے میں وہ ہم دونوں کو زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ آخری وقتوں میں جب انھیں دل کا عارضہ لاحق ہوا تو انھوں نے اپنی معذوری بتا کے معذرت کرلی۔ انھیں بمبئی والوں کے ساتھ بمبئی سے بھی محبت تھی۔ انور قمر بھی ان کو بہت چاہتے تے تھے۔ ایک بار جب وہ علاج کی غرض سے بمبئی آئے تو انور قمر کے بے حد اصرار پر انھوں نے ان کے مکان پر قیام کیا۔ اپنی بیماری اور علاج کے سلسلے میں وہ ان دنوں کئی بار بمبئی آئے اور جب آتے تو اپنے ایک شاگرد بھوشن کے گھر ہفتوں قیام کرتے۔ اپنے علمی میدان میں وہ چاہے جتنے بے مروت رہے ہوں لیکن احباب سے محبت کرنے، بلکہ ان پر محبت لٹانے میں وہ بہت فراخ دل واقع ہوئے تھے۔ جب انھیں پیس میکر لگا تو انھوں نے بمبئی آنا کم کردیا۔ ان کی موت سے اردو زبان وادب کی دنیا کو ہی نقصان نہیں پہنچا بلکہ ہماری دنیا سے بھی بہت کچھ اُٹھ گیا۔

مَیں ان چند لوگوں میں سے ہوں جن سے خاں صاحب بہت محبت رکھتے تھے۔ میری نالائقیوں کے باوجود۔ وہ چاہتے تھے کہ مَیں کسی طرح ڈاکٹریٹ کرکے یونیورسٹی میں لگ جاؤں لیکن مَیں یہ کام نہیں کرپایا جس کی خاں صاحب کو ہمیشہ شکایت رہی۔ حالاں کہ مَیں نے خاں صاحب کے کہنے پر PhD کے لیے یونیورسٹی میں دوبار رجسٹریشن بھی کرایا تھا لیکن یہ کام ہو نہیں پایا اس کی دو وجوہات تھیں: ایک یہ کہ اپنے آس پاس ایسے لوگوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں لے کر زعمِ خود پرستی کا شکار دیکھا جو اردو کا ایک پیراگراف بھی صحیح نہیں لکھ سکتے تھے لیکن گفتگو کا انداز دھونس جمانے والا ہوتا کہ مَیں ڈاکٹر ہوں یا GRF holder ہوں اور طلبا اور دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس رویے نے ڈگری کی خواہش اور وقعت دونوں کو میری نظر میں پامال کردیا تھا۔ دوسری میری طبیعت کی

بے پرواہی اور کاہلی تھی۔ مجھے مطالعے کا شوق تو ہے لیکن لکھنے کے معاملے میں بہت کاہل ہوں۔ خاں صاحب کو اس بات کی بھی شکایت تھی کہ مَیں انھیں خط بہت کم لکھتا تھا۔ ایک بار غصے میں انھوں نے کہا تھا: ''تم عجیب آدمی ہو میرے خطوط کے جواب بھی نہیں دیتے، جب کہ لوگ میرے خط کے منتظر رہتے ہیں۔'' مجھے اعتراف ہے کہ مَیں اس معاملے میں اپنے تمام چاہنے والوں سے شرمندہ ہوں، لیکن اپنے مزاج کی اس کمزوری کو آج تک دور نہیں کر پایا۔ بہ ہرحال خاں صاحب اسی لیے اکثر فون کر کے میرا حال احوال پوچھتے اور میری بیوی اور بچوں سے باتیں کر لیتے تھے۔ میرے گھر میں سبھی ان سے مانوس ہو گئے تھے۔ انھوں نے میری بیوی کو اپنی بیٹی بنایا تھا۔ جب گھر آتے تو وہ اس سے اور بچوں سے ہی زیادہ باتیں کرتے۔

ایک بار کا واقعہ ہے کہ مہینے کی تنخواہ ہوئی اور بینک سے روپے نکال کے مَیں اپنی والدہ سے ملنے ناگدیوی اسٹریٹ جا رہا تھا کہ راستے میں کسی نے اس ماہرانہ فنکاری سے میرا پرس میرے ہاتھوں سے چھینا کہ مجھے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ پل بھر میں کیا ہو گیا۔ مَیں حیران و پریشان آس پاس اپنا پرس ڈھونڈتا رہ گیا اور وہ نہ ملا۔ مَیں پریشان اور دل گرفتہ گھر آیا اور بیوی کو احوال بتایا۔ اسی رات اتفاقاً خاں صاحب کا فون آیا۔ انھوں نے نہ جانے کیسے میرے لہجے سے اندازہ لگا لیا کہ کچھ ہوا ہے۔ جب انھوں نے اصرار کر کے پوچھا تو مَیں نے انھیں سارا واقعہ بتایا۔ سن کے انھیں بڑا افسوس ہوا اور انھوں نے کہا کہ مَیں اتنی دور ہوں کہ تمھارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ ان کے لہجے سے تأسف اور بے بسی صاف جھلک رہی تھی۔ بات مکمل کر کے مَیں نے فون رکھ دیا۔ دوسرے دن میرے دوست رفعت شمیم صاحب جو لندن میں رہتے ہیں اور جن کی پائیدھونی پر یونانی ادویات کی ایک دکان ہے۔ (ان کی ساری کتابیں مَیں نے ہی شائع کی تھیں) وہاں سے فون آیا کہ لندن سے آپ کے لیے دس ہزار روپے شمیم صاحب نے بھیجے ہیں آپ آ کے دکان سے لے لیجیے۔ مَیں نے سمجھا اپنی کسی اگلی کتاب کو چھپوانے کے لیے شاید پیشگی رقم بھیجی ہے، ساتھ ہی یہ جان کر خوش ہو گیا کہ اس پریشانی کے عالم میں غیب سے ایک مدد آ گئی ہے۔ دوسرے دن صبح کالج سے فارغ ہو کر سیدھا دکان پر پہنچا اور روپے وہاں سے لے لیے۔ اسی رات میں تقریباً نو بجے لندن سے شمیم صاحب ۔۔۔ انھوں نے چھوٹتے ہی پوچھا: ''بھئی تمھارا پرس کیسے گم ہو گیا؟'' مَیں یہ سن کر حیران ہو گیا کہ انھیں میرے پرس کے گم ہونے کی خبر کیسے لگی کیوں کہ مَیں نے تو کسی کو بتایا ہی نہیں تھا۔ میرے پوچھنے پر کہ انھیں اس بارے میں کیسے معلوم ہوا تو وہ بولے: ''کل شام میں مَیں نے خاں صاحب کا احوال جاننے کے لیے انھیں فون کیا تو انھوں نے بتایا کہ تمھارے ساتھ ایسا حادثہ پیش آ گیا۔ وہ تمھارے لیے بڑے

پریشان سے لگ رہے تھے تو مَیں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ کل الیاس کو مَیں پیسے بھجوادوں گا۔ اور مَیں نے دکان پر فون کر کے کہہ دیا تھا تو روپے تم نے دکان سے جا کر لیے یا نہیں؟'' مَیں نے بتایا کہ روپے مَیں لے آیا ہوں۔ اس واقعے سے آپ خاں صاحب کی محبت اور تعلقِ خاطر کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

خاں صاحب کی وضع داری اور محبت کے بے شمار قصے ہیں۔ ۱۹۹۵ء کا واقعہ ہے۔ ستمبر کا مہینہ تھا اور مَیں ریفریشر کورس کے لیے علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ میرے ایک دوست رفیق انصاری جو اپنی کاروباری ضرورتوں کے لیے ان دنوں دہلی جاتے رہتے تھے۔ اس دوران بھی ان کا دہلی جانے کا پروگرام تھا اس لیے واپسی کا پروگرام ایسے طے ہوا کہ دو دن دہلی میں رُک کر خاں صاحب سے ملاقات کر کے بمبئی کے لیے ہم روانہ ہوں گے۔ مَیں نے علی گڑھ سے روانگی سے پہلے ہی خاں صاحب کو خط لکھ کر اس کی اطلاع کر دی تھی کہ اتوار کی صبح دس بجے مَیں اپنے ایک دوست کے ساتھ ان سے ملنے گوَر ہال ان کے ہوسٹل پر پہنچوں گا۔ سنیچر کی شام میں مَیں علی گڑھ سے دہلی آیا اور پروگرام کے مطابق اس ہوٹل پر پہنچا جہاں ہمارے دوست قیام پذیر تھے۔ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر کمرے پر جب پہنچے تو وہاں صبح کا ایک اخبار رکھا تھا۔ اسے اٹھا کے یوں ہی سرسری نگاہ ڈالی تو ایک خبر نے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ دلی اردو اکادمی کا ایک دو روزہ سمینار تھا جس کا افتتاحی اجلاس سنیچر کو ہو چکا تھا اور اتوار کے پہلے اجلاس کی صدارت رشید حسن خاں صاحب فرمانے والے تھے۔ الجھن یہ تھی کہ ان سے ملاقات کے لیے کہاں جایا جائے۔ طے یہ ہوا کہ سمینار کا وقت حالاں کہ دس بجے ہے لیکن وہ گیارہ بجے سے پہلے تو شروع ہونے سے رہا اس لیے پہلے ہوسٹل چلتے ہیں اگر وہ سمینار کے لیے نکل چکے ہوں گے تو وہاں سے سیدھے اردو گھر چلے جائیں گے جہاں سمینار ہے۔ ہم لوگ تقریباً سوا دس بجے ہوسٹل پر پہنچے خاں صاحب کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ مَیں نے دھیرے سے آواز دی، اندر سے جواب میں خاں صاحب کی آواز آئی: ''آجایئے''۔ ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف ایک بستر لگا ہوا تھا اور اس کے بغل میں ایک میز تھی جس پر خاں صاحب کے چند قلم، سادے کاغذ کا ایک رِم، کچھ کتابیں، ایک ٹیبل لیمپ اور ایک طرف اخبار سے ڈھکی ہوئی دو ٹرے رکھی تھیں۔ خاں صاحب نے ہمارے بیٹھنے کے لیے شاید دو کرسیوں کا الگ سے انتظام کیا تھا کیوں کہ یہ کرسیاں اس کرسی سے الگ تھیں جن پر خاں صاحب بیٹھے تھے۔ چھت پر ایک پنکھا اور میز کے اوپر ایک ٹیوب لائٹ لگی ہوئی تھی۔ کمرہ غیر ضروری چیزوں سے خالی اور صاف ستھرا تھا اور اس میں کی ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی ان کے سادہ اور disciplined مزاج کی

نمائندگی کر رہی تھی۔

ہمارے معاشرے کا احوال تو یہ ہے کہ اگر کسی کو تھوڑی سی شہرت (چاہے جس طرح بھی) مل جائے تو پھر اس کے پیر زمین پر مشکل سے ٹکتے ہیں۔ زندگی کے طور طریقوں میں نمائش اور خودنمائی اس طرح شامل ہو جاتی ہے جیسے اس کے بغیر ان کی شخصیت مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ جب کہ خاں صاحب کی اتنی شہرت اور عزت کے باوجود زندگی سادگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی۔ وہ کسی یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ اسکالر نہیں تھے، درسِ نظامی سے ان کی تعلیم ہوئی تھی لیکن ان کی اسکالرشپ بے مثال تھی۔ تحقیقی کام کرنا ان کا جنون تھا اور اس کے لیے انھوں نے جو قربانی دی اس کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے۔ اپنے اس شوق کے لیے انھوں نے اپنے گھر بار اور بیوی بچوں سے بھی دوری اختیار کر لی تھی۔ کبھی کبھار دو چار مہینوں میں بچوں سے ملنے چند دنوں کے لیے شاہجہاں پور چلے جاتے تھے، بقیہ زندگی کے سارے دن ہوسٹل کے اسی کمرے میں کام کرتے ہوئے گزار دیے۔ اور ضروریاتِ زندگی کے نام پر جو چیزیں کمرے میں تھیں ان کا ذکر مَیں کر چکا ہوں۔ اس طرح سے مجردانہ زندگی گزارنا آسان نہیں، آدمی میں اکثر ایک طرح کا چڑچڑاپن پیدا ہو جاتا ہے یا وہ مردم بے زار ہو جاتا ہے جب کہ خاں صاحب کا معاملہ اس کے بالکل برعکس رہا۔ وہ ہمیشہ بڑی خوش دلی اور تپاک سے ملتے تھے۔ البتہ بہت کم لوگوں کو اپنے قریب آنے دیتے تھے۔

خاں صاحب نے اخبار ہٹا کے ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس میں سموسے اور مٹھائی رکھی ہوئی تھی۔ مَیں نے پوچھا: خاں صاحب آج تو اردو اکادمی کا سمینار ہے اور اس کے پہلے اجلاس کی صدارت میں آپ کا نام ہے تو آپ وہاں گئے نہیں؟'' انھوں نے جواب دیا: ''نہیں، مَیں نے کل ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ آج میرے یہاں کچھ مہمان آرہے ہیں اس لیے مَیں نہیں آسکوں گا۔'' یہ سن کر مَیں بتا نہیں سکتا کہ میرا سینہ احساسِ تفاخر سے کیسے بھر گیا۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ انھوں نے میری خاطر سمینار کے جلسے کی صدارت چھوڑ دی تھی۔ مَیں نے بتایا کہ ہم لوگ صبح سے کس طرح تذبذب میں تھے کہ آپ سے ملاقات کے لیے کہاں جائیں۔ انھوں نے کہا: ''بھئی، جب تم نے خط میں لکھ دیا تھا کہ تم اتوار کی صبح یہاں آؤ گے تو مَیں تمھارا انتظار کرتا، کہیں اور جانے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا''۔ مَیں نے اپنے دوست کا ان سے تعارف کرایا کہ یہ بھی آپ سے ملنے کے مشتاق تھے اور حالاں کہ کاروباری آدمی ہیں لیکن ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں اور ہلکی پھلکی شاعری بھی کر لیتے ہیں۔ خاں صاحب نے ہم لوگوں کے احوال پوچھے اور ساتھ ہی میرے دوست کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ان دنوں ان کی ''مثنوی گلزارِ نسیم'' شائع ہو چکی تھی اور شاید مثنویاتِ شوق پر وہ کام کر رہے تھے۔ ان کے

کام کرنے کا طریقہ کچھ ایسا تھا کہ جب تک تحقیقی نکتۂ نگاہ سے ہر پہلو اطمینان بخش نہ ہو خاں صاحب اپنا کام لوگوں کے سامنے نہیں لاتے اور اس میں برسوں بھی لگ جائیں تو کوئی قباحت نہیں۔ اسی لیے تحقیق اور تدوین کی دنیا میں خاں صاحب کا کام ایک مثالی اہمیت کا حامل ہے۔ بہت دیر تک انھیں موضوعات پر گفتگو چلتی رہی، وہ گفتگو کرتے وقت بڑی توجہ سے مقابل کی بات سنتے اور پھر اس کا جواب دیتے۔ ہم لوگ تقریباً ایک بجے وہاں سے اُٹھے تھے۔

خاں صاحب زندگی میں سادگی پسند تھے۔ ہمیشہ پینٹ اور ہاف یا فل آستین کا چیکس والا شرٹ پہنتے تھے جس کے بٹن اکثر اوپر گلے تک بند رہتے، لباس نہ ڈھیلا ڈھالا نہ بہت چست۔ ان کے چھریرے بدن پر یہ بہت جچتا تھا۔ ہمیشہ کلین شیو کتابی چہرہ دیکھنے میں عموماً شگفتہ سا نظر آتا سوائے ان مخصوص لمحوں کے جب وہ کسی فکر میں کھوئے ہوتے۔ بھرے ہوئے گالوں کے نیچے کلّے کی ہڈی ہلکی سی نمایاں نظر آتی جو پھیلی ہوئی ٹھوڑی سے مل گئی تھی۔ پتلے پتلے ہونٹ تھے جو بہت کم کھلتے تھے ورنہ ہونٹوں سے ہونٹ چپکے رہتے۔ جب مسکراتے تو وہی ہونٹ ذرا سا پھیل جاتے اور مسکراہٹ پورے چہرے سے پھوٹتی محسوس ہوتی۔ ستواں ناک کے اوپر عینک جمی رہتی جس کے پیچھے سے ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں صاف نظر آتیں۔ وہ جب مسکراتے تو ان کی آنکھیں بھی مسکراتی رہتیں جسے بہ آسانی محسوس کیا جاسکتا تھا۔ چوڑی پیشانی کے پیچھے سفید گھنے گھنگریالے بال بڑے سلیقے سے بنے ہوتے اور اُن کی شخصیت میں ایک رعب پیدا کرتے تھے۔ کرسی پر بیٹھتے تو سر قدرتی طور پر تھوڑا سا تنا ہوا محسوس ہوتا، لیکن جب کھڑے ہوتے یا چلتے تو ہلکا سا آگے کی طرف جھک جاتے تھے۔ شاید کرسی پر بیٹھ کر مسلسل کام کرنے کے سبب پیٹھ میں ہلکا سا خم پیدا ہو گیا تھا۔ تقریر کرتے وقت بار بار سیدھے ہاتھ کی کلمہ انگلی اٹھا کے اپنی بات میں زور پیدا کرتے۔ اتنی علمیت کے باوجود ان کی شخصیت میں ایک انکسار تھا۔ کھانا بھی بہت مرغن پسند نہیں کرتے تھے مگر اچھے کھانوں کے دلدادہ تھے اور کھانے کی تعریف میں اس کی خوبیوں پر بڑی معلومات افزا باتیں کرتے۔ ایک بار میری بیوی نے ان کے لیے گلاب جامن بنائی، کھاتے ہوئے انھوں نے اس سے پوچھا جانتی ہو گلاب جامن کی خوبی کیا ہے؟ شیرہ اس کے اندر تک یکساں پہنچا ہو۔ اکثر گلاب جامن میں اندر تک شیرہ نہیں پہنچتا اور وہ درمیان میں سخت رہ جاتا ہے۔ پھر اس سے طرح طرح کے کھانے کے موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ کس سے کس موضوع پر بات کی جانی چاہیے۔

مَیں جانتا تھا کہ وہ لکھنے کے لیے فاؤنٹن پین کا استعمال کرتے تھے اور ان کے پاس لکھتے وقت میز پر کئی قلم رکھے رہتے تھے۔ انھیں قیمتی قلم استعمال کرنے کا شوق تھا۔ ایک بار ان کا قلم شاید خراب

ہو گیا تھا تو انھوں نے مجھ سے ایک قلم خرید کے لانے کی فرمائش کی۔ مَیں ایک پارکر قلم لے کر ان کے پاس گیا۔ مجھے معلوم تھا وہ ان کا پسندیدہ برانڈ تھا۔ وہ قلم دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اس قلم کی قیمت پوچھی، مَیں نے قیمت نہ بتاتے ہوئے کہا کہ یہ میری طرف سے آپ کے لیے تحفہ ہے۔ انھوں نے قلم بند کر کے میز پر رکھ دیا اور مجھ سے کہا: ''یہ قلم آپ میری فرمائش پر لائے ہیں اس لیے یہ تحفہ نہیں ہو سکتا۔ تحفہ اپنی جانب سے اپنی مرضی اور خوشی سے دیا جاتا ہے کسی چیز کی فرمائش پر نہیں۔ یا تو آپ اس کی قیمت لیں یا اسے واپس لے جائیں''۔ مَیں نے لاکھ کوشش کی کہ خاں صاحب وہ قلم رکھ لیں لیکن وہ نہ مانے۔ قیمت چکانے کے بعد ہی اسے دوبارہ ہاتھ لگایا۔ یہ اصول پسندی ان کو بہت عزیز تھی۔

دراصل ان کے تحقیقی مزاج نے ان کی زندگی کو ایک غیر مشروط انداز میں نظم و ضبط کا پابند کر دیا تھا جس کی وجہ سے ان کے رویے میں بعض اوقات سختی کا احساس ہوتا تھا۔ خاص طور سے زبان و قواعد اور املا کے موقف میں ان کا رویہ سخت تھا۔ ایک بار ان کے کمرے میں مَیں بیٹھا تھا اور املے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ خاں صاحب کا اصرار تھا کہ قواعد کی رو سے پتا، پتا، پتّا اور پٹا صرف الف سے ہی لکھنا چاہیے کیوں کہ یہ سب ہندی الاصل الفاظ ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی ہائے مختفی سے لکھنا درست نہیں ہے اور ہندی میں ہائے مختفی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ ان کی بات درست تھی لیکن مَیں نے کہا کہ ہماری زبان میں مستثنیات کی گنجائش موجود ہے، کئی الفاظ ہیں جو استثنائی صورتوں کے ساتھ رائج ہیں۔ چوں کہ اردو میں اعراب لگانے کا رواج عام نہیں ہے اس لیے اگر ان میں سے دو الفاظ الف سے اور دو الفاظ ہائے مختفی سے لکھے جائیں تو لکھنے اور پڑھنے والے، دونوں کے لیے آسانی ہو جائے گی۔ ویسے بھی پتہ اور پتہ عام طور پر ہائے مختفی سے ہی رائج ہیں۔ اکثریت اسی املے کی اتباع کرتی ہے اگر قواعد میں اسے شامل کر لیا جائے تو ایک بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن خاں صاحب نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس گنجائش سے انکار کر دیا۔ اس میں ان کی خاں صاحبی کی بھی جھلک تھی۔ حالاں کہ باوجود خاں صاحب کے انکار کے مَیں آج بھی اپنے اسی موقف پر قائم ہوں۔ اس طرح کی کئی باتیں ہیں جن سے ان کے مزاج کی سختی اور انضباط کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنی ساری ترتیب و تدوین شدہ کتابوں کی تصحیح انھوں نے ہمیشہ خود کی تھی تا کہ الفاظ کے املا میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہو لیکن غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع شدہ 'دیوانِ غالب' جس کی ترتیب و تصحیح خود خاں صاحب نے کی تھی، حیرانی کی بات یہ ہے کہ اس میں املا کی کئی غلطیاں رہ گئیں۔ مثلاً صفحہ نمبر ۸۵ پر

ہو غم ہی جاں گداز، تو غمخوار کیا کریں   یا   عشق کا، اس کو گماں، ہم بیزبانوں پر نہیں

خاں صاحب نون غنّہ کو ملا کر لکھنے کے قائل نہیں تھے اس لیے جانگداز کو ''جاں گداز'' لکھا جانا چاہیے تھا اسی طرح ''بے زبانوں'' کو بھی اس طرح لکھنا درست ہے 'غم خوار' بھی اس طرح لکھنا چاہیے تھا۔ اسی طرح کی کئی جگہوں پر اور بھی کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جو نہ جانے کس کی لاپرواہی کا نتیجہ ہیں۔ تاہم خاں صاحب اس الزام سے بری نہیں ہوسکتے۔ مَیں جانتا ہوں ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'' لیکن مؤدّبانہ عرض ہے کہ ان سے صرفِ نظر بھی بددیانتی ہوتی۔ اگر آج میں تھوڑا بہت اس ضمن میں کچھ جانتا ہوں تو یہ بھی خاں صاحب کا ہی فیضان ہے۔

بی اے میں مجھے خاں صاحب کی مرتب کی ہوئی کتاب دیوانِ دردؔ پڑھانے کے لیے ملی۔ خواجہ میر دردؔ، میرؔ کے معاصرین میں سے تھے۔ ایک دن مَیں دیوانِ درد کی ورق گردانی کر رہا تھا تو ایک قطعہ نظر آیا:

کنج کاوی جو کی سینے میں غمِ ہجراں نے — اس دفینے ستی اقسامِ جواہر نکلا
اشکِ تر، لختِ جگر، قطرۂ خوں، پارۂ دل — ایک سے ایک رقم آپ سے بہتر نکلا

(گلشنِ ہند از حیدر بخش حیدری)

خاں صاحب نے 'گلشنِ ہند' کے حوالے سے اسے نقل کیا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ قطعہ تو شاید میرؔ کا ہے اور میرا پڑھا ہوا ہے۔ مَیں نے کلیاتِ میر: مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی میں دیکھا تو وہ قطعہ متن اور مصرعوں کی معمولی سی تبدیلی کے ساتھ اس طرح درج تھا:

اشکِ تر، قطرۂ خوں، لختِ جگر، پارۂ دل — ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہہ کر نکلا
کنج کاوی جو کی سینے کی غمِ ہجراں نے — اس دفینے میں سے اقسامِ جواہر نکلا

(کلیاتِ میر، دیوانِ اول۔ ص: ۱۲۴۔)

خاں صاحب جب بمبئی آئے تو مَیں نے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ ان کی عظمت دیکھیے کہ وہ یہ جان کر بہت خوش ہوئے، انھوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور فوراً کہا کہ دیوان کے اگلے ایڈیشن کی اشاعت میں وہ اس غلطی کو درست کروادیں گے، لیکن افسوس موت نے انھیں یہ مہلت نہ دی کہ وہ تصحیح کروا پاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود حد درجہ احتیاط کے بعض جگہوں پر ان کے یہاں بھی اس طرح کی غلطیاں جگہ پا گئی ہیں۔

خاں صاحب زبان و قواعد، املا اور تحقیق کے آدمی تھے۔ ان موضوعات پر لکھنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام آدمی سے ایک خاص رجحان، ذہن اور مزاج کا تقاضہ کرتا ہے۔ ایک مخصوص نظم و ضبط کے ساتھ اس مزاج کی بنیاد خاص طور پر دو باتوں پر ہوتی ہے۔ ایک صبر اور دوسری تشکیک اور

خاں صاحب کے یہاں یہ دونوں باتیں موجود تھیں۔ وہ جب تک اپنی تحقیق سے مطمئن نہ ہو جاتے، کام کو عوام کے سامنے پیش نہ کرتے۔ اسی لیے ان کے ہم عمر معاصرین میں ان کا ایک رعب اور علمی دبدبہ تھا۔ بعضے ان سے حسد اور کد بھی رکھتے تھے کیوں کہ خاں صاحب ان کے کام اور تخلیقات پر بے لاگ اور مدلل گفتگو کرتے ہوئے ان کی خامیوں کی نشاندہی کرتے تھے اور اس میں کسی طرح کی رورعایت سے کام نہیں لیتے تھے۔ پاکستانی انجمن ترقی اردو سے شائع ہونے والی اردو لغت پر اتنا سخت تبصرہ کیا کہ حکومت کو اس لغت کو واپس لینا پڑا اور اس کے مرتب ابواللیث صدیقی پر تو سنا کہ دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اسی طرح جمیل الدین عالی کی تاریخِ ادبِ اردو پر بھی ان کے اعتراضات مدلل اور جامع تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی تحقیق و تدوین اور زبان و بیان کی خدمت کے لیے وقف کر دی تھی۔ اردو املا، زبان و قواعد، انشا اور تلفظ کے علاوہ تحقیق کے مسائل پر اور چند تنقیدی مضامین بھی جو انھوں نے لکھے وہ کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔ تحقیق و تدوین کی دنیا میں 'فسانۂ عجائب'، 'باغ و بہار'، 'گلزارِ نسیم'، 'سحرالبیان'، 'مثنویاتِ شوق'، 'انتخابِ ناسخ'، 'مصطلحاتِ ٹھگی'، 'کلاسیکی ادب کی فرہنگ' وغیرہ ان کا ایسا کام ہے جس نے خاں صاحب کی شخصیت کو ایک Legend کی حیثیت عطا کر دی ہے۔

خاں صاحب آخر دم تک اردو املا کمیٹی کے ممبر رہے اور اس ضمن میں کام بھی کرتے رہے۔ زبان و بیان اور املا کے ایک ایک موضوع اور نکتے پر خوب خوب گفتگو کی ہے۔ وہ کلیاتِ اقبال کی تدوین کا کام کر رہے تھے اور امراؤ جان ادا ناول کو بھی ترتیب دینا چاہتے تھے لیکن یہ دونوں کام ادھورے ہی رہ گئے۔ ایک پوری نسل ہے جس کو خاں صاحب کی کتابوں اور کام نے متاثر کیا تھا۔ اب تو خاں صاحب جیسے لوگ ڈھونڈے سے نظر نہیں آتے جن سے مل کے زندگی کے آداب سیکھنے کو ملیں، جو صحیح معنوں میں ایک تربیت گاہ تھے۔ افسوس اب ایسی شخصیات نہ رہیں اور نہ ہی ایسے لوگ ہیں جو اُن کی اس روایت کو آگے بڑھا سکیں۔

ساجد رشید

راکھ

مہلک بیماری اور سفاک موت مل کر بھی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکے.... جمال نے فرش پر رکھی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا، صرف چہرہ کھلا تھا۔

شمع کی گھنی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ یک ٹک اس کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پیالی اٹھا کر کوفی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی پلکیں بدستور جھکی رہیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' وہ میز پر تھوڑا جھک گیا۔ ''میں بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جمال نے شمع سے کل بھی یہی بات کہی تھی، لیکن شمع نے کوئی جواب نہیں دیا تھا صرف جھرجھری

لے کر رہ گئی تھی ۔ جمال کی اس خواہش کو سن کر وہ خوفزدہ ہو گئی تھی ۔ اُسے شادی کے اُس تصور ہی سے بخار سا ہو جاتا تھا جسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں ۔ بابا کو اگر پتہ چل گیا کہ میں ایک مسلمان لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو... سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی ۔

جمال سے اس کی ملاقات دو برس قبل فوٹو گرافی کے ایک ایکزی بیشن میں ہوئی تھی ، جسے تین امیچر فوٹو گرافرز نے مل کر ترتیب دیا تھا ۔ شمع کو ایک تصویر بے حد پسند آئی تھی جس کا عنوان تھا ''زندگی'' جس میں ایک سی گل کو سمندر کی بپھری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا ۔

شمع نے جب ایکزی بیشن کے ناظم سے اس فوٹو گرافر کے بارے میں پوچھا تو اس نے باریک فریم کا چشمہ لگائے ایک سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا '' جمال احمد'' ... اُس نے ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی ۔ وہ ایک عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا ۔ جمال کو ایک عمدہ تصویر پر مبارکباد دینے کا خیال ترک کر کے وہ جب گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگی تب اُس نے سوچا کہ یہ فنکار کی ناقدری ہوگی ۔ وہ لوٹ کر ایکزی بیشن ہال میں آ گئی تھی اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی جو اپنی سوتی ساری سلیولیس بلاوز اور ہینڈلوم کے جھولے کی وجہ سے کوئی آرٹ کرٹیک معلوم ہو رہی تھی ۔ اس عورت کے چلے جانے کے بعد شمع نے جمال کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے تصویر کی تعریف کی اور دوران گفتگو اُس نے بتا دیا تھا کہ وہ جے جے اسکول آف آرٹس میں انسٹرکٹر ہے اور ملازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے ۔ دوسرے روز جمال نے جے جے اسکول میں جا کر شمع کو وہی تصویر تحفے میں پیش کر دی تھی ۔ دونوں کی رسمی ملاقاتیں دوستی میں اور دوستی جلدی ہی محبت میں بدل گئی تھی ۔

''جمال اگر بتیاں کہاں ہیں؟'' جمال نے گردن گھما کر دیکھا اس کا فوٹو گرافر دوست منوج اُس سے مخاطب تھا ۔ جمال نے وال کیبنٹ کھول کر اگر بتی کا پیکٹ نکال کر منوج کو دیا ۔ منوج نے اگر بتیاں شیشے کے ایک گلاس میں ڈال کر شمع کے سرہانے سلگا کر رکھ دیں ۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو ۔ منوج نے جمال کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا ۔ '' کیا تم نے اپنے ڈیڈی کو خبر کر دی ہے؟''

جمال نے اثبات میں سر ہلایا ۔ '' اور شمع کے بابا کو؟''

جمال نے سر جھکا دیا ۔ شمع کے بابا کو اس نے دادر ہندو کالونی میں خود جا کر خبر دی تھی انہوں نے

شمع کی موت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی تھی اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

''شمع اور میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' جمال کے اس جملے پر شمع کے بابا کا چہرہ ایک دم سے سُرخ ہو گیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے جنیئو میں انگوٹھا ڈال کر اسے دو بار اوپر نیچے کیا اور پھر موٹے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورتے ہوئے بولے تھے۔ ''تم جانتے ہو ہم لوگ پونیری برہمن ہیں میرے پتاجی پونے میں اس عمر میں بھی جنم لگن اور مرتیو کی رسمیں کرتے ہیں۔ اور تم ایک مانساہاری مسلمان!''
جمال اس سوال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اس نے فوراً کہا ''میں دھرم بدل لوں گا۔'' جمال کے اس جواب نے کچن میں ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں سن رہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا تھا۔
''کوئی بھی غیر ہندو، ہندو نہیں بن سکتا۔'' بابا اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کی انگلیاں جینئو میں تیزی سے اوپر نیچے ہونے لگیں۔
''اور اگر میں آریہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟''
''نہیں۔ کبھی نہیں۔'' بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''کون کس دھرم میں پیدا ہوگا یہ ایشور کی اچھا سے ہوتا ہے انسان کی مرضی سے نہیں سمجھے۔''
''تب تو میرے مسلمان ہونے میں بھی میری مرضی کا نہیں بھگوان کی اِچھا کا دخل ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔'' جمال نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی دلیل رکھی۔
''میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔'' اُن کا لہجہ دُرشت ہو گیا تھا۔
دورانِ گفتگو شمع کی ماں نے جمال کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھجوایا تو بابا نے بڑی ملائمت سے لڑکی سے کہا۔ ''شیشے کے گلاس میں پانی لاؤ''۔ جمال پانی پیے بغیر ہی اٹھ کر چلا آیا تھا۔ دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ ''وہ کہہ رہے تھے میری بیٹی اگر کسی مہار (چمار) کے ساتھ بھی بھاگ جائے تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا ایک ملیچھ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوگا۔'' کہتے ہوئے شمع رو پڑی تھی۔ ''میں تمہیں نہیں کھونا چاہتی تھی جمی۔'' ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلنے لگے تھے۔
اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ کچھ دیر تک تو خاموشی سے

اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں پھر کہا۔ ''اگر وہ مسلمان ہوجاتی ہے تو میرے خیال میں تمہارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔'' جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا لیکن مذہب تبدیل کرنے کی تجویز اس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک روز جہانگیر آرٹ گیلری کے ساور ریسٹورنٹ میں جمال نے شمع سے اسنیکس کے لیے پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے وہ صرف لیمو پانی لے گی... جمال نے کوفی ختم کر لی لیکن وہ اپنا منشا بیان نہ کر سکا۔ شمع نے ٹھنڈے لیمو پانی کے گلاس پر ابھر آنے والے ابخرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے بابا تمہارے ہندو ہوجانے کے بعد بھی تمہیں سویکار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔'' کہہ کر اُس نے کچھ توقف کیا اور پھر فیصلہ کُن انداز میں کہا، ''میں ہی مسلمان ہوجاتی ہوں۔''

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شمع اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کر لے گی۔ اُس نے غور سے شمع کے چہرے کو دیکھا۔ جذبات سے لرزاں چہرے پر اُس کی آنکھیں لبالب بھر آئی تھیں...

شمع نے ایک روز خاموشی سے بدن کے کپڑوں کے ساتھ گھر اور مذہب دونوں چھوڑ دیا۔ جامع مسجد میں کلمہ پڑھ کر وہ شما کلکرنی سے شمع جمال ہوگئی۔ مسجد ہی میں جمال اور شمع کا نکاح ہوا تھا۔ نکاح میں شمع کی طرف سے صرف منوج ہی شریک ہوا تھا جب کہ جمال کے گھر کے تقریباً سارے ہی لوگ موجود تھے۔

جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے مردہ جسم کو دیکھتے ہی ایک دبی دبی چیخ ماری اور جمال سے لپٹ کر رونے لگیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں گاڑھا دھواں بھر گیا ہو۔

''یہ کیسے ہوگیا جمال....'' وہ روتی جاتی تھیں اور کہتیں جاتی تھیں۔

''خدا کو یہی منظور تھا باجی....''

بڑی بہن نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے اپنی والدہ اور والد کے بابت دریافت کیا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے؟ پھر اس نے مراٹھی ترجمہ والے قرآن کو کپ بورڈ سے اتارا اور شمع کے قریب بیٹھ کر دھیمی آواز میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع عربی تو نہیں پڑھ سکی تھی البتہ وہ کبھی کبھار قرآن کا مراٹھی ترجمہ ضرور پڑھ لیا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان لنتاس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں سینئر فوٹو گرافر کا جاب مل گیا تھا۔ ایجنسی

نے ہی اسے بوریولی میں سنگل روم کا ایک فلیٹ بھی الاٹ کر دیا تھا۔ جو میاں بیوی کے لئے کافی تھا وہ اس فلیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا، لیکن ہفتے کے روز دونوں محمد علی روڈ پر واقع جمال کے والد کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے بابا نہ سہی آئی (ماں) نے تو اس کی غلطی کو معاف کر دیا ہو گا وہ جمال کو بتائے بغیر اسکول سے فارغ ہو کر دادر ہندو کالونی پہنچ گئی۔ وہ دروازے پر کھڑی بیل بجاتی رہی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا شاید آئی ہول سے اسے دیکھ لینے کے بعد ایسا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی اس نے ماں کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا۔

شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان کے روزے اس نے پہلی بار رکھے منگل وار کے برت کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا وہ کھانا نہیں کھاتی۔ اس نے یہ عادت اپنی آئی سے پائی تھی آئی کہا کرتی تھی، پتی پرمیشور ہوتا ہے اس سے پہلے کھانا کھانا نہیں چاہئیے جمال نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان کے یہاں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے اسے وقت پر کھا لینا چاہئیے لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو اس میں پہلے جیسی کشش نہیں رہ جاتی ہے لیکن شادی کے بعد دونوں کی محبت میں نہ صرف شدت آگئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بے جان جسم کے قریب ہی باجی اور کچھ دوسری رشتے دار عورتیں اور بچیاں قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ابو اور امی بھی پہنچ گئے تھے۔ امی تو شاید راستے بھر روتی رہی تھیں ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں انہوں نے آتے ہی جمال کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا جیسے وہ اس کے سینے کا سارا درد اپنے کلیجے میں اتار لینا چاہتی ہوں۔ تب بھی اس کی آنکھیں خشک رہیں۔

''بیٹے غسالہ کو میں نے خبر کر دی ہے وہ بس آتی ہی ہو گی۔'' انہوں نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ابو دروازے کے قریب سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے درمیان اپنی بہو کی ملنساری اور گھڑ پن کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ''رمضان کے مہینے میں بہو نے سارے روزے رکھے اور پانچوں وقت نماز ادا کی کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غیر قوم سے آئی ہے۔'' میت میں آنے والے بھی مرحومہ کی انہیں صفات پر تعریفی کلمات ادا کر رہے تھے۔

گزشتہ ایک مہینے سے شمع کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی ڈاکٹر نے یرقان تشخیص کیا تھا اور یہ بھی تنبیہہ کر دی تھی کہ بیماری کے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں کیوں کہ شمع حاملہ تھی۔ جمال نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہو گی ورنہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر خود ہی اس کی

نگہداشت کرتا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کو منگل وار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔ دو تین روز قبل شمع کو دن میں چار پانچ قے ہوئی تو وہ روہانسی ہوگئی اس نے جمال سے کہا ''دیوالی میں اپنے بابا اور آئی کا آشیرواد لینے نہیں گئی تھی نا شاید اس کا پاپ ہے۔'' جمال نے اس بات پر اسے محبت بھری ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہو کر اس طرح کے وہم رکھتی ہے اس نے کہا تھا ''وہم ہے یا حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پنر جنم میں میرا وشواش ضرور ہے میری اوپر والے سے یہی پراتھنا ہے کہ دوسرے جنم میں بھی وہ مجھے تمہاری ہی پتنی بنائے۔'' اس جملے پر جمال نے بے اختیار اس کی زرد پیشانی کو چوم لیا تھا۔

کل رات چانک ہی شمع کی طبیعت بگڑ گئی ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے دوائیں اور انجیکشن دے کر اس خدشے کا اظہار ضرور کر دیا تھا کہ یرقان اپنے آخری اسٹیج پر ہے اس لیے شمع کو کل سویرے ہی کسی اچھے اسپتال میں داخل کروانا بہت ضروری ہے۔ جمال نے آنکھوں میں ہی ساری رات کاٹ دی۔ انجیکشن کی وجہ سے شمع گہری نیند ضرور سوئی لیکن صبح جاگنے کے بعد اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال بری طرح نروس ہو گیا تھا اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بجھ گئی تھی۔

''بیٹے تمام لوگ آچکے ہیں۔ غسالہ نے میت کو غسل بھی دے دیا ہے۔'' ابو جمال کو قریب بلا کر بولے ''تدفین کب کرنی ہے۔ مغرب بعد یا عشاء بعد؟''

انہیں جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دیدار کے لیے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ اب اور نکھر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اٹھ کر کہے گی ''ارے مجھے جگایا کیوں نہیں۔'' اکثر چھٹی کے روز جمال پہلے اٹھ جاتا تو خود ہی چائے بنا کر پی لیتا ناشتہ شمع کے بیدار ہونے پر دونوں ساتھ ہی میں کرتے تھے۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اس لیے تکلف ہوتا تھا کہ وہ ہفتے کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی تھی جمال کو دفتر بھیجنے اور اسکول جانے کی تیاری میں اسے کافی وقت لگتا تھا اس لیے عام دنوں میں صبح سویرے اٹھنا اس کی مجبوری تھی۔

''مہرہ صاحب نے کہا ہے کہ ایجنسی کی طرف سے شمع کی ایک Obituary ٹائمز آف انڈیا میں دی جائے۔''

منوج نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالی۔

شمع جمال

تاریخ پیدائش۔ ۱۸/اپریل بروز بدھ ۱۹۶۸ء

تاریخ وفات۔ ۲ جون بروز منگل ۱۹۹۵ء

جمال کی نظر تاریخ وفات پر ٹھہر گئی۔ اوہ آج منگل وار ہے۔ شمع کے برات کا دن! شمع نے اسے بتلایا تھا کہ ''میں نے جب ہوش سنبھالا ہے تب سے منگل وار کا برت رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا۔'' اس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ شمع کی آواز بازگشت دیر تک جمال کی سماعت میں جاری رہی۔

''جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی؟'' ابو جی نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا سرہانے اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ دھویں کی پتلی گاڑھی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں اماں اور باجی کی تلاوت کی آواز ماحول کو مزید سوگوار بنا رہی تھی۔

''شمع کو قبرستان نہیں شمسان لے جانا ہے۔''

''ہیں!!'' جمال کے اس جواب پر ابو بہت زور سے چونکے اور اُن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے جو فرط جذبات سے لرز رہا تھا پھر انہوں نے شمع کی لاش کو غور سے دیکھا اور غصے سے لرزتی آواز میں پوچھا ''کیا یہ مرحومہ کی اپنی خواہش تھی۔''

''نہیں شمع کے اور میرے درمیان کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی اور پھر اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

''دیکھو میاں وہ مسلمان ہو چکی تھی اس نے کلمہ پڑھا تھا وہ...'' ابو دانتوں کو بھینچ کر سخت لیکن دبی ہوئی آواز میں بولے۔

''شمع نے میرے مذہب سے متاثر ہو کر اپنا مذہب نہیں بدلا تھا۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے اُس نے مذہب تبدیل کرنے کی رسم ادا کی تھی۔'' جمال نے شمع کے زرد چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ابو کی آواز غصے سے بلند ہوگئی کمرے اور راہداری میں موجود تمام لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ میں اُس کی آتما کو سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔'' جمال نے رُک رُک کر مضبوط لہجے میں کہا۔

''آتما!'' ابو نے دانتوں کو کچکچا کر کہا۔ ''کیا مردہ جسم کو جلانے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے

گا؟'' ان کا لہجہ اتنا ہی تیز اور تلخ تھا امی اور باجی کلام مجید رحل پر بند کر کے باپ بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

''ابو ذرا سوچیے تو شمع نے میرے لیے مذہب بدل دیا تو میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا؟''

امی اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کر سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا ''شمع کی آتما کو داہ سنسکار سے ہی سکون ملے گا۔''

اس جواب پر ابو اپنے غصے کو برداشت نہ کر سکے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے سیڑھیوں سے دھم دھم کرتے ہوئے اتر گئے۔ باجی کچھ لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہیں پھر شمع کے بے جان چہرے پر ایک نظر ڈال کر برقعہ پہنتے ہوئے وہ بھی چلی گئیں۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار اور شناسا اپنی خشمگیں نگاہوں کی حدت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف اگربتیوں کا دھواں تھا جو اذیت ناک خاموشی کے ساتھ پست گر گریہ کر رہا تھا۔

منوج کی دستک پر دروازہ کھلا۔ سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے ان کے پیچھے آئی منہ میں بلو دیئے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گی۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انہوں نے منوج کے پیچھے کھڑے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا ہوا تھا، بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بیٹی کو لوٹانے آیا ہوں۔''

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور جمال کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔

■■
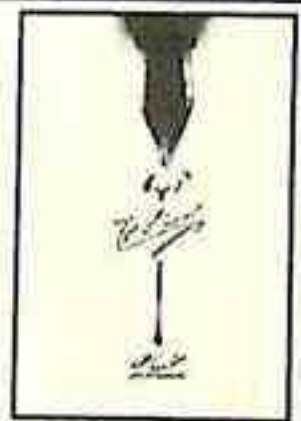
غضنفر اقبال

راکھ۔ جستجو کیا ہے؟

ساجدہ رشید کے افسانے حقیقت پسندی پر قائم ہوا کرتے تھے۔ اِن کے افسانے 'راکھ' میں بھی حقیقت نگاری کا عمل مشترکہ کلچر کے روپ میں نمایاں ہوا ہے۔ راکھ میں ہندو لڑکی اور مسلم لڑکے کی محبت جواں ہوئی ہے۔ یہ محبت شادی میں تبدیل ہو جاتی ہے مگر افسانے کی ہیروئن شمع یرقان کے عارضے سے فوت ہوتی ہے۔ اس کی تدفین کرنے کے بجائے اِس کا داہ سنسکار افسانے کے ہیرو جمال احمد کے اصرار پر کر دیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار اس افسانے میں بلالحاظ رنگ و نسل کے ذریعے انسان دوستی اور وفا جوئی کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ افسانہ اپنی معنوی تہہ داری سے متوازی خطوط میں سفر کرتا ہے۔ شمع کلکرنی اور جمال احمد کی ملاقات ایک فوٹو گرافی کی نمائش میں ہوتی ہے۔ جمال احمد ایک فوٹو گرافر ہے اور اُس کی نمائش میں لگائی تصویر جس کا عنوان 'زندگی' ہے۔ اُس تصویر میں ایک سی گل کو سمندر کی بحری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔ شمع کو یہ تصویر بہت پسند آتی ہے۔ جمال احمد یہ تصویر شمع کو تحفے میں پیش کرتا ہے۔ دونوں کی محبت زندگی والی تصویر سے زندگی نو بنانے کا اشارہ کرتی ہے اور وہ دو سے ایک ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ زندگی راست نہیں آتی اور شمع جمال کا ساتھ ادھورا چھوڑ کر دنیا سے منہ موڑ لیتی ہے۔ افسانہ نگار نے زیر بحث تحریر سے معاشرتی طبقہ بندی کی خلیج پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ ہندو مذہب میں راکھ کی اہمیت نذر آتش کرنے کے بعد زیادہ اہم ہے۔ افسانے کا یہ اقتباس دیکھیے:

منوج کی دستک پر دروازہ کھلا۔ سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے ان کے پیچھے

آئی منہ میں پلو دیئے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گی۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انہوں نے منوج کے پیچھے کھڑے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا ہوا تھا، بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بیٹی کو لوٹانے آیا ہوں۔''

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور جمال کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔

افسانے کے محوالہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ ہیرو جمال نے ہیروئن شمع کی راکھ کو اس کے والدین کو لوٹا دیا جن سے ایک دن بغاوت کرتے ہوئے اُن سے چھین لیا تھا۔

راکھ بیانیہ تکنیک کی عمدہ مثال ہے۔ افسانے کا ہر موڑ، ہر عمل اور ہر رویہ افسانے کی اکائی سے منسلک ہے۔ افسانے میں انگریزی اور ہندی الفاظ کی مرصع کاری نے افسانے کے حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔ افسانے کی ترسیل میں پیچیدہ طرزِ اظہار نہیں ہے۔ افسانہ 'راکھ' کے جملے بے حد دھاردار اور تخلیقی ہو گئے ہیں۔

- ''اُسے شادی کے اُس تصور ہی سے بخار سا ہو جاتا تھا جسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں۔''
- ''دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو۔''
- ''جمال کی آنکھیں خشک تھیں اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں گاڑھا دھواں بھر گیا ہو۔''

مسطور بالا کے جملوں کی طرح افسانے کی تخلیقی ماہیت کی فضا آفرینی پورے کے پورے افسانے میں پھیلی ہوئی ہے۔ راکھ کی زبان و بیان میں زیریں لہر کے طور پر درد کی جوالا بھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس سے افسانے میں تہہ داری اور معنویت اُبھرا کرتی ہے۔ افسانے کا کلائمکس گہرا تعلق خلق کرتا ہے۔ یہ افسانہ مکمل طور پر ایک دلچسپ قصے پر انحصار کرتا ہے۔ اس قصہ پن تجسس خیزی سے مملو ہے۔ افسانے کی داخلی رَو جامع اور مربوط ہے۔ افسانہ نگار نے قومی یک جہتی کے ایزل پر مصورانہ عمل بڑے ہی موثر انداز میں کیا ہے۔ افسانہ جمہوری فن ہے۔ جمہور سے یہ افسانہ اُٹھا ہے اور اس راکھ میں شعلہ بھی ہے اور چنگاری بھی۔

افسانہ 'راکھ' میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کا ایک مخاطبہ جاری ہے۔ افسانے کے بین السطور

میں وسیع المشربی، اتفاق واتحاد کی لہریں موجزن ہیں، جس سے فکری، تہذیبی اور نئی سطح پر قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی، ایکتا اور اکھنڈتا کی صالح تصویر منقش ہوتی ہے۔ جو نسلی امتیاز، پھوٹ اور منافرت کی آگ پھیلانے والوں کے لیے تازیانہ کا کام کرتی ہے۔ کثرت میں وحدت صد رنگی میں یک رنگی کی ہم نوائی کی سعی کرتی ہے۔ افسانہ نگار نے نفرت، بربریت اور انسانیت سوزی سے دور افسانے میں ایک بات زور دے کر کہی ہے وہ دائم اور انمٹ محبت ہے۔ محبت کے ہزار رنگ ہیں وہ افسانہ 'راکھ' میں نمایاں تر ہیں۔

تبصرے

تبصرے کے لیے برائے کرم کتابیں نہ بھجوائیں، ہم اپنی ترجیحات پر کتابیں منتخب کرتے ہیں۔ (ادارہ)

خاموش شاعر کی چمکتی چنگاریاں

یعقوب راہی۔ فکروفن

☆ مرتبین: رام پنڈت، محمد اسلم پرویز، وقار قادری ☆ مبصر: علی احمد فاطمی
صفحات: ۵۰۰، قیمت: ۴۰۰ روپیے، ناشر: آئیڈیل فاؤنڈیشن ممبئی۔

یعقوب راہی ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں۔ ان کی دوستی و رفاقت اور عمدہ گرما گرم صحبت میں ایک مدت گزری ہے۔ جب بھی ممبئی جانا ہوا، ساجد رشید، سلام بن رزاق، انور قمر، وقار قادری، الیاس شوقی وغیرہ کی صحت میں جو بھی لمحے گزرتے یعقوب راہی برابر سے شریک رہے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ۔ ان بھیگی بھیگی گلابی محفلوں میں ساجد رشید جتنے بے بک اور بے لگام ہوتے، یعقوب راہی اتنے ہی خاموش اور گمبھیر۔ سراپا سنجیدہ لیکن جب بولتے تو سراپا احتجاج و انقلاب بن جاتے۔ میں خود ترقی پسند ادیب ہوں۔ بزرگ ترقی پسند ادیبوں، شاعروں کے ساتھ اک عمر گذاری ہے، اُن سے بہت کچھ سیکھا بھی اور ان سے اختلاف بھی کیا ہے کہ اکثر مزاحمت و احتجاج جوشِ اظہار میں ظاہری اور خارجی ہو جایا کرتا ہے جو اوپر اوپر کے شور وغل میں اپنی معنویت اور دردمندی کھو بیٹھتا ہے اسی لیے وہ کم از کم ہندوستانی تہذیب و ادب میں کامیاب کم ناکام زیادہ رہا۔ نیک نام کم اور بدنام زیادہ ہوا یا کیا گیا۔ غالباً اسی لیے انحراف و احتجاج میں ڈوبے ہوئے شاعر باقر مہدی نے ایک سوال قائم کیا، کیا احتجاجی آواز کو شاعری میں ڈھالا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اردو کی نرم و نازک، تلطف و تلذذ میں ڈوبی عشقیہ شاعری کے تعلق سے بہرحال اپنی اہمیت تو رکھتا ہی ہے۔ حالانکہ ولی اور میر کے ساتھ ساتھ جعفر زٹلی سے لے کر خود باقر مہدی اور یعقوب راہی تک ہمارے پاس مزاحمت، احتجاجی و انقلابی شاعری کا گراں قدر سرمایہ ہے لیکن ہم نے اس طرح نگاہ ڈالی ہی نہیں یا اردو کی معیار پرست و تفتیش پسند عشقیہ شاعری نے ادھر نگاہ ڈالنے ہی نہ دی۔ پھر جب باقر مہدی جیسے انحرافی شاعر بھی یہ کہہ دیں کہ: "جوش اور ترقی پسند شاعروں احتجاجی شاعری کو صحافت کے معیار سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔" تو اس میں اس نوع کی شاعری کی نامناسب تنقید تو ہے ہی خود صحافت کی بھی تذلیل و توہین ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ کسی طرح مناسب نہیں جس کا شکار خود باقر کی شاعری ہو جائے لیکن باقر مہدی کے اس جملے پر غور کیا جا سکتا ہے۔ "اچھی شاعری صحیح نظریے کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات سے پوری طرح واقفیت کے بغیر ممکن نہیں۔" اور یہ بات بالکل درست ہے لیکن یہ بات بھی درست اور غور طلب ہے کہ ہر مزاج و مذاق کی شاعری کے فنی لوازمات ایک جیسے تو نہیں ہو سکتے۔ احتجاجی شاعری ہو یا عوامی شاعری، رثائی شاعری ہو یا قومی شاعری، ان تمام قسموں کی شاعری کو عشقیہ شاعری کے اوزان اور معیار پر تو تولا نہیں جا سکتا۔ عشقیہ شاعری میں جہاں سرگوشی، دھیما پن پسند کیا جاتا ہے وہیں احتجاجی شاعری میں بلند آہنگی ہی اس کا خاص وصف ہوتا ہے۔ فریاد کی شاعری اور للکار کی شاعری کے تیور، آہنگ اور اسلوب میں فرق تو ہوگا۔ بظاہر اس مقام پر یہ غیر ضروری بحث اس لیے ضروری ہے کہ یعقوب راہی بنیادی طور پر مزاحمت اور احتجاج کے شاعر ہیں اور انھوں نے اس دور میں اس نوع کی شاعری خلق کی جب جدیدیت کا پُر شور

دور تھا اور ترقی پسند شاعری کو بالعموم اور احتجاجی شاعری کو بالخصوص مذموم و معتوب نگاہوں سے دیکھا جارہا تھا۔ یہ راہی کا اپنا اعتماد اور نظریہ تھا کہ اس دور میں بھی انھوں نے اپنے آپ کو اپنے فریضۂ شاعری اور نظریہ زندگی سے الگ نہیں کیا۔ یہ ہم نے احباب کی محفلوں میں دیکھا اور ان کی انحرافی شاعری بھی سنی تھی تو باقر مہدی جیسا بے باک شاعر اور نقاد بھی راہی کی شاعری کو پسند کرتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا پچی روشنائی میں اعتراف و اظہار بھی کرتا ہے۔ انھوں نے بعض ایسے اشعار اور نظموں کے ٹکڑے بھی پیش کیے ہیں جو انھیں پسند ہیں اور جو عام طور پر پسند کیے جانے کے لائق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صرف باقر مہدی ہی نہیں عزیز قیسی، محمد حسن، فضیل جعفری سے لے کر سلام بن رزاق، عبدالاحد ساز، الیاس شوقی، وقار قادری، اسلم پرویز بھی ان کی شاعری کے معترف ہیں۔

میں یہاں راہی کی شاعری پر گفتگو نہیں کروں گا اس لیے کہ وہ میرے ہم نظر دوست ہیں۔ ان پر گفتگو کرنا اپنے منھ میاں مٹھو بننا جیسا ہے۔ مجھے تو ممبئی کے ان احباب کا شکریہ ادا کرنا ہے جن میں رام پنڈت، اسلم پرویز، وقار قادری خاص ہیں جنھوں نے اعتراف کا سلسلہ چلا رکھا ہے اور واقعی معقول، خاموش اور سنجیدہ فنکاروں، شاعروں کی یادگار خدمات کا اعتراف کیا اور ندا فاضلی کے یعقوب راہی کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ پانچ سو صفحات میں اس کا طرح طرح سے اظہار بھی کیا۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ یہ اظہار راہی کی پچھترویں سالگرہ پر ہوا۔ کاش کہ اس اظہار میں میں بھی برابر سے شریک ہوتا تاہم جزوی طور پر سہی ان دوستوں کے ساتھ برابر سے کھڑا ہوں اور اپنے اس ذاتی و نظریاتی دوست بہ یہ خلوص و محبت پیش کرتا ہوں اور مرتبین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں۔

یعقوب راہی اصلاً شاعر ہیں نظم کے شاعر زیادہ، غزل کے بھی لیکن بنیادی طور پر ترقی پسند مفکر و دانشور۔ ان عناصر کا اظہار عموماً نظموں میں تو ہوتا ہے۔ غزلوں میں قدرے مشکل ہوا کرتی ہے اور یہ مشکل فیض، مجروح، جذبی وغیرہ کے ساتھ بھی تھی لیکن جب انھوں نے یہ آگ کا دریا پار کرلیا اور ایک مشکل آسان کردی تو راہی کے سامنے کچھ کامیاب مثالیں تو تھیں۔ مثالیں ہزار ہوں لیکن آگ کا تو آگ ہے اور دریا بھی دریا۔ اچھی یا بری بات یہ بھی ہو چکی تھی کہ جدیدیوں نے جدیدیت کے فیشن میں ڈوب کر اس کی ہیئت، لباس اور بدن کے ساتھ جو سلوک کیا اس سے قدرے آزادی تو ملی اور کچھ برہنگی بھی۔ پتہ نہیں اس بدسلوکی اور بے حرمتی کا فائدہ راہی نے کس قدر اٹھایا لیکن بادل النظر میں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ احترام غزل اور آداب شاعری سے زیادہ دور نہیں گئے۔ وہ با بھی نہیں سکتے تھے کہ لمحاتی فیشن سے ہٹ کر ان کی منزل کچھ اور تھی اور وہ راہی کچھ اور سفر کے تھے۔ میں مثالیں پیش کر کے تبصرے کو مضمون نہیں بناؤں گا۔ ان کی ان خوبیوں کا ذکر کروں گا، جو انھوں نے شاعری سے ہٹ کر کیں۔ ترجمے کیے، مضامین لکھے، مراٹھی شاعری، دلت شاعری اور سب سے بڑھ کر باقر مہدی پر لکھنا پڑھنا آگ کے شعلوں پر بیٹھنے کے مترادف تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے کام ہیں۔ بس کام ہی کام۔ پوری زندگی کام میں اور کلام میں صرف ہوئی اور ہو رہی ہے۔ دلچسپ بات ہے کہ کام پھیلے ہوئے ہیں لیکن کلام اختصار پسندی کے حصار میں ہے۔ یہ بھی ان کا اپنا منفرد رنگ اور انداز ہے۔ کس قدر سلیقے سے کہتے ہیں۔

یہ کس جمود پسندی کا ایک حصہ ہیں
نہ انتشار کا باعث نہ کوئی خطر میں

سیدھے سادے اس رستے کو دائیں بائیں موڑا جائے
تم بھی چپ اور میں بھی گم سم آگے رستہ سیدھا ہے

شاعری میں خاکساری بھی ہوا کرتی ہے لیکن اسی خاک سے چنگاری بھی پھوٹتی ہے جو مشعل بن کر انسانی ذہن کو روشن کر جاتی ہے۔ اعتراف کا یہ خصوصی راہی نمبر کیا صرف دوستانہ اظہار ہے۔ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اس روشنی کا اظہار ہے جسے راہی نے گذشتہ چار پانچ دہائیوں سے اپنے خون جگر سے پالا پوسا ہے، پرورش کی ہے۔ خاموش احتجاج میں جو تاثر ہوا کرتی ہے وہ چیخ و پکار میں نہیں (یہ الگ بات ہے کہ اقتدار گونگا بہرا اور ظالم ہو تو کبھی کبھی چیخنا بھی پڑتا ہے) شاید یہی وجہ

ہے کہ فیض ہر طبقۂ فکر میں پسند کیے گئے اور جوش ایک خاص حلقے میں لیکن اس سے جوش کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔
خصوصی شمارہ کیا ہاتھ لگا، ہتھیلیوں میں کئی دہائیاں روشن ہو گئیں۔ کئی چہرے چمک اُٹھے، ساجد رشید کی بے معنی لیکن بے حد تخلیقی گالیاں۔ سلام بن رزاق کی کبھی نہ ختم ہونے والی جوانیاں، انور خاں کی سانولی معاونی بدگمانیاں، وقار قادری کی کوئی خدمت گزاریاں، الیاس شوقی کی بمبئی میں رہتے ہوئے بنارس کی گلابی دھاریاں اور یعقوب راہی کی خاموش شاعری کی چمکتی چنگاریاں۔ ہائے کیا دن تھے۔ گلابی میں ڈوبے ہوئے ساجد کی طرح چہکتے ہوئے یہ نمبر پایا ہاتھ لگا، فکر و خیال، ماضی و حال کی ایک دنیا روشن ہو گئی۔ راہی تم ہزار پچھتر کے ہو جاؤ، دادا نانا بن جاؤ لیکن تمھاری شاعری کبھی ضعیف نہ ہوگی، اس لیے کہ اس میں انسان کے خون کی حرارت ہے۔ زندگی کی تمازت ہے اور زندگی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔
''جاوداں پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی'' یعقوب تمھیں سلام عقیدت۔ وقار، اسلم، رام تمھیں سلام محبت۔

'مرگ انبوہ' کی 'جانی' اور 'انجانی' دنیا!

مرگ انبوہ (ناول)

☆ مصنف: مشرف عالم ذوقی ☆ مبصر: شکیل رشید

صفحات: ۴۴۰، قیمت: ۵۰۰ روپیے، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔

'مرگ انبوہ' کی 'دنیا' جانی' سی ہی مگر 'انجانی' ہے۔ خوف سے بھری ہوئی۔ خوف 'جانتے' ہوئے کا بھی اور 'انجانے' کا بھی۔ خوف 'آج' کا بھی اور آنے والے 'کل' کا بھی۔ خوف گہرا اور کسی مافوق الفطرت وجود کے تجسیم کے خوف سے بھی کہیں زیادہ، جسم کے رگ و ریشے میں سرایت کرنے والا۔ ایک الگ طرح کا خوف۔ ایک 'جانی' ہوئی دنیا کے 'انجانی' دنیا میں ڈھلنے کا خوف۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول 'مرگ انبوہ' پڑھتے ہوئے جب قاری آخر کے چند صفحات تک پہنچتا ہے تو ایک طرح کی بے یقینی اسے گھیر لیتی ہے۔ شدید ترین اندیشے اس کی سانسیں اکھاڑنے لگتے ہیں اور اچانک معدوم ہونے کے احساس سے اس پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ بات کپکپا دینے والی ہے بھی! اگر کوئی 'جادوگر' آپ سے، مجھ سے یا کسی سے یہ کہے کہ 'طے کر لیں کب جان دینی ہے؟' تو لرزہ تو طاری ہوگا ہی! اور یہ 'جادوگر' ذوقی کے ناول کا وہ کردار ہے جو 'غائب' رہتے ہوئے بھی ہر جگہ 'حاضر' نظر آتا ہے اور یہ ہر جگہ کی 'حاضری' اسے 'مرگ انبوہ' کا ایک انتہائی قابل نفریں کردار بنا دیتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہی وہ 'جادوگر' ہے جو ان کی 'جانی' اور 'پہچانی' دنیا کو ایک 'انجانی' دنیا میں ڈھال رہا ہے، مگر یہ جانتے ہوئے بھی اس کا 'سحر' انہیں جکڑے ہوئے ہے۔ بات یوں سمجھ میں نہیں آئے گی، 'جادوگر' کا مکمل تعارف 'مرگ انبوہ' کو ورق ورق الٹے پلٹے بغیر ممکن نہیں ہے۔ میں جب اپنے اطراف میں نظر دوڑاتا ہوں تو وہی دنیا نظر آتی ہے کہ جسے بچپن سے دیکھتا رہا ہوں، کیا کوئی تبدیلی آئی ہے، کچھ بدلاؤ؟ شاید نہیں۔ لیکن سچ یہ ہے کہ تبدیلی آئی ہے، بدلاؤ ہوا ہے۔ پاشا مرزا جیسے لوگ تبدیلی دیکھ نہیں پا رہے ہیں۔ پاشا مرزا کے والد جہانگیر مرزا کو یہ 'جانی' اور 'پہچانی' دنیا بتدریج ایک 'انجانی' دنیا میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ انہیں اس کا سبب بھی معلوم ہے، یہ 'جادوگر' کے اس 'سحر' کا ہی تو نتیجہ ہے جو سب کو جکڑے ہوئے ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول آج کے تناظر میں ہے، ویسے ان کا ہر ناول آج ہی کے تناظر میں ہوتا ہے، یہ بات انہیں دوسرے، بہت سارے ناول نگاروں سے ممتاز کرتی ہے۔ لیکن یہ امتیاز ضروری نہیں ہے کہ سب کیلئے پسندیدہ ہو۔ بہت سارے ہیں جو آج کے تناظر سے آنکھیں بند رکھنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں، جیسے کہ آج کے مسلمان،

سب نہ بھی پڑا کثر۔ مرگ انبوہ' آج کا ناول اس لیے ہے کہ اس میں ہم ایک تبدیل ہوتے ہوئے بھارت کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ لنچنگ اور شہریت ترمیمی قانون تو بس ایک بہانہ ہے، نسلوں کا صفایا اصل نشانہ ہے۔ پاشا مرزا کو یہ احساس نہیں ہے۔ وہ آج کی اس نسل کا نوجوان ہے جس کی اکثریت اپنے والدین سے شاکی رہتی ہے۔ ایک ایسا نوجوان جسے جہانگیر مرزا سے شکایت ہے کہ کیوں وہ دوسرے والدین کی طرح اسے عیش و عشرت سے نہیں پال سکتے! پاشا مرزا کا کردار ناول کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ آج کے نوجوانوں کا کردار ہے۔ سیکس، چیٹ اور بلیو ویل کا شوق، اخلاق سے عاری، ڈرگز اور پیزا کے رسیا! جنہیں کتابوں سے بھری الماریاں کوڑا کرکٹ لگتی ہیں، جو اپنے والدین سے نفرت وہ بھی شدید ترین نفرت کے اظہار کو معیوب نہیں سمجھتے۔ پاشا مرزا 'ینگستان' کے ان کرداروں میں سے ایک کردار ہے جو انٹرنیٹ کے چور دروازے سے مستقبل کو فتح کرنا چاہتے ہیں۔ جو ایک ہی جھٹکے میں اسٹیو جابس اور مارک زکر برگ بننے کا سپنا سجائے ہوئے ہیں۔ جو 'گلوبل گاؤں' میں رہتے ہیں اور یوزرس جنریٹیڈ کنٹنٹ' کا ایک حصہ ہیں۔ انہیں تیزی کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی دنیا نظر نہیں آتی لیکن جہانگیر پاشا جیسوں کو، جو دنیا کے بدلنے کا ادراک رکھتے ہیں، ان نوجوانوں کی 'بے خطر آتش نمرود میں کود پڑنے کی ادا' بھاتی تھی۔ انہیں یہ اندازہ تھا کہ یہ 'مستقبل' ہیں 'سنہرا مستقبل'۔ اور وہ اس سنہرے مستقبل کو بچانے کیلئے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ 'بی مشن' سے سمجھوتہ بھی۔ لیکن یہ سمجھوتہ اچانک تو نہیں تھا۔ جہانگیر پاشا تو ایک ادیب تھے، سچ اور حق لکھنے والے۔ انہیں شدت سے یہ احساس تھا کہ "پاشا کو دینے کیلئے کبھی میرے پاس زیادہ کچھ نہیں رہا۔ کبھی کبھی تو اسکول یا کالج میں اس کی فیس بھرنے کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ اس نے موٹر سائیکل کی ڈیمانڈ کی تھی، میں اس کی یہ خواہش بھی پوری نہیں کر سکا۔ وہ انتہائی خوبصورت نوجوان تھا۔ اور اس کی فکر یہ تھی کہ اس کا مستقبل کیا اور کیسا ہوگا، وہ آگے کیا کرے گا؟ ایک ماڈرن نوجوان دیکھتے ہی دیکھتے کمرے میں بند ہو گیا۔ بی مشن آنے کے بعد ملک میں نوکریاں ختم ہو گئی تھیں۔ کروڑوں بے روزگار ہو گئے تھے۔ کسان خودکشی پر آمادہ تھا۔ بے روزگار نوجوان نسل بی مشن سے وابستہ ہو کر اسلحوں سے کھیل رہی تھی۔" یہ بی مشن، سب کچھ نگل رہا تھا، اور ان کے گھروں میں دیواروں پر سُرخ چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں، جو زد پر تھے، جیسے کہ سبحان علی۔ جو یہ سمجھ چکے تھے کہ انہیں بھی "ان کی ہندوستانیت اور راشٹرواد کا حصہ بننا پڑے گا" مگر پرچم لہراتے ہوئے جنہیں 'ہجومی تشدد' نے کھا لیا اور جن کی بیٹی سمیرا غائب کر دی گئی۔ بی مشن کی شروعات ہو چکی ہے۔ اور ہندوستان غائب ہو رہا ہے۔ ذوقی اس غائب ہوتے ہوئے ہندوستان کی داستان سنا رہے ہیں، جہاں 'شعبدہ' ایک بڑی حقیقت ہے۔ یہ بیف، کو 'مٹن' میں تبدیل کر دیتا ہے اور آگے بڑھ کر اس نے فوج، عدالت، خفیہ ایجنسی سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ کیا ہم نے جج صاحبان کو بابری مسجد کی ملکیت کے مقدمے کا فیصلہ کرتے نہیں دیکھا! کیا سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس رنجن گوگوئی کو راجیہ سبھا کا رکن ہوتے نہیں دیکھا! اور کیا دلی فسادات کے دوران پولیس کی جانبداری کسی کو نظر نہیں آئی! یہ بی مشن ہمارے لیے نامانوس نہیں ہے، یہ زعفرانی سیاسی پارٹی ہی کی طرح تو ہے۔ بی جے پی کی طرح جو معاشی، سماجی، تہذیبی، اقتصادی تمام ناکامیوں کے باوجود جیت کیلئے اقلیت کا بہانہ رکھتی ہے۔ ذوقی کا یہ کہنا کیا غلط ہے "ہزار برسوں کی تاریخ میں مخصوص اقلیت کو لٹیرا کہنے والے آسانی سے فیصلے لے آئیں گے کہ اقلیتوں کی زمین کیسی؟ محمد بن قاسم سے غزنوی، غوری، خلجی اور مغل بادشاہ تک سارے لٹیرے تھے۔ لوٹ کی زمین کو اقلیتوں کا حق نہیں کہا جا سکتا۔ اس وقت بی مشن کا ہر نمائندہ، میڈیا مسلسل اقلیتوں کی مخالفت کر رہا تھا۔ ہمارے پاس جواب دینے کیلئے کیا ہے؟ ہم تسلیم کر لیں کہ بی مشن میں مسلمانوں کو جلاوطن کیا جا چکا ہے۔ ہم ایک ایسے وائرس کا شکار ہو چکے ہیں، جو ہمارا نام صفحۂ ہندوستان سے مٹا دینا چاہتا ہے۔" یہ جملے تو آج کے ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ لیکن ذوقی کا ناول آج کے ہندوستان کے ساتھ آنے والے تبدیل ہو چکے ہندوستان کی تصویر بھی دکھاتا ہے۔ جہانگیر پاشا کو بی

مشن' میں شمولیت بھی احساس تحفظ نہیں دیتا۔ایک ایک کر کے سب ہی فنا ہو رہے ہیں، کامریڈ بھی بدل رہے ہیں اور بی مشن کا ووٹ بینک بڑھ رہا ہے۔اور" جادوگر مسکرا رہا تھا۔روشنی کے دائرے میں اس کا ہاتھ چمکا۔
تاریکی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہوش اڑ گئے یہ اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی تھی۔روشنی کے دائرے میں اس کی ہتھیلی سے سرخ خون نکل رہا تھا۔سرخ خون کی لہریں اسٹیج سے ہو کر اب آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔پھر ایک آواز آئی، جاتے جاتے اپنی جیبوں کی تلاشی لیجئے، آپ گھڑی پہنتے ہیں تو وقت دیکھ لیجئے، عورتوں کے گلے میں زیور ہو تو وہ پہلے اطمینان کر لیں کہ یہ زیور اب بھی موجود ہیں یا نہیں۔تلاشی لی گئی اور جیسا کہ جادوگر نے کہا تھا، کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔سونے اور چاندی کے زیورات گم تھے، یہاں تک کہ ہاتھوں کی انگوٹھیاں بھی غائب تھیں۔جیب میں پڑے چھوٹے بڑے روپے اور سکے غائب تھے۔تماشہ یہ کہ ان سب کی نظروں کے سامنے جادوگر ہال سے باہر آیا، اس وقت اس کے بدن پر کافی مہنگا لباس تھا، وہ مہنگی گاڑی میں بیٹھا اور اڑن چھو ہو گیا۔" اس کے بعد" ہیبت اور خوف میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔اب سب مل کر قومی ترانہ گا رہے تھے۔"
ذوقی نے ایک ہیبت ناک دنیا خلق کی ہے۔اس دنیا کا وہ منظر، جو یقیناً آج یا کل سامنے آئے گا، انتہائی ہولناک ہے۔جس میں 'جادوگر' کہہ رہا ہے۔"اس وقت ہماری آبادی ایک بڑے طوفان کی زد میں ہے۔بڑھتی ہوئی آبادی اور اکثریتی طبقے کی خوشحالی۔بیمار لوگوں کو مرنا ہوگا۔اس پورے نظام کی خوشحالی ان کی موت پر منحصر ہے۔ملک اتنی بڑی آبادی کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ہم نے بہت سوچ کر حسین موت کا انتخاب کیا ہے۔خوشحال اکھنڈ بھارت کیلئے، جئے ہند"۔اور یہ حسین موت کیا ہے، وہ فارم جسے آپ کو اور مجھے اور تمہیں، سب کو اپنے ہاتھوں سے پُر کرنا ہے اور پُر کرتے ہوئے اپنی موت کا وقت متعین کرنا ہے۔"راکیش ویدنے فارم ہوا میں لہرایا، رحمتوں اور برکتوں والے جادوگر کیلئے اس کی درازیِ عمر کیلئے دعا کیجئے اس کی لافانی محبتوں کا قرض ادا کیجئے۔اس نے آپ کی قوم کو دس برس دیئے ہیں۔دس برس میں آپ نہیں ہوں گے اور آپ کو اس کی رحمدلی پر بھروسہ کرنا چاہیے، آپ مسلسل پریشان تھے، اذیتوں میں گرفتار تھے اور آسان موت۔اور ہاں، اس برس میں ۴۰ برس سے لے کر ۱۰ برس کا کوٹہ فل ہو چکا ہے۔آپ کے پاس ۱۳ برس ہیں۔"
کیا یہ سُننا کہ زندگی کے صرف تین برس ہی آپ جی سکتے ہیں، خوشگوار ہے؟ اور جب یہ کہا جائے کہ وہ 'لخت جگر' جو ابھی ۲۰ برس کا ہی ہوا ہے صرف اور تین سال جی سکے گا تب کیسی ہیبت طاری ہوگی اور جب باپ سے بیٹے کے مرنے کی گیارنٹی مانگی جائے تو کس بے بسی کا سامنا ہوگا!! مگر موت کے فرمان پر دستخط کرنا ہی پڑتے ہیں۔کیا موت کے یہ فرمان، یہ فارم، این پی آر، این آر سی اور سی اے اے کے ہی فارم نہیں ہیں؟ یہ سوال ذہن میں اٹھتا ہے اور اس سوال کے ساتھ موت کے فرمان پر دستخط کرنے والے صفحات پڑھنے والے کے سارے وجود پر لرزہ طاری کر دیتے ہیں۔یہ تو 'مرگ انبوہ' ہے، ہولوکاسٹ، نسل کشی، قتل عام، تطہیر۔ان ہیبت ناک لفظوں کو سوچ سوچ کر مجھ پر بھی لرزہ طاری ہوا تھا لیکن ذوقی مایوس نہیں ہیں۔ان کے یہ الفاظ جو جہانگیر مرزا سے کہلوائے گئے ہیں، آپ کے لیے بھی ہیں، میرے لیے بھی، تمہارے اور سب کیلئے "میری طرح زندگی سے شکست تسلیم مت کرنا۔تم میرے بہادر بیٹے ہو۔اچھا میرے بیٹے الوداع"۔ذوقی کے یہ الفاظ بھی حوصلہ دیتے ہیں "ایک اندھیرا تمہیں گم کرتا ہے ایک اجالا ہمیں زندگی دے جاتا ہے۔"
مشرف عالم ذوقی کا یہ ناول ہمیں، ماضی، مستقبل اور حال کی آگاہی دینے کے ساتھ جو کچھ بھی پیش آسکتا ہے اس سے باخبر کرتا ہے۔یہ آج کے ہندوستان کا ناول ہے، ساتھ ہی ساتھ تبدیل ہوتے ہوئے ہندوستان کا بھی۔ذوقی کے ناول کی ہیئت، بنت، تکنیک اس ناول کے تھیم اور موضوع کے عین مطابق ہے۔منظر کشی مایوس کن، باہر نکلنے کے راستے بظاہر مسدود مگر ریمنڈ سے کہا ہوا نج کا یہ جملہ مایوسی کو امید میں بدلتا ہے" آپ لوگ کبھی بی مشن کو کامیاب نہیں ہونے دیں

گے۔'' اور آج ہمارے لیے بے شمار ریمنڈ کھڑے ہیں، بے شمار شاہین باغ وجود میں آگئے ہیں۔ پاشا مرزا بھی ایک امید بن کر ابھرتا ہے، اسے والد سے نفرت ہے لیکن والد کی ڈائری پڑھنے کے بعد وہ کہتا ہے ''مجھے ڈیڈ پر پیار آرہا ہے''۔ کیوں؟ اس لیے کہ پاشا مرزا جان گیا ہے کہ اس کے والد نے خود کو نیند کے حوالے نہیں کیا بلکہ وہ نیند کے حوالے ہونے سے خود کو بچاتے رہے۔ پاشا مرزا کی زبانی ''مجھے ڈیڈ پر پیار آرہا ہے'' کہلوا کر ذوقی نے آپ کو، مجھے، تمہیں، سب کو یہ سبق دیا ہے کہ سرنگوں ہونے سے بہتر لڑتے لڑتے گم ہو جانا ہے، لہٰذا تیار رہے، لڑنے کیلئے اور بچانے کیلئے، ذوقی کے ناول کا یہی سبق ہے اور یہ بہت ہی اہم سبق ہے۔

دہشت، محبت اور حوصلے کی شاعری

شب آویز (شعری مجموعہ)

☆ شاعر: قمر صدیقی ☆ مبصر: شکیل رشید

صفحات: ۱۱۲، قیمت: ۱۰۰ روپے، ناشر: اردو چینل پبلی کیشنز، ممبئی۔

قمر صدیقی کئی دنیاؤں میں جیتے ہیں! یہاں 'جیتے ہیں' سے مراد ان کی تخلیقی بوقلمونی، تخلیق کے الگ الگ دھاروں پر ان کا بہتے چلے جانا ہے۔ یہ دھارے مختلف رنگ اور آہنگ لیے ہوئے ہیں۔ لیکن بظاہر الگ الگ رنگ اور آہنگ کے یہ دھارے ایک ہی منبع سے پھوٹے ہیں اس لیے یہ بباطن ایک ہی ہیں۔ آسان لفظوں میں کہیں تو یہ کہ قمر صدیقی کی دنیاؤں کا منبع ایک ہی ہے، ایک ایسی کائنات جس میں ان کی تمام دنیائیں سمائی ہیں۔ اور یہ کائنات ان کی شاعری ہے۔ اسے ان کی شعری کائنات بھی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے 'شب آویز' کی پہلی قرآت سے فوری احساس یہ ہوا کہ ان کی شاعری ان کے دیگر کاموں سے کتنی مختلف، کتنی الگ رنگ اور آہنگ کی ہے۔ مگر قرآت مکرر سے، پہلے والے احساس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی پوری شدت سے ابھر آیا کہ قمر صدیقی کی اس شعری کائنات کی پرچھائیاں تو ان کے دوسرے کاموں پر پڑ رہی ہیں۔ سب کا رنگ اور آہنگ ایک ہی ہے۔ اصل تو یہی ہے، باقی سب اس کا پرتو ہیں۔ قمر صدیقی ایک استاذ ہیں، مدیر ہیں، ایک نثر نگار ہیں۔ استاذ کی حیثیت سے اردو ادب کی قدیم وجدید روایات پر بھی نظر رکھتے ہیں اور جدید ترین عالمی ادبی رویوں پر بھی۔ قدیم اور جدید ادبی رویوں اور روایات کے امتزاج سے انہوں نے اپنے ادبی رویے کی آبیاری کی ہے اور ایسا کرتے ہوئے انہوں نے نہ آنکھیں موند کر پرانی قدروں کی تقلید کی ہے اور نہ ہی سوچے سمجھے بغیر جدید عالمی ادبی رویوں کا دامن تھاما یا چھوڑا ہے۔ قمر صدیقی نے مذکورہ ادبی رویوں کی تمام نہ سہی بیشتر مثبت قدریں اپنے ادبی رویے میں ضم کر لی ہیں اسی لیے ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر لوگ اس کشمکش میں پڑ سکتے ہیں کہ وہ جو پڑھ رہے ہیں اسے کیا سمجھیں، قدیم کہ جدید؟ یہ سوال ان کی نثر پڑھ کر مزید شدت سے سامنے آتا ہے کیونکہ چاہے وہ تنقید کر رہے ہوں کہ تحقیق یا کسی اور نثری صنف میں لکھ رہے ہوں، بدلتے ہوئے سماج، گلوبلائزیشن، نئی دنیا، صارفیت اور نئے عالمی نظام کے حوالے سے اپنی بات سامنے رکھتے ہیں۔

تمہید کچھ طویل ہو گئی ہے لیکن یہ طوالت یہ بتانے کے لیے ضروری تھی کہ قمر صدیقی کا ہر رنگ، ہر آہنگ کا ایک ہی منبع ہے۔ سب کا اصل ان کی شعری کائنات ہے۔ قمر صدیقی کا مجموعہ کلام 'شب آویز' جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے پہلی قرآت میں مختلف، نئے رنگ اور نئے آہنگ کا لگا، بالکل اپنے نام کی طرح، لیکن دوسری قرآت میں اس کی مزید پرتیں کھلیں اور شاعر کی لفظیات، تشبیہات، استعارات نے اس دنیا کی سیر کرائی جہاں نئے رنگ اور نئے آہنگ کے ساتھ ساتھ قدیم اور

جدید کا وہ امتزاج نظر آتا ہے جو قمر صدیقی کی شاعری کے ڈکشن (طرزِ کلام) کو دوسروں سے منفرد کرتا ہے۔ خیال کو خلوص کے ساتھ شعر میں ڈھالنے کا جذبہ اور اس جذبے کی شدت سے پھوٹنے والی امیجری اور امیجری کو جیتے جاگتے شعر میں تبدیل کرنے میں کامیابی، اور اس کے نتیجے میں قلم سے کاغذ پر اترنے والا سبک، رواں اور پر اثر کلام جو سیدھے جا کر دل سے ٹکراتا ہے۔ قمر صدیقی کے کلام کا دل سے ٹکرانا یا بالفاظ دیگر کلام کا دل پر اثر کرنا ہی ان کی شعری کائنات کی انفرادیت کا ثبوت ہے کہ دل ہی سارے جذبات کا مرکز ہے۔ وہ شاعری جو دماغ سے سمجھی جاتی ہو، چیستاں ہوتی ہے، معمہ۔ دل جس پر دھڑک اٹھے شاعری اسی کو کہتے ہیں۔ دل سے ٹکرانے والے چند اشعار ملاحظہ کریں:

کیا کیا چہرے ہیں آنکھوں میں شکلیں کیا کیا ذہن میں ہیں
یادیں گویا البم ہیں اور البم میں تصویر بہت

ہر ایک موڑ پہ میں پوچھتا ہوں اس کا پتہ
ہر ایک شخص یہ کہتا ہے بس وہاں آگے

یہ اور ایسے ہی متعدد اشعار ہیں جن کی سادگی اور بے ساختہ پن اور زبان کا خوبصورت استعمال، انہیں دوہرانے یا بار بار کے پڑھنے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ اشعار اپنے اندر نئے رنگ اور نئے آہنگ کے ساتھ قدیم روایات کو سموئے ہوئے ہیں۔ رشتوں کی شکست و ریخت کے لیے کھنڈر کی نادر تشبیہ ہمارے سامنے ایک ایسی تصویر کھینچتی ہے جس میں ہمیں اپنے پرائے نظر آنے لگتے ہیں اور شاعر کا ذاتی تجربہ اپنا یعنی اجتماعی تجربہ لگنے لگتا ہے۔ اور پکار سننے کی امید باندھنا ہمارے سامنے شاعر کا وہ چہرہ لے آتا ہے جس پر بیتے ہوئے، پر مسرت دنوں کو پھر سے جینے کی حسرت صاف نظر آتی ہے اور ہم اپنے چہروں کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ کیا ہم میں، شکست و ریخت کے بعد، شاعر کی طرح کوئی امید بچی ہے! شاعر کے ذاتی تجربات ہمارے اپنے، اجتماعی تجربات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور پھر یہ شاعری نئے رنگ اور نئے آہنگ کے باوجود پرائی نہیں لگتی، اجتماعی لگتی ہے۔ مذکورہ تمام اشعار دل کو لگتے ہیں، اس لیے کہ ان میں ہمیں اپنے چہرے نظر آتے ہیں۔ قمر صدیقی 'عرضِ شاعر' کے تحت لکھتے ہیں: "آج ہم تغیر و تبدل کے سیلاب میں بہے جا رہے ہیں۔ جنس اور عشق، حیات اور موت، انسان اور کائنات، فرد اور سماج کے بدلتے رشتوں کے درمیان انسان روحانی زندگی سے عاری جدید سماج کا ایسا مہاجر بن گیا ہے، جس کی جڑیں نہیں ہیں۔ اب ہم بھیڑ یا ہجوم سے الگ نہیں رہ سکتے لہٰذا تنہائی کی لذت کے بجائے تنہائی کی دہشت میں جی رہے ہیں۔ ادب خصوصاً شاعری دراصل تنہائی کی لذت اور تنہائی کی دہشت کے درمیان توازن قائم کرتی ہے، میں نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے تنہائی کی اس دہشت اور لذت کے درمیان توازن قائم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔"

یہ جو دہشت اور لذت کے درمیان کے توازن کی بات ہے وہی قمر صدیقی کا حقیقی ادبی رویہ ہے۔ وہ جذبات میں بہتے نہیں ہیں، اور سماج کی بدصورت تصاویر دکھاتے ہوئے بھی اعتدال قائم رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ وہ آئینہ دکھاتے ہوئے داغ اور دھبوں کو مدھم کر دیتے ہیں۔ دیکھیں آج کی سچائیاں انہوں نے کس خوبی سے اپنے شعروں میں سمو لی ہیں:

کیا ملک کی حالت ہے مصروف سیاست ہے
آنگن میں ہمارے پھر دیوار اٹھانے میں

ایک یہ تاریخ ہے پڑھتے ہیں جس کو آج ہم
ایک الگ تاریخ بھی ہے رام کے بابر کے بیچ

تنہائی کی دہشت اور تنہائی کی لذت قمر صدیقی کے شعری کائنات کے اہم موضوع ہیں۔ نواحِ جاں، سائبان، بدن، زندگی، حیات وغیرہ ان کی پسندیدہ لفظیات ہیں۔ ان موضوعات اور لفظیات کے گرد قمر صدیقی کی شاعری گردش کرتی ہے لیکن انہیں برتتے ہوئے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے شاعر مایوس ہو چکا ہے، یاس اور بے بسی نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ شاید اسی احساس کے سبب کچھ لوگوں کو قمر صدیقی کی شاعری یاس اور غم کی شاعری لگتی ہے۔ مثلاً ان اشعار کو

ملاحظہ کریں:

ہر ایک لمحہ میں قید سوچوں نفس نفس بس مہار دیکھوں — میں اپنے اندر کبھی جو جھانکوں حصار اندر حصار دیکھوں

چار جانب سرسراتے رینگتے سانپوں کا خوف — کس جگہ میں پاؤں رکھوں ہر طرف پھنکار ہے

لیکن ان اشعار کی بنیاد پر قمر صدیقی کی شاعری کو یاس اور غم کی شاعری قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ان کے کل شعری کائنات میں یاس کے لمحات بہت ہی مختصر ہیں، ہوا کی طرح سر سے آتے اور گزر جاتے ہیں، اور پھر جو شعر ان کے قلم سے نکلتے ہیں ان میں جد و جہد اور ٹکرانے کا، جینے کا اور آگے بڑھنے کا عزم ہوتا ہے۔ قمر صدیقی لفظوں کو نئے نئے ڈھنگ سے برتتے بھی ہیں اور کبھی کبھی لفظوں سے کھیلتے بھی ہیں، جیسے:

ہمارے خواب کوئی اور دیکھ لیتا ہے — ہماری آنکھ، خلا، انتظار، سناٹا

دشمن دشمن نیزہ نیزہ خنجر خنجر کیا — عشق کے آگے مات ہے سب کی لشکر وشکر کیا

مجموعہ کلام مختصر ہے، 112 صفحات پر مشتمل۔ شاعر کے اپنے الفاظ میں ''پچیس برسوں کے شعری سفر کا ایک سخت انتخاب، صرف 55 غزلیں۔ لیکن شاعری ایسی جو دل کو لگے۔ اس مجموعے میں دو حمد اور دو ہی نعت ہیں، خوبصورت، جیسے کہ ان کا حق ہے۔ اس مجموعے میں قمر صدیقی کی 12 نظمیں بھی شامل ہیں، آج کی نظمیں۔ ذاتی، ہماری اور دہشت کی نظمیں۔ پہلی نظم کا عنوان ہے 'ٹی وی کلچر کے نام'۔ یہ نظم خوبصورت انداز میں بتاتی ہے کہ ہم نے آنکھیں گروی رکھ کر، سوچ، فکر اور رشتوں کے زیور، گہنے اور مہر بیچ کر آنکھ کی مستی خریدی ہے اور اب ہمارا کچھ بھی نہیں ہے۔ نظم 'جیون کیا ہے'، میں آگ، ہوا، پانی اور مٹی کا فلسفہ یعنی زندگی کا فلسفہ ہے۔ نظم 'ورچوئل ریالیٹی' میں غیر حقیقی تبدیلی کی تصویر ہے۔ انجیر، تلسی، برگد اور پیپل ان چار نظموں کو ایک ہی سلسلے کی نظمیں کہا جا سکتا ہے۔ شاعر انجیر اور زیتون کو سبز ڈبوں میں بند رکھنے سے دکھی ہے، اسے گلہ ہے کہ اب تلسی کا پودا نظر نہیں آتا، پیپل اور برگد اپنی باتیں اور قصے نہیں بتاتے، نہیں سناتے کہ ان کے پاس ان کی اپنی کوئی ویب سائٹ نہیں ہے۔ انسان کیسی کیسی نعمتوں سے محروم ہو رہا ہے۔ نانی اور دادی کی وفات پر دو پر اثر نظمیں ہیں، ایک نظم 'عصر حاضر' کے عنوان سے ہے، آج کی نظم:

ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ دن کو رات کہیں / اجالے چھوڑ کر اب تیرگی کی بات کہیں / ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ سچ نہ بولیں اب / خموشی اوڑھ لیں اپنی زباں نہ کھولیں اب / ہمیں یہ حکم ہوا ہے کہ جس نے ظلم کیا / اسے پکاریں مسیحا و چارہ گر کہہ کے

یہ نظم جیسے جیسے آگے بڑھتی ہے تاثیر میں شدت آتی جاتی ہے، یہ ظالم کو نمرود، راون، انسانیت کا دشمن، فرعون اور قہر و بلا قرار دیتے ہوئے آگے بڑھتی ہے، اور اس کا انجام خوف سے نجات اور عزم و حوصلے پر ہوتا ہے، جس کی آج ہم سب کو ضرورت ہے۔

وہ ایک شخص کہ جس سے ہیں لوگ خوف زدہ / یہ خوف اور یہ دہشت، یہ حبس کا عالم / اٹھائیں جوش سے لبریز پھر سے نعرے ہم / جگائیں سوئے ہوئے حوصلوں کو سب کے ہم

اس مجموعے کا نام 'شب آویز' ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسے پرندے کا نام ہے، جو اپنے پنجے کے سہارے درخت سے لٹک جاتا ہے اور حق حق کہتا ہے، واللہ اعلم! اس مجموعے کو یہ نام کیوں دیا گیا، اس سوال کا جواب شاید یہ ہے کہ یہ مجموعہ کسی 'شب آویز' کی طرح حق کو، اس کے تمام رنگوں، سیاہ، سفید، زعفرانی سمیت اجاگر کرتا ہے، چھپاتا نہیں ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ قمر صدیقی نے یہ نام کسی اور معنیٰ میں استعمال کیا ہو، کوئی ایسا معنیٰ جو میری پہنچ سے دور ہو۔ آخری بات: مجموعہ کا سرورق جواں مرگ مرحوم ڈاکٹر ریحان انصاری کا بنایا ہوا ہے، جو ہمیں یاد دلاتا ہے کہ کیسے ہیرے کو ہم نے کھو دیا ہے۔

مزاحیہ رسالوں کی ادبی خدمات کا اعتراف

اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں 'اودھ پنچ' اور 'شگوفہ' کا حصہ

☆ مصنف: فیاض احمد فیضی ☆ مبصر: عطا عابدی

صفحات: ۳۶۸، قیمت: ۳۵۰/روپیے، ناشر: تخلیق کار پبلشرز، دہلی۔

فیاض احمد فیضی اردو طنز و مزاح کی دنیا میں سنجیدہ پہچان رکھتے ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل ان کے تین مجموعے قند و زقند (۱۹۹۱)، قند مکرر (۲۰۰۸) اور بال کی کھال (۲۰۱۷) شائع ہو کر داد و تحسین پا چکے ہیں۔ طنز و مزاح کے کئی اجلاس و سیمی ناروں میں بھی ان کی شرکت ہوتی رہتی ہے۔ ممبئی یونی ورسٹی سے انھوں نے ۲۰۱۵ میں اسی عنوان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، جو زیر نظر کتاب کا نام ہے۔ اپنے تحقیقی مقالہ کو ترمیم و اضافے کے بعد مصنف نے کتاب کی صورت دی ہے جو اپنے موضوع پر اہمیت رکھتی ہے۔ کتاب کے فلیپ پر سید مصطفیٰ کمال (مدیر شگوفہ، حیدرآباد) اور انو ظہیر انصاری (بڑودہ) کی آرا کتاب کی قدر و قیمت کا اعتراف نامہ ہیں۔ سید مصطفیٰ کمال نے جہاں دو مختلف صدیوں کے مزاحیہ جریدوں کا مصنف کے ذریعے بڑی عرق ریزی کے ساتھ تجزیہ کا اعتراف کیا ہے وہیں انو ظہیر انصاری نے اس کتاب میں پیش نکات سے متعلق تنقیدی نقوش کو مصنف کی بصیرت و آگہی کا نشانِ امتیاز بتایا ہے۔ کتاب کی پشت پر 'کچھ مصنف کے بارے میں' کے عنوان سے مصنف کا شخصی و ادبی تعارف مختصر مگر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب بنیادی موضوع سے ہم آہنگ و ہم رشتہ ہے۔ آغاز باب سے قبل مصنف کتاب ہذا فیاض احمد فیضی نے 'پیش لفظ' میں اودھ پنچ اور شگوفہ کے حوالے سے اردو طنز و مزاح کے ارتقا پر تحقیق کی غرض و غایت بیان کی ہے اور ابواب کے نکات روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں اودھ پنچ اور شگوفہ کا روشن کردار واضح ہو جاتا ہے۔ اپنی اس تحقیق کا مقصد مصنف کے لفظوں میں اس طرح سے سامنے آتا ہے۔

"اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں اودھ پنچ کا شگوفہ کا حصہ' کو تحقیق کا موضوع بنانے کا مقصد یہ ہے کہ اردو طنز و مزاح کے فروغ میں ان دونوں پرچوں نے جو انتہائی اہم رول ادا کیا ہے، اس کا اعتراف کیا جا سکتے اور دونوں پرچوں نے اپنے عہد میں جس طرح صحافت اور ادب پر خوشگوار اثرات مرتب کیے اور اپنے پرچے کو طنز و مزاح کی ایک تحریک میں بدل دیا کہ آنے والے ادوار میں بھی اس کے دور رس اثرات محسوس کیے گئے...." (ص ۱۲)

یہاں یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مصنف اپنے مقصدِ تحقیق میں کامیاب ہے اور کتاب کا ہر باب اہم نکتہ کا احاطہ کرتا ہے۔ پہلے باب میں اردو میں طنز و مزاح کے ابتدائی نقوش اجاگر کیے گئے ہیں۔ اس کے تحت طنز و مزاح کے ابتدائی نمونے، اولین مزاح گو شاعر، ہندوستان میں سیاسی حالات اور صحافت کا رویہ اور ادب صحافت اور ظرافت کا رشتہ جیسے عنوانات قائم کر کے مصنف نے اپنے موضوع اہداف حاصل کیے ہیں۔ دوسرے باب میں اودھ پنچ کو بجا طور پر صحافت میں طنز و مزاح کی پہلی آواز قرار دیا گیا ہے۔ یہ فیصلہ مصنف نے جن بنیادوں پر اخذ کیا ہے، ان میں سیاسی و سماجی پس منظر، پنچ لندن کا تتبع، اودھ پنچ کے مدیر، دوسرا دور، اودھ پنچ کے موضوعات و مشمولات اور اودھ پنچ کے قلم کار کا مطالعہ شامل ہے۔ تیسرے باب میں ادب اور صحافت پر اودھ پنچ کے اثرات روشنی میں لائے گئے ہیں۔ اس کے لیے مصنف

نے نہ صرف اودھ پنچ کے معاصر مزاحیہ اخبار و رسائل کے تعلق سے گفتگو کی ہے بلکہ اودھ پنچ کے دوسرے دور کا جائزہ لیتے ہوئے اودھ پنچ اور طنز و مزاح کے عبوری دور کا بھی مطالعہ کیا ہے۔

'اودھ پنچ' کے بعد 'شگوفہ' سے پہلے کا عبوری دور، چوتھے باب کا عنوان ہے۔ اس حوالے سے آزادی سے پہلے مزاح کی صورت حال اور آزادی کے بعد اردو کے اہم طنز و مزاح نگار کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مطالعے کے ساتھ دور یوسفی اور آزادی کے بعد طنز و مزاح کا اہم مرکز حیدرآباد نیز زندہ دلان حیدرآباد کے ساتھ ساتھ ہندوستان اور بیرون ملک میں طنز و مزاح کی سرگرمیاں بھی مصنف کی گفتگو کا حصہ بنی ہیں۔ پانچویں باب میں شگوفہ کی انفرادیت سامنے لائی گئی ہے۔ شگوفہ کی چند انفرادی نکات ہیں، (۱) شگوفہ- ادب کی تمام اصناف پر محیط (۲) انشائیہ اور شگوفہ (۳) نئے تخلیق کاروں کی روشناسی اور تربیت (۴) خصوصی خبروں کی اشاعت (۵) شگوفہ: صحت مند اقدار اور روایت کا امین (۶) ادبی تحریکات سے ماورا نزاعی موضوعات اور شخصی معرکوں سے احتراز اور (۷) طنز و مزاح کے معیار اور مزاج کی تشکیل میں مصطفیٰ کمال کی کاوشیں ہے۔ یہیں یہ نکات اس لیے بھی درج کیے گئے ہیں تاکہ باب کے عنوان سے نکات کی مماثلت اور افادیت کا اندازہ ہو سکے۔ ہر باب اور نکات کی یہی کیفیت ہے۔ چھٹے باب کا عنوان ہے 'شگوفہ: طنز و مزاح کے فروغ کی تحریک' اس باب کا احاطہ بھی آٹھ نکات کے تحت ہوتا ہے۔ اس باب میں 'شگوفہ' کے نئے افکار، موضوعات اور اسالیب نیز فروغِ طنز و مزاح کے کئی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مختلف ممالک میں مزاحیہ محفلوں اور سیمی ناروں کا انعقاد نیز انٹر اسکول اور انٹر کالجیٹ ادبی مقابلے اور طنزیہ و مزاحیہ کتابوں کی اشاعت کے علاوہ سماجی رشتے اور اردو و تہذیب کی پاسداری کے ساتھ ملکی و عالمی سطح پر طنز و مزاح نگاروں کی شناخت اور ادبی صنفی درجہ بندی کی مخالفت کے حوالے بھی زیر گفتگو آئے ہیں اور خوب آئے ہیں۔ آخری باب اردو طنز و مزاح کے ارتقا میں اودھ پنچ اور شگوفہ کی معاونت کے پہلو پر مبنی ہے۔ ان دونوں رسالوں نے اپنے عہد کی ترجمانی کی اور اردو معاشرے کی تشکیل میں اہم رول ادا کیا۔ ان پہلوؤں کے علاوہ ان دونوں رسالوں نے ادبی اور اعلیٰ انسانی قدروں کی پاسبانی کا جو فریضہ انجام دیا یہ تمام امور اس باب کا حصہ ہیں۔

مصنف کی زبان سادہ اور شگفتہ ہے۔ جملے چھوٹے ہوں یا بڑے، ہر جگہ مصنف ترسیل بمعنی میں خوبصورتی سے کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب نہ صرف مصنف کے خصوصی مطالعے اور سچی محنت و جستجو اور موضوعاتی لحاظ سے بلکہ زبان و ادب کے نکات کے سبب بھی اہمیت و افادیت رکھتی ہے۔ ■■

خطوط

چند سطریں اور ...

زبان کی 'اصلاح' کا تصور نہایت ظالمانہ اور احمقانہ ہے۔

☆شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد)

عزیزم شاداب رشید، سلام علیکم۔ تمھارا پرچہ ملتا رہتا ہے۔ اس محبت کا شکر گذار ہوں۔ اس بار کا شمارہ نمبر ۵۴ جو تم نے نیر مسعود اور محمد خالد اختر کے لئے مختص کیا ہے، بہت پسند آیا۔ دونوں کے خطوط بہت معلومات افروز ہیں اور ان کی شخصیتوں کے گوشے وا کرتے ہیں جو عام طور پر لوگوں کی نظر میں نہیں ہیں۔

بھائی تمھارے یہاں کتابت کی غلطیاں بہت ہوتی ہیں۔ املا بھی ذرا عجیب سا تم نے اختیار کیا ہے۔ اردو املا میں یوں ہی انتشار ہے، اب اس میں بالکل کو بلکل لکھ کر بڑھائیں (ایسے ہی اور بھی ہیں جو تمھارے یہاں جلوہ گر ہیں) تو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ جو معیاری املا رائج ہے (یا بہت بڑی حد تک رائج ہے) اسی کو اختیار کرو۔ کسی بھی زبان میں املا اور الفاظ میں مطابقت نہیں ہو سکتی، اور نہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ الفاظ کی آمد بند ہو جائے گی۔ اور املا میں 'اصلاح' نہیں کی جاتی، املا زبان کے بولنے اور لکھنے والے آپ ہی آپ رائج کرتے ہیں۔ زبان کی 'اصلاح' کا تصور نہایت ظالمانہ اور احمقانہ ہے۔

محبت احترام کے بغیر اور احترام محبت کے بغیر ادھوری ہے۔

☆خالد عبادی (پٹنہ)

''نیا ورق'' کا شمارہ 54 مزہ دے گیا۔ نیر مسعود اور محمد خالد اختر پر آپ نے جو گوشہ پیش کیا ہے اس میں سب سے خاص دونوں بزرگوں کی طرف سے ایک دوسرے کو لکھے گئے ''خطوط'' ہیں۔ ان سے بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اہل علم اور اہل فن کس طرح ایک دوسرے کی قدر کرتے ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہیں پوری طرح مترشح ہو جاتا ہے۔ فی زمانہ اس طرح کے ''معاملات'' تو ''عنقا'' ہی سمجھئے۔ محمد خالد اختر کا خاکہ نما ''سعادت حسن منٹو'' پڑھ کر تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ آج بھی ہم منٹو کو کہاں اس طرح پڑھ اور سمجھ سکے ہیں۔ محبت، عقیدت اور صداقت کا یہ آمیزہ نہیں بلکہ ''عطر مجموعہ'' ہے۔ زہے مقدر کہ اس تحریر کو پڑھنے کا موقع نصیب ہوا۔ فہمیدہ ریاض کا مضمون ''محمد خالد اختر'' بھی کچھ اسی پائے کا ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ محبت احترام کے بغیر اور احترام محبت کے بغیر ادھوری ہے۔

نیر مسعود کا ''شمس الرحمن فاروقی'' میں پہلے ہی ''روشنائی'' (کراچی) میں پڑھ چکا تھا۔ میں اسے واجبی

سا ہی کہوں گا۔ ان کا افسانہ ''خالق آباد'' البتہ ان کے اسٹائل کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔

مجھے اپنی بات یہیں ختم کردینی چاہئے تھی لیکن بے انصافی ہوگی اگر یہ نہ کہوں کہ ''کچھ اصل ہے کچھ طرز ادا'' کی آخری قسط پڑھ کر کچھ دیر کے لئے اداس سا ہوگیا۔ اقبال مجید تو پہلے ہی ختم ہوچکے تھے، یہ سوانح بھی ختم ہوگئی۔ دعا گو ہوں کہ اسے کتابی شکل میں دیکھنا نصیب ہو۔ ساجد رشید (مرحوم) کے افسانے ''کالے سفید پروں والے کبوتر'' پر رحمن عباس کا مضمون رتجزیہ کسی طفل مکتب کی تحریر کے مشابہ ہے۔ تھرڈ گریڈ کا بھی نہیں کہہ سکتا کہ بہر حال اس کے ساتھ ''گریڈ'' لگا ہوا ہے۔ اور جہاں تک ساجد رشید کے ساتھ انصاف کی بات ہے تو یہ تو وہ اگلا جنم لینے پر بھی نہ کرسکیں گے۔ اداریہ ''اب ملتے رہئے ہاتھ'' آپ کی شعور مندی اور بیداری مغزی کا اعلانیہ ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

شکوک سچ بھی ثابت ہو سکتے ہیں...

☆نُدرت نواز (جھارکھنڈ)

نیا ورق کا نمبر 54 رشمارہ موصول ہوا۔ گوشۂ نیر مسعود اور گوشۂ محمد خالد اختر پر مبنی یہ شمارہ ادبی مئے سے شرابور ہے۔ اداریے کی گفتگو سو فیصد درست ہے۔ محترم نیر مسعود اور محترم خالد اختر کی شخصیت پر لکھے گئے تمام مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ تمل مصنف پیرومل مروگن کی نظمیں خوب ہیں۔ شمارے میں شامل محترم ساجد رشید کے افسانے 'کالے سفید پروں والے کبوتر' نے متاثر کیا۔

نیا ورق شمارہ نمبر 53 بھی ساتھ ہی میں موصول ہوا۔ اداریے نے اُن ضروری نکات کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے جسے اردو ادب والے تقریباً فراموش کرتے جارہے ہیں۔ مترجم تو دور کی بات ہے، یہاں تو اردو کمپوزر کی کمی سے بہت سے ادبی شمارے بند ہوگئے ہیں۔ اردو والے تو اصل کتاب تو خرید کر نہیں پڑھتے ترجمہ کی ہوئی کتاب کیونکر خریدیں گے۔ سعادت حسن منٹو کو لے کر بھی مدیر نے عمدہ گفتگو کی ہے۔ جس طرح کے شکوک ان کے ذہن ودل میں ہیں وہ سچ بھی ثابت ہوسکتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پریم چند کی طرح ہندی والے منٹو کو بھی ہندی ادب کا ادیب ثابت کردیں۔ ''رشوت'' فاروق خالد کا افسانہ بیجا طویل اور خشک محسوس ہوا۔ ''فریق ثانی' گلزار جاوید کا افسانہ ایک روایتی افسانہ ہے۔ ''آخری گجرا'' جاوید انور کا ایک کلاسکل افسانہ ہے لیکن اصل افسانے کا اختتام کہانی کے موافق ہے۔ ''جھجک'' محمد عباس کا افسانہ قابل قدر ہے۔ غزلیں اور نظمیں بھی عمدہ اور معیاری ہیں۔ محترم مظفر حنفی، شاہد اختر صاحبان کے کلام نے متاثر کیا۔

نیا ورق شمارہ نمبر 52 میں اداریے میں بڑے ہی پتے کی باتوں کا اظہار کیا گیا ہے۔ ناصر راہی کی تخلیق زبردست ہے، افسانے 'پناہ گاہ' اور 'کامریڈ کی شادی' بھی عمدہ تخلیق ہے۔ 'نارنجی پیڑ' منیرہ سورتی کا کلاسک افسانہ ہے۔ یوں تو نظمیں سبھی عمدہ ہیں مگر محترمہ عذرا عباس کی نظم 'مرتے ہوئے' خواجہ سرا کا انٹرویو نے بہت متاثر کیا۔ کمال کی نظم ہے۔ غزلیں بھی عمدہ، معیاری اور فنی مہارت سے پُر ہیں۔ ایرانی فن کار صابر با کا بلند پائے کے شاعر ہیں۔ شمارے میں شامل ان کی تمام نظمیں عمدہ ہیں۔

نیاورق شمارہ نمبر ۵۱ میں گوری لنکیش کی یاد میں محترمہ ٹیسٹا سیتلواڑ نے عمدہ تحریر پیش کی ہے۔ گوری لنکیش کا قتل ہمارے سماج کے لیے بدنما داغ ہے۔ محمد عباس کا افسانہ 'اولاد' کبڈی اور پہلوانی سے شروع ہوتا ہے اور سُور کے شکار پر آکر ختم ہوتا ہے۔ اصل کہانی بیچ میں کہیں گم ہوجاتی ہے۔

شاعری میں شدت احساس کی سخت کمی محسوس ہوتی ہے!

☆خالد عبادی (پٹنہ)

''نیاورق'' شمارہ نمبر 53 زیر مطالعہ ہے۔ خراج عقیدت کے تحت عدیل یوسف صدیقی کی تحریر ''یادیں میرے یار طرح دار'' (ساقی فاروقی کی یادیں) ساقی فاروقی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں سے روشناس کراتی ہے۔ جاوید صدیقی نے ''عنایت اختر: ایک کامریڈ کی موت'' کو بڑی خوبصورتی اور بے تکلفی سے پیش کردیا ہے۔ ایسے لوگ اب ڈھونڈے سے بھی کہاں ملیں گے۔ ''خاکہ'' کے تحت ''سمجھنا تجھ کو کچھ آساں نہیں ہے'' (باقر مہدی ایک ہمہ جہت شخصیت) الیاس شوقی کی ایک زندۂ جاوید تحریر ہے۔ اس خاکہ کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ الیاس شوقی مرحوم باقر مہدی سے کتنی محبت کرتے تھے اور ان کے دل میں مرحوم کا کتنا احترام تھا۔ غالب کا ایک مصرع یاد آتا ہے: خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں۔

شعری حصے میں نظمیں ہوں یا غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن فقیر سائیں کی نظم جو سب سے آخر میں شائع کی گئی ہے اس میں تلفظ کی کئی غلطیاں ہیں۔ انہوں نے پچیس شعر کی نظم میں تین مقام پر ''محض'' کو ''فعل'' کے وزن پر باندھا ہے۔ ''بحث'' کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا ہے۔ جب کہ ''مرض'' کو ''فاع'' کے وزن پر باندھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا ایک مصرع بھی پورا کا پورا ناموزوں ہے۔ ملاحظہ فرمائیں ''یقیں بس خواہش مال و مطع اجاگر کرتا ہے''۔ مطع کا استعمال تو طرفہ تماشا ہی کہلائے گا۔ غزلوں میں ظفر اقبال، مظفر حنفی، کرشن کمار طور، بدر محمدی، منیر سیفی، جلیل عالی، قمر صدیقی کا اپنا اپنا رنگ اور آہنگ ہے۔ شاہد اختر کی 9 غزلیں ایک ساتھ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ وہ بہت سنبھل کر اور غور و فکر کے بعد شعر کہتے ہیں۔ ایسے دور میں جب کہ نک سک سے درست شعر کہنا کارے دارد بنتا جارہا ہے وہ بہت خوبصورتی سے اپنے رنگ کے اشعار نکال کر پڑھنے والوں کے دل جیت لیتے ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ ان کی شاعری میں شدت احساس کی سخت کمی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا شاید ان کی متوازن شخصیت کی وجہ سے ہے۔

■■

سادہ ڈاک سے مراسلت کے لیے

Naya Waraq
Post Box No 5030
Chinch Bunder Post Office. Mumbai - 400 009.

رجسٹرڈ خطوط، کورئیر اور ترسیل زر کے لیے

Naya Waraq
36/ 38, Aloo Paroo Bldg, Umerkhadi Cross Lane, Dongri
Mumbai - 400 009 Tel : 9869 321477 / 9320 113631 / 2341 1854
E-mail: nayawaraq@yahoo.com, kitabdaar@gmail.com
Please drawn cheque in favour of "nayawaraq"

LITERARY MAGAZINE NAYA WARAQ

36/38, Umerkhadi Cross Lane, Mumbai - 400 009.

Post Box No.: 5030, Chinch Bunder Post office, Mumbai - 4
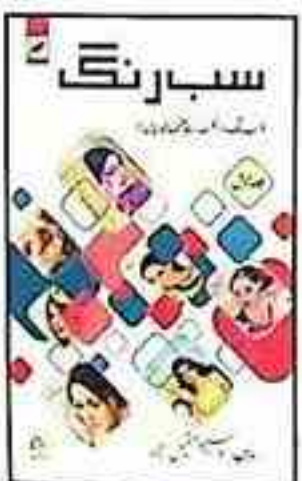
زبان ایک ایسا درندہ ہے،
اگر اسے کھلا چھوڑ دیا جائے
تو عجب نہیں کہ
تمھیں بھی پھاڑ کھائے۔

خلیل جبران